...... یادوں کی طاق پہ رکھی کہانیاں ......

عذرا اصغر ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں جنہیں کہانی بنانے اور کہنے کا فن آتا ہے ایک طویل ریاضت نے انہیں افسانے کی نزاکتوں سے آشنا کیا ہے۔ان کے تصوّرِ وقت میں ماضی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس حوالے سے یادیں اور یادوں کے اثرات ان کی کہانی کا وہ جزو ہیں جو ان کی کہانی پر ان کی چھاپ لگاتے ہیں۔عذرا اصغر مشرقی تہذیب کی علمبردار ہیں اور ان کے افسانوں میں عورت کا کردار اسی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔اپنی آزاد سوچ کے باوجود وہ اپنے اخلاقی ضابطے کی پابند ہیں جو ان کے مذہب اور معاشرت نے مرتب کیا ہے۔اس حوالے سے ان افسانوں کی نسائیت ان کی اپنی نسائیت کا اظہار ہے۔ان کے موضوعات ٹھوس اور حقیقی ہیں لیکن کہیں کہیں مابعد کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔لیکن یہ آواز تیز نہیں سرگوشی کی سی ہے۔اس مابعد کے ڈانڈے ہمارے قدیم تصوف سے جڑے ہوئے ہیں۔ ......ڈاکٹر رشید امجد

ایک سو چھتیس صفحات پر مشتمل یہ مجلد کتاب دو صد روپے کے عوض سی۔159، چناب بلاک نمبر 10، لاہور سے دستیاب ہے۔

...... نارسیدہ ......

مجھے یہ تو علم نہیں کہ مشتاق اعظمی کے پاس کسی مخصوص نظریے کی عینک ہے یا نہیں، لیکن ان کے افسانے پڑھ کر یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ وہ کسی مخصوص نظریے کی تبلیغ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہماری زندگی کی ایک ایسی حقیقی قاش پیش کر رہے ہیں جو ان کے تجربے کا حصہ بن گئی اور ان کے باطن میں گھمسان کا رن بپا کر گئی تو وہ اسے افسانے میں پیش کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اپنا کیتھارسس کر سکیں۔مشتاق اعظمی اپنے افسانوں میں ''وقت'' کو واقعات و مناظر اور شخصیت کے تذکرے کے حوالے سے تقسیم نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنی فن کاری سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ زندگی اپنے منفی و مثبت اثرات پڑھنے والوں کو منتقل کرتی چلی جاتی ہے اور اختتامیہ تاثر کی گرہ کھولتا ہے تو ایک دنیا آشکار ہو جاتی ہے۔ ...... ڈاکٹر انور سدید

ایک سو اٹھائیس صفحات کا یہ افسانوی مجموعہ ایک صد پچاس روپے کے عوض انجمٰی پبلیکیشنز چندر سین اسٹریٹ کول کتہ سے دستیاب ہے۔

...... پرندہ ......

آغا گل کے افسانے حقیقت پسندی کا برجستہ اظہار ہوتے ہیں۔ان میں پڑھنے والے کو Expression of the Realistic Inpulse ملتا ہے، ان کے افسانوں میں ناسٹلجیا اور سینٹی مینٹل ازم پایا جاتا ہے۔آغا گل کو بلوچستان کی آواز کہا جاتا ہے۔لیکن ان کی مقامیت تبدیل ہو کر آفاقیت میں ڈھل جاتی ہے ان کے افسانوں میں ویران علاقے، دشت و جبل اور ہولناک لینڈ اسکیپ دکھائی دیتا ہے۔بچپن سے ان میں رہنے کے باعث ویرانے ان کی کہانیوں میں ایک رومانی اور علامتی انداز میں آتے ہیں۔یہاں تک کہ Apotheosis کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔آغا گل Problematic time کے تخلیق کار ہیں۔نسلی اور لسانی تعصب اور عدم مساوات ان کا موضوع ہے۔یوں وہ افسانہ نگار سے زیادہ سماجی مصلح دکھائی دیتے ہیں۔اردو کو وسعت دینے کے لیے وہ مقامی الفاظ اور روزمرہ کا استعمال بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ ...... آغا امیر حسین

ایک سو چوالیس صفحات کا یہ افسانوی مجموعہ مبلغ دو صد روپے کے عوض کلاسیک پبلشرز، دی مال، لاہور پر دستیاب ہے۔

متاعِ چہارسو

☆

''تنقید کا نور''

تیرے عنوان جدا، معنی آفرینی غضب،
دیر تک سر کو دھنے، جو بھی پڑھے،
تو نے تنقید کو قاری کے قریں پہنچایا،
تیرا احسان ادب اور قاری پہ سدا
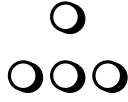
تو نے بخشے نئی تنقید کے تیور ہم کو،
تو نے سلجھائی علامات کی پراسرار گرہ،
پیکروں، استعاروں کی مسلسل زنجیر،
تیرے ادنا سے اشاروں پہ سلجھتی جائے

تو نے اک نور سا تنقید میں پھیلایا ہے،
تیرا لہجہ بڑا بانکا، تیری صورت جیسا،
تیری ہمت، تیری تیزی، تیرا تیکھا اسلوب،
تیرا انداز نرالا، تیری چھب کے جیسا
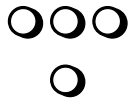
مطلب و معنی والفاظ کا باہم ناتا،
تو نے جس طرح بتایا اسے بھولیں کیسے

تو نے تنقید کو ایک جوش نیا بخشا ہے،
تیرا احسان سدا اس پہ رہیگا علوی،
تیری باتیں، تیرے الفاظ، تیرے جملے، تیرے طنز،
ایک مہکتا ہوا گلزار کھلا ہے علوی

وفا جونپوری (بھارت)

○
○○○

قرطاسِ اعزاز

○

پروفیسر وارث علوی

○

کے نام

○○○
○

''وارثکی آبرو''

عروب شاہد (اسلام آباد)

نام: وارث حسین علوی

خاندانی پس منظر: احمد آباد کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے ان کا تعلق ہے

دادا کا نام: جناب امیر الدین علوی

دادی کا نام: قمر النساء

والد: سید حسینی پیر علوی

والدہ: حفیظ النسا عرف داشی بی بی علوی

تعلیم

میٹرک (انجمن اسلامیہ ہائی اسکول)

بی اے (ممبئی یونیورسٹی) گولڈ میڈلسٹ

ایم۔اے اردو (گجرات یونیورسٹی)

ایم۔اے انگریزی (علیگڑھ یونیورسٹی)

ملازمت

۱۹۵۵ سینٹ زیویرس کالج احمد آباد میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے پھر اسی کالج سے ۱۹۸۸ میں انگریزی شعبۂ کے صدر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

اولادیں:

ان کی تین اولادیں ہیں اور تینوں لڑکیاں ہیں(۱) شہبازہ (۲) شاہدہ اور (۳)فرزانہ۔

بڑی بیٹی کی شادی ڈاکٹر الیاس سے ہوئی' ان سے دو بیٹیاں صبا اور سنبزہ پیدا ہوئیں۔ دوسری بیٹی کی شادی محمد عثمان سے ہوئی' ان سے بھی دو بیٹیاں انجم اور عائشہ پیدا ہوئیں۔ چھوٹی بیٹی کی شادی امتیاز صاحب سے ہوئی' ان کے دو بیٹے اویس اور ابرار ہوئے۔

موجودہ سکونت:

اس وقت وارث علوی کے ساتھ اُن کی چھوٹی بیٹی فرزانہ' داماد' دونواسے اور اہلیہ اپنے آبائی مکان سید واڑہ آسٹوڈیا احمد آباد میں فرصت کے دن گذار رہے ہیں۔

انعامات:

(۱) گورو پرسکار۔۔ اردو ساہتیہ اکادمی گجرات
(۲) نیشنل ایوارڈ۔۔ مہاراشٹر اردو اکادمی
(۳) غالب ایوارڈ۔۔ غالب اکادمی دہلی
(۴) عالمی فروغ اردو اکادمی' دوہا' قطر
(۵) بنگال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ
(۶) بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' دہلی

تصانیف:

۱	تیسرے درجے کا مسافر	۱۹۸۱ء
۲	اے پیارے لوگو	۱۹۸۱ء
۳	حالی مقدمہ اور ہم	۱۹۸۳ء
۴	خندہ ہائے بیجا	۱۹۸۷ء
۵	کچھ بچالایا ہوں	۱۹۹۰ء
۶	راجندر سنگھ بیدی (مونوگراف)	۱۹۸۹ء
۷	پیشہ تو سپہ گری کا بھلا	۱۹۹۰ء
۸	جدید افسانہ اور اس کے مسائل	۱۹۹۰ء
۹	فکشن کی تنقید کا المیہ	۱۹۹۲ء
۱۰	سعادت حسن منٹو (مونوگراف)	۱۹۹۵ء
۱۱	اوراق پارینہ	۱۹۹۸ء
۱۲	ادب کا غیر اہم آدمی	۲۰۰۱ء
۱۳	بورژواژی بورژواژی	۱۹۹۹ء
۱۴	لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر	۲۰۰۱ء
۱۵	ناخن کا قرض	۲۰۰۳ء
۱۶	سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ	۱۹۹۷ء
۱۷	منتخب مضامین	۲۰۰۰ء
۱۸	سرزنش خار	۲۰۰۵ء
۱۹	راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ	۲۰۰۶ء
۲۰	گنجینۂ بازخیال	۲۰۰۷ء
۲۱	کلیات راجندر سنگھ بیدی جلد اول' دوم	۲۰۰۵ء
۲۲	بتخانۂ چین	۲۰۱۰ء

زیر اشاعت:

(۱) اقبال کے بعد اردو کی نظمیہ شاعری (دو جلدیں)
(۲) غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین

اختصاص:

(۱) ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین احمد آباد کے سیکرٹری رہے۔

(۲) ساہتیہ اکادمی گجرات کے وجود میں آنے کے بعد اس کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔

(۳) گجرات اردو ساہتیہ اکادمی کے رسالے ''سابر نامہ'' کی ادارت کے فرائض بھی سنبھالتے رہے۔

روح کی اُڑان

وارث علوی

(احمد آباد، بھارت)

گرد سے اٹی فضا کو صاف کرنا تضیعِ اوقات ہے، بلکہ ممکن بھی نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ گرد خود ہی بیٹھ جاتی ہے۔ وہ تمام ادھ کچرے تصوارت جوادبی فضا میں ذرّوں کی مانند اڑتے رہتے ہیں، اس وقت تک دکھائی بھی نہیں دیتے جب تک تنقید کی کرن کی زد میں نہیں آتے۔ ایڈیٹر کے نام خطوط میں، سیمینار کی دومنٹ والی تقریروں میں، اس انٹرویو میں جو سقراط کا بقراط لیتا ہے، اس ادبی شام کی گفتگو میں جس کا ادب میں وہی مقام ہے جو شامِ اودھ کا دنیا کی دوسری شاموں میں ہے، یہ نیم پختہ باتیں، یہ بے سوچی سمجھی رائیں، دھندلے غبار کی مانند مطلعِ تنقید پر بلند ہوتی ہیں اور اہلِ نظر کو آشوبِ چشم اور اہلِ فکر کو فیق النفس میں مبتلا کرتی ہے۔ تنقید محلّہ کا وہ میدان بن گئی ہے جس پر ہر آدمی کو حق ملکیت حاصل ہے۔ چنانچہ ایک صاحب اپنی پھٹی ہوئی نفسیات کی دری لاکر جھٹکتے ہیں۔ ان کے قریب ایک اور صاحب اپنی سائیکل ٹھیک کر رہے ہیں۔ ان کے فلسفہ کا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔ ان بزرگوار کو دیکھئے، اپنا مطالعہ ٹھکانے لگانے کے لیے پورا ویسٹ پیپر باسکٹ، میدان کے بیچوں بیچ اوندھا کر گئے اور اب اقوالِ زریں کی چٹھیاں چاروں طرف اڑ رہی ہیں۔ جی ہاں! وہ حضرت بتّی کے کھمبے سے لاؤڈ اسپیکر باندھ رہے ہیں۔ شام کو سیاست پر دھواں دھار تقریر ہو گی۔ انھیں دیکھئے! جمالیات کی درسگاہ میں استاد ہیں سفید برّاق پوشاک پہن کر نکلتے ہیں تو اس خوف سے کہ کہیں شریر لونڈوں کی شرارتوں سے کپڑے داغدار نہ ہو جائیں ادب کی سرزمین سے دو بانس اوپر ہی چلتے ہیں۔ وہ ہمیشہ حسن کا ذکر کریں گے، ادب اور ادیب کا نام نہ لیں گے۔ وہ جو اُن سے پہلو بچا کر چل رہے ہیں۔ وہ دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے میر منشی ہیں۔ ان کے پاس تمام چھوٹے بڑے ادیبوں کی فہرست ملے گی۔ بھولے سے اگر حسن کا ذکر آ گیا تو سجدۂ سہو ادا کریں گے۔ آپ نے ٹھیک سمجھا، وہ سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ علیگڈھی پاجامہ پہنے ادب کی غلام گردشوں میں ٹہلا کرتے ہیں انھیں سوالات پوچھنے کا بہت شوق ہے، لیکن نہ خود جواب دیتے ہیں نہ دوسروں کے جوابات سنتے ہیں۔ وہ صاحب جو کھادی پہنے آ رہے ہیں محلّہ میں ان کا چودھراپا مشہور ہے۔ وہ نہ ہوں تو چھوکرے دیوار کی آڑ میں اجابت کرنے بیٹھ جائیں اور بہو بیٹیوں کی آبرو سلامت نہ رہے۔ اُن کے گھر کے سامنے وہ نستعلیق ڈرائنگ روم ہے جس کے صاحبِ خانہ باپ کی داڑھی اور ماں کے اسلامی نام سے شرماتے ہیں، اور قومی دھارے سے بات شروع کرتے ہیں اور اردو ادب کے غیر ہندوستانی عناصر پر تان توڑتے ہیں۔ وہ ادب کا نقشہ اس طرح بدلنا چاہتے ہیں جس طرح ٹاؤن پلاننگ افسر شہر کا نقشہ بدلتا ہے۔ اُن کے نزدیک خیالات سنگ وخشت او رقدریں چوب و آہن ہیں جو پی ڈبلیو ڈی کے گودام سے چٹھّی بتا حاصل کی جا سکتی ہیں۔ وہ دیسی لکھنے والوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں گویا وہ پیدل رکشا والوں کا مفلوک الحال طبقہ ہے جو لنگی میں ہاتھ ڈالے چوتڑ سہلاتا رہتا ہے۔ صاف بات ہے کہ ٹکنو لوجیکل دَور میں جب تک ہر ادیب ہوائی جہاز کے پائلٹ کی طرح چاق وچوبند اور صحت مند نہیں ہو گا دیس کیسے ترقی کرے گا۔

بہر حال کچھ ہو، اس میدان کی چہل پہل مجھے پسند آئی اور میں بھی اس میں دھم سے کودا ابھی کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ابھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس کھڑکی سے آواز آئی جس میں بہار شریف کے ایک افسانہ نگار کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے اس میدان پر صرف ڈھائی آدمیوں کا اجارہ ہے۔ ایک وزیر آغا، دوسرے شمس الرحمان فاروقی اور آدھے وہاب اشرفی۔ یہ حیدری کلام سن کر کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ تین ہزار تین سو اور تیرہ صفحات جنھیں بغل میں دابے ہوئے تھا ان کا شمار نہ تین میں تھا نہ تیرہ میں لہٰذا انھیں باندھا سوتلی کی گرہ میں اور چاہا کہ چپکے سے کھسک جاؤں کہ چودھری صاحب سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ رہے سہے ہوش بھی غائب ہو گئے۔ انھوں نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا گویا مضامین کا پلندہ نہیں باندھ رہا بلکہ ازار بند کھول کر دیوار کی آڑ میں کھڑا ہونے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ کہنے لگے۔۔۔''ماشاءاللہ! کافی لحیم شحیم مضامین لکھتے ہو۔ کون سی چکی کا پسا کھاتے ہو۔'' اس سے پیشتر کہ کچھ عرض کروں نکڑ پر سے ایک صاحب بولے۔''پی ایل اے کے گیہوں کی درآمد بند ہونی چاہیے اس دیس میں'' لوگوں کا مجمع جمع ہو گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا ایلیٹ اور پاؤنڈ کی بیساکھیوں کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتے۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔''انگریزی ادب تو دورِ انحطاط سے گزر رہا ہے۔ ان ملکوں کا ادب پڑھنا چاہیے جو ترقی یافتہ ہیں مثلاً روس'' وہ صاحب جو بجلی کے کھمبے سے لاؤڈ اسپیکر باندھ رہے تھے بولے۔''اب آپ انھیں زیادہ پریشان نہ کریں۔ ان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بہیمانہ تشدد میں یقین رکھتے ہیں۔'' ایک کہرام برپا ہو گیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بجلی کا کھمبا جو علم کی روشنی کا مینار تھا اب آلۂ مکبرۃ الصوت سے سج چکا تھا وہیں سے آواز آئی۔''آج کا جلسہ انہیں وزیر کی صدارت میں ہو رہا ہے جن کی سرپرستی اس رسالے کو حاصل تھی جس میں بہیمانہ تشدد کی تشہیر ہوئی تھی اب ہم بھی دیکھیں گے ایسے مضامین کہاں چھپتے ہیں۔'' مجمع میں سے کوئی چیخا''ڈاک سے آئی ہوئی جدیدیت کو بذریعہ ڈاک واپس کیا جائے۔''

میں سوچتا ہوں لولے لنجے ہاتھوں سے پتھراؤ بھی تو نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہماری تنقید میں لذّتِ سنگ تک نہیں، محض دردِ سری ہے۔

اِدھر اُدھر سے مقابل کو یوں نہ گھایل کر
وہ سنگ پھینک کہ بیساختہ نشانہ لگے
(زبیر رضوی)

میں سوچتا ہوں کہ افکار و خیالات بھی جغرافیائی حدود میں قید ہیں۔ کیا دنیا کے بہترین دماغوں نے تاریخ کی مختلف منزلوں میں جو کچھ سوچا اور محسوس کیا ہے وہ میرا ورثہ نہیں۔ فکر و نظر کی دنیا میں زمان و مکان فریب نظر ہیں۔ خیال پانچ ہزار فرسنگ اور دو ہزار سال کی مسافت چشمِ زدن میں طے کرتا ہے اور جو خیالات کی دنیا کے سیاح ہیں ان کے ذہن کو رنگ و نور سے مالا مال کرتا ہے۔ اسی لیے شیکسپئر اور ایلیٹ کی قیمت پر مجھے نہ پہلی بھیت کا شاعر قبول ہے نہ ہاتھ رس کا نقاد۔ میں حصاروں کا باندھنے والا نہیں توڑنے والا ہوں اور میرے ذہن کی سیمائیں سوراشٹر کے لوک گیتوں سے شروع ہوتی ہیں اور آئس لینڈ کے اساطیر پر ختم ہوتی ہیں۔ میں ایسی باتیں نہیں سمجھتا کہ ایک طرف ایلیٹ ہے اور دوسری طرف گورکی کیونکہ ادب میرے لیے جاٹوں کی جو تم پیزار نہیں بلکہ غمِ دل اور غمِ روزگار کا وہ بیانِ جاں گداز ہے جو ذہن کو منوّر اور دل کو محظوظ کرتا ہے۔

ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں Egoist ہوں۔ انھیں کون بتائے کہ میں کوئی چاق چو بند بیوروکریٹ نہیں، وہ پروفیسر نہیں جو ڈھائی لاکھ کے وظیفہ پر ان موضوعات پر تحقیق کرتا ہے جن پر کام کرنے والے پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کر چکے۔ میں اساتذہ کی کانفرنس کے پریسیڈیم کا صدر نہیں۔ ادیبوں کے وفد کا لیڈر نہیں کسی میموریل کا ڈائرکٹر نہیں، کسی ادبی آشرم کا مہارشی نہیں۔ وزارتِ تہذیب کی آنکھ کا تارا اور ساہتیہ اکادمی کا راج دُلارا نہیں۔ ترقی کا یہ حال ہے کہ پہلے اردو پڑھاتا تھا، پھر فارسی پڑھائی اور اب انگریزی پڑھاتا ہوں۔ اور انشاء اللہ سال دو سال میں پھر فٹ پاتھ پر جوتیاں چٹخاتا، گھٹنوں تک لہراتے ازار بند سے کمر کستا لوگوں سے پوچھتا پھروں گا کہ اب کون سے مضمون میں ایم اے کروں کہ کم از کم کفن دفن کے انتظام کے لیے بیت المال کی طرف دیکھنا نہ پڑے۔ وہ جو اسرارِ کائنات اور رموزِ حیات سے پردہ اٹھاتے ہیں، وہ جو لاینحل عقدوں کا حل تلاش کرتے ہیں، وہ جو تمام سوالوں کے جواب اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں لیے پھرتے ہیں میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ خدارا اس راز سے پردہ اٹھاؤ کہ وہ کون سا خبط و جنون ہے جو اردو ادیب کو کاغذ پر قلم رکھنے پر مجبور کرتا ہے جب کہ اپنے قلم سے وہ کوڑی نہیں کماتا، سو کروڑ کے دیس میں پانچ سو کی تعداد میں چھپنے والے رسالوں میں لکھتا ہے تو شہرت طلبی کی گالی کھاتا ہے۔۔۔ سب سے کہتا پھرتا ہے کہ وہ شاعر ادیب اور نقاد ہے جب کہ اس کی کتاب کو شائع کرنے کے لیے کوئی ادارہ تیار نہیں کیونکہ اشاعت گھروں کو ان اساتذہ کی کتابیں چھاپنے سے فرصت نہیں جن کے اخباری تراشوں، صحافتی تحریروں ، اور obituries کی وہ قدر و قیمت ہے جو جگر کاوی سے لکھے ہوئے مضامین کبھی وصول نہ کر پائے۔ طفل ابجو کے پالنے پوسنے والوں کے تھن کیسے ہوتے ہیں وہ

دیکھنا ہو تو ان لوگوں کی طرف نظر کرو جنھوں نے ادب کو ترقی کوشی کے بہتر سیڑھیوں والے ادارہ میں بدل دیا ہے۔ ان لوگوں کو زیب دیتا ہے کہ وہ ادب کی نفیس نفیس باتیں کریں اور فوائد الفواد والی زبان بولیں۔ ادب ان کے لیے ترقی ہے، شخصیت کی زینت اور دانشوری کی آرائش ہے، تہذیب و شائستگی اور شریفانہ مشغلہ ہے۔ مجھ جیسے کٹے پھٹے لوگوں کے لیے ادب زینت و زیبائش نہیں بلکہ ایک جذباتی ضرورت اور ایک روحانی طلب ہے۔ مردہ خیالات کا کباڑ خانہ نہیں بلکہ زندہ تجربات کی وادیِ پُر بہار ہے۔ خلعتِ دانشوری کی زرکاری نہیں بلکہ برہنہ کھال پر گزرتے وقت کے ان لمحات کی جنھیں تخلیقی تخیل نے توانا تجربات کے شراروں میں بدل دیا ہے حدّت اور شدّت کو محسوس کرنے کا نام ہے۔

ایک نوجوان بزرگوار فرماتے ہیں۔ ''وارث علوی وغیرہ کو کوئی تو سمجھا سکتا ہے کہ تنقید کی زبان کا کیا معیار اور نمونہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، وزیر آغا اور فاروقی وغیرہ کی تنقیدی تحریریں سامنے ہیں۔''

نہیں صاحب! کوئی مجھے سمجھا نہیں سکتا۔ وہ جو سمجھانے آتے ہیں پوپلے منہ سے باتیں کرتے ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے تمام دانت اکھڑ والیے ہیں۔ نقاد کو شریف بنانے والے تمام ہتھ کنڈوں سے میں واقف ہوں۔ بچھو کا ڈنک نکال لیجیے وہ صرف ایک لعاب دار کیڑا رہ جاتا ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو گندے دنوں کا قصہ معطر زبان میں سناتے ہیں اور روح کے جہنم زاد کا بیان خس خانوں کی زبان میں کرتے ہیں تاکہ نفاست پسندوں میں نفیس کہلا سکیں۔ میں جانتا ہوں کہ بیوقوفوں پر تنقید ممکن نہیں، انھیں صرف بے نقاب کیا جا سکتا ہے اور بے نقاب کرنے میں نقاد کو جو ابلیسی لذّت ملتی ہے اس کی تلچھٹ پر میں نے کبھی قناعت نہیں کی، جام پر جام لنڈھائے ہیں۔ غیظ و غضب محرکِ فکر و خیال ہے اور اس سرچشمہ پر شرافت اور مصلحت کی دیوار چننے کا کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔ میں جب ڈھائی تولے کے شاعر کو سورما اور تنقید کے بونے کو باون گزا کہنے سے انکار کرتا ہوں تو لوگ میری زبان کو غیر مہذب کہتے ہیں۔ کاش وہ یہ بھی دیکھتے کہ فلک سیر تخیل کی معجز نمائیوں کا ذکر میں کس وفورِ شوق سے کرتا ہوں۔ اس وقت انہیں پتہ چلتا کہ وہ جس کی نفرت بھی عمیق اور محبت بھی عمیق ہے اس کے مغلظات بھی شدید اور اس کے ملفوظات بھی شدید ہوتے ہیں۔ ادب کا ذکر بھی ذکرِ یار کی طرح حسین و دل آویز ہونا چاہیے اسی لیے مجھے مکتبی تنقید کا جارگون ٹھنڈے ہاتھ کا مصافحہ اور بیمار مولوی کا وعظ معلوم ہوتا ہے۔ جب ذہن ہجومِ فکر اور دل وفورِ جذبات سے لرزتا ہو تو فروغِ مے کا اثر اسلوب کے رنگِ رخسار پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سکّہ بند محبوس حسینہ کی مانند نئے افکار اور نئے جذبات کی شوخ نگاہی کی تاب نہیں لا سکتی ایسے لوگ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان لکھ سکتے ہیں کیونکہ فردوس کے یہ چشمے ذکرِ پاک کے لیے مناسب سہی، لیکن جامۂ احرام کے دھبّے دھونے کے کام کے نہیں۔ میں تنقید کے ہونقوں کی مانند بے سروپا جملے نہیں لکھتا لیکن میں تنقید کے بقراطوں کی طرح اس خوش فہمی

میں بھی مبتلا نہیں رہتا کہ میرے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ اپنے جبڑوں میں علم وعرفان کا سو کینڈل پاور کا بلب دبائے طلوع ہو رہا ہے۔ یہ انکسار نخوتِ پنہاں کا نقاب نہیں بلکہ ثمر ہے اپنی ذات پر اعتماد کرنے کا گو میری ذات کی قیمت چھ پیسے سے زیادہ نہیں۔ میں یہ قیمت جانتا ہوں اسی لیے ایوانِ ادب میں صدر نشینی کو للچائی نظر سے دیکھے بغیر صفِ نالین میں اپنی جگہ ڈھونڈ نکالتا ہوں، لیکن جہاں بیٹھتا ہوں خود اعتمادی اور بے نیازی سے بیٹھتا ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ جو ہم نشیں ہیں وہ صدر نشینوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ صدر الصدور کی چوتڑوں کے نیچے علم وادب کی شمعوں کا چراغاں نہیں ہو رہا ہے۔ بے وقوف انکسار کو کمزوری اور بے نیازی کو احساسِ کمتری سمجھتا ہے۔ اتنا نہیں سمجھتا کہ رشک وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں آدمی اس چیز کی طلب کرتا ہے جو اس کے پاس نہیں اور دوسروں کے پاس ہے۔ جس زبان اور جس اسلوب کی مجھے ضرورت نہیں وہ میرے لیے قابلِ رشک بھی نہیں چاہے وہ فاروقی کا ہی اسلوب کیوں نہ ہو۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے سلیم احمد کے اسلوب کی نقل اڑائی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ایسے لوگ سلیم احمد کو بعینہٖ، انھی نظروں سے دیکھتے ہیں جن نظروں سے نوجوان لڑکیاں راجیش کھنّہ کو اور مسلمان نوجوان دلیپ کمار کو دیکھتے ہیں۔ اسے انگریزی میں Doting کہتے ہیں۔ یعنی حمق کی حد کو پہنچی ہوئی پرستش۔ آدمی کا ادب سے تعلق بھی ایک باشعور اور ذہین آدمی کا تعلق ہوتا ہے، اُن کچی کنواریوں کا عشق نہیں جو اپنے Idol کے کاشانہ کی دیواروں پر بوسوں کے سرخ نشانات بناتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی تنقیدیں سپاس ناموں، تقریظوں، تعزیتی تجویزوں اور تہنیتی تقریروں سے آگے نہیں بڑھتیں، اور ہمارے یہاں ان چیزوں کی دھوم دھام ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں یہ قبول کرتا ہوں کہ کلیم الدین احمد اور سلیم احمد مجھ سے بڑے نقاد ہیں۔ منجملہ دوسری وجوہات کے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے جن لوگوں کا سابقہ ہے وہ ان لوگوں سے بہت چھوٹے ہیں جن کا سامنا ان دو حضرات کو تھا۔ بڑے لوگ شیر کا شکار کرتے ہیں۔ مکھیاں مارنے کے لیے اللہ تعالیٰ مجھ جیسے تیس مار خانوں کو جنم دیا ہے۔

ایک اور صاحب ہیں جنھوں نے میرے ذہن کو لذّت پرست کہا ہے۔ عربی میں ایک کہاوت ہے کہ احمق وہ ہوتا ہے جو نیم احمق سے زیادہ قابلِ برداشت ہو، احمق زندگی میں ملتے ہیں، نیم احمق تنقیدوں میں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے زندگی تنقید سے زیادہ قابل برداشت ہے۔ تنقید میں مہذب زبان کا تقاضا بھی شاید اسی لیے کیا جاتا ہے کہ نیم احمق نیم خواندہ لوگ اپنی احمقانہ باتیں کرتے رہیں اور کوئی ان کی سرزنش نہ کرے۔ ایسی پھبتیاں بقول ڈاکٹر جانسن مکھی کا گھوڑے کو ڈنک مارنا ہے۔ لیکن مکھی مکھی ہے اور گھوڑا گھوڑا۔ ذہنی لذت پسندی کا الزام ہمارے نقادوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ بادلیئر کا ذہن لذّت پرست تھا۔ اگر تھا تو ڈانٹے کے بعد دوسرے جہنم زار کو اپنی شاعری میں تخلیق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک جادو جگانے والے اسلوب میں فلا بیر نے ایما بوادی کے حُسن کا بیان کیا ہے۔ کیا یہ کام اس نے زبان کی چادر کے نیچے ایما کی پنڈلیاں سہلانے کے لیے کیا تھا۔ کیا جائیس نے میری بلوم کی خود کلامی اپنی تہمد میں ہاتھ ڈال کر لکھی تھی۔ میں پوچھتا ہوں جو زبان میں اب لکھ رہا ہوں اس زبان کے علاوہ ان احمقوں کی باتوں کا جواب دوسری کون سی زبان میں ممکن ہے۔

اس نقاد کے سامنے جس نے ادب میں تنقید کا شفا خانہ کھولا ہے، شاعر محسوس کرتا ہے کہ وہ آبگینۂ غزل میں صہبائے اندیشہ نہیں، بلکہ ہاتھ میں قارورے کی بوتل لیے کھڑا ہے اور منتظر ہے کہ دیکھیں کون سا مرض تشخیص اور کون سا نسخہ تجویز ہوتا ہے۔ زنانہ اور مردانہ بیماریوں کے ماہر حکیموں کے اشتہارات کی مانند عطائیوں کی تنقیدیں بھی شاعرانہ بیماریوں کا سائن بورڈ نظر آتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اب تو ادب میں سوائے نقاد کے کوئی اور صحت منداور نارمل آدمی نہیں رہا۔ دوسروں کو پاجی اور خود کو ناجی، دوسروں کو بیمار اور خود کو مسیح الزماں سمجھ کر بات کیجیے اور پھر دیکھئے تنقیدی اسلوب میں کیسے ہر لفظ موچھوں کو بل دیتا ہوا اور ران پر ہاتھ مار کر پہلوان کی طرح اینڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ زندگی بھر چارپائی پر کمبل اوڑھے بیمار ادب پڑھتے رہے اور ایک یہ بھی ہیں جن کے ذہن کے کھلے میدانوں میں تندرست خیالات قطار باندھے ورزش کرتے رہتے ہیں۔

لیڈر نقاد خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ محض نقاد بن کر اس نے اپنی ان صلاحیتوں کو غارت کیا جو قوموں کا مقدر بدل سکتی تھیں۔ فنکار نے تو ہمیشہ محسوس کیا کہ ''ہو کر سید بنے چمار سلیم'' اور شعر کہنے کے بعد ماتھا کوٹا کہ دھوبی کے بتھر ہوتے تو کسی کے کام آتے۔ تشکیک، تذبذب، کشمکش، پیچ وتاب، دار وگیر، زمین سے الجھاؤ، آسمان سے جھگڑا فنکارانہ خمیر کا حصہ ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہ ہونے کا احساس فنکار کو باغِ جہاں میں موجِ صبا کی طرح سبک سیر بناتا ہے۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہونے کا بھرم نقاد کو مال گاڑی کی طرح بھاری بھرکم بناتا ہے۔ خلائی جہاز۔۔۔ فنکار کا تخیل، یہ کہہ سکتا ہے کہ فضائے بیکراں میں، میں ایک چمکتا ہوا ذرّہ ہوں۔ مال گاڑی تو یہی کہے گی کہ کاٹھ گودام سے کاٹھ مال لادے کاٹھ کے اُلوّؤں کو سبق پڑھانے جا رہی ہوں۔ لیڈر نقاد جب بھی تنقید کے میدان میں آتا ہے تو لگتا ہے گویا کلیم اللہ کوہِ طور سے احکام ربانی لیے اتر رہے ہیں۔ شاعروں کی بستیوں میں اس کا نزول ہمیشہ اس مفروضہ کے تحت ہوتا ہے کہ اس کی غیر حاضری میں بے غسلوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی ہوگی۔

ایلیٹ نے بتایا ہے کہ تنقید وہی اچھی ہوتی ہے جو Descriptive ہو لیکن prescriptive تنقید لیڈر نقاد کے خون میں بسی ہوتی ہے کہ عطائی کا کام ہی نسخے لکھنا ہے۔ وہ تو چاہتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں مضامین غیب سے نہیں اس کی جیب سے پہنچتے رہیں اور تلمیذ الرحمٰن بننے کی بجائے وہ اس کا شاگرد بنے اور تختۂ سیاہ پر چاک کی خراش اس کے لیے نوائے سروش ثابت ہو۔ اگر شاعر گلستان کا قافیہ باندھتا ہے تو لیڈر نقاد اسے افغانستان کا قافیہ

سمجھا تا ہے وہ اتنی سی بات نہیں جانتا کہ جس طرح زمین اپنی سطح پر بہنے والی ہر چیز کو جذب کرتی ہے، فنکار بھی گردو پیش کی دنیا کو اپنی ذات میں جذب کرتا رہتا ہے۔ دریا آشام کو لیڈر نقاد تنقید کے نوکِ خار پر قطرۂ شبنم پیش کرتا ہے۔ فنکار پوری کائنات کو زیرِ دام تخیل لاتا ہے اور نقاد اسے وہ بلاٹینگ پیپر چبانے کو دیتا ہے جس سے اس نے اپنے سیاسی آقاؤں کی شاطرانہ تحریروں کی روشنائی خشک کی ہے۔ فنکار انکار کرتا ہے تو اسے طعنہ دیتا ہے کہ اس کے یہاں عصری آ گہی نہیں۔ وہ عصری آ گہی کو ایک لیڈر کے جلوس کی مانند دیکھنا چاہتا ہے جو الفاظ کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر پر گلے میں پھولوں کے ہار پہنے سب کے سلام جھیلتا گذر رہا ہو۔ انگوری شراب کے پارکھ ایک قطرہ زبان پر رکھ کر بتا دیتے ہیں کہ شراب کون سے ملک، کون سے علاقہ، اور کون سے وقت کی کشید کی ہوئی ہے۔ شعر بھی جرعۂ شراب ہی ہے جس میں ان فضاؤں کی نگہت اور ان زمینوں اور زمانوں کا رس کس ہوتا ہے جن میں شاعر سانس لیتا ہے لیکن سیاسی پمفلٹوں اور معاشرتی تنقیدوں کا ٹھرّا پی پی کر لیڈر نقاد کی زبان سبزی منڈی کی کھابڑ کھوبڑ سڑک بن چکی ہوتی ہے جو عصری آ گہی کو اسی وقت پہچانتی ہے جب شعر جاٹ کے جوتے کی مانند تلے میں نعروں کی کیلیں ٹھونکے مارچ کرتا ہوا گذرے۔ ایلیٹ نے تو کہا ہے کہ شاعر جب خود کو لکھتا ہے تو اپنے عہد کو لکھتا ہے۔ لیکن لیڈر نقاد کو سمجھتا ہے کہ شاعرانہ تخیل کی بھاپ اگر اس مال گاڑی کو کھینچنے کے کام نہیں آ رہی جو نئی دنیا اور نئے انسان کی تعمیر کا ساز و سامان لیے مارکسی کمٹ منٹ کی پٹریوں پر دوڑ رہی ہے تو شاعری محض خلیل خانی فاختہ بازی ہے۔

وہ لوگ جو مجھے خود پسند کہتے ہیں نہیں جانتے کہ میں سول لائنز کی کسی کوٹھی میں نہیں رہتا، مسلمانوں کے ایک غریب محلّہ میں رہتا ہوں۔ روزانہ گندی گلیوں میں ہگتے ہوئے بچوں کی قطاروں کو الانگتا پھلانگتا لائبریری جاتا ہوں اور فلابیر کا کوئی ناول، شیکسپئر کا کوئی ڈراما، چیخوف کی کوئی کتاب لاتا ہوں اور کمرے میں بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ گندگی اور حسن دونوں میری زندگی کا جزو ہیں۔ میں کیچڑ میں کھلا ہوا کنول نہیں ہوں بلکہ سخت کھردری اور عام انسانیت کے لق ودق صحرا کا وہ حقیر زرّہ ہوں جس نے عظیم فنکارانہ تخیل کے مہر نیم دوز کی آب و تاب کا جلوہ دیکھا ہے۔ مذاقِ سلیم آدمی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا، نہ ہی کتابوں سے سجے ڈرائنگ روم میں ادب کی گپ بازیوں سے سنورتا ہے، بلکہ نتیجہ ہے اُن تجربات سے گزرنے کا جو تخلیقی تخیل کی کرشمہ سازیوں نے اوراقِ عالم پر بکھیرے ہیں۔ میں نہ خود پسند ہوں نہ ذات کا زندانی۔ اپنے ایگو سے میں نے صرف اتنا کام لیا ہے کہ بھیڑ کی تہذیب کے لائے ہوئے بازاری پن سے اپنی ذات کو محفوظ رکھوں۔ میں وہ نازک مزاج نواب زادہ نہیں ہوں جسے نِومن روئی کے گدوں میں لٹا پایا گیا ہو اور محلّہ کے آوارہ چھوکروں کی صحبت سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ اشترا کی روس نے اپنے نازک اندام ادیبوں کو مغرب کے آوارہ درویشوں اور مجذوبوں کی صحبت سے بچانے کے لیے ہوا خوری کے ایسے مقامات کا انتظام کیا تھا، جہاں صاف ستھری فضا میں بیٹھ کر وہ ''صحتمند'' ادب کی تخلیق کر سکیں۔ منصوبہ بندی کی اولاد مرکھنی اور یرقانی پیدا ہوئی تو اس کا سبب یہی ہے کہ تخلیق کا کام چاہے فن کی سطح پر ہو یا بایولوجی کی سطح پر شدت، جوش، تیزی اور تندی چاہتا ہے۔ اتنی سی بات تو ملٹن کی وساطت سے حالی بھی سمجھتے تھے۔ ہم نے سمجھنا چھوڑ دیا تو منٹو نے ''اوپر نیچے درمیان'' لکھا تہذیب کا ''اوپری ڈھانچہ'' جب بیوروکریٹ کی منصوبہ بندی کا شکار ہو جاتا ہے تو ادیبوں کو پھولوں میں تولا اور گنگا جل میں نہلایا جاتا ہے کہ صاف ستھرے رہیں اور صاف ستھرا ادب پیدا کریں۔ اوپر کی منزل میں ہم بستری کی رات ڈاکٹروں کے لیے رت جگا بن جاتی ہے۔ درمیان کی منزل میں کتابیں پڑھ پڑھ کر تحریک پیدا کی جاتی ہے تا کہ قلم چل سکے۔ نیچے کی منزل میں تخلیق کی اندھی جبلّت منصوبہ بندی کی اس کھاٹ کو توڑ دیتی ہے جس کے ناپ کے مطابق ادب کا جسم تراشا جاتا ہے منٹو نے بتایا ہے کھاٹ ٹوٹتی ہے ہڈیاں نہیں ٹوٹتیں۔ جب جذبہ پر جوش ہوتا ہے تو اپنے شدید ترین لمحات میں بھی آدمی Brute نہیں بنتا Tender ہی رہتا ہے۔ جب جذبہ سرد ہوتا ہے تو پیار کے میٹھے گھاؤ کی جگہ سادیت پسندوں کے کوڑوں کے زخم لے لیتے ہیں۔ جوش اور مستی کو جو چیز قابو میں رکھتی ہے وہ فارم ہی ہے۔ جدید جنسیات کی کتابیں آپ کو بتائیں گی کہ ہوسناک مرد، ہوسناک جوڑا۔۔۔ اور ہوسناک بوڑھا کے دور میں آدمی کی لذت کوشی اور مزیداریوں نے کیسے کیسے ''فارم'' ایجاد کیے ہیں۔ یہ ٹھنڈے جسموں کے عجوبے اور چیستان، یہ جنسی گجٹ کی گرم بازاری، یہ کمپیوٹر میں شاعری تخلیق کرنے کے منصوبے، یہ بلیو پرنٹ کے مطابق تہذیب پیدا کرنے کے پلان۔۔۔ علامت ہے جذبہ کی موت اور فکر و نظر کے پرورژن کی۔ اشترا کیوں کی اوپری منزل میں ''صحت مند'' ادب تخلیق ہوتا ہے۔ منٹو نے وہاں ڈاکٹر جمع کر دیے ہیں، بورژواژیوں کی درمیانی منزل میں کتابوں کے تراشوں کا کمرشیل ادب تخلیق ہوتا ہے۔ منٹو نے وہاں ''تیاری'' کا عمل بتایا ہے۔ نچلی منزل میں نہ ڈاکٹر ہیں نہ کتابیں، نہ علاج الغرباء نہ تیاری۔۔۔ ایک پُرشور جبلت، ایک سلگتا ہوا جذبہ، تخیل کی بے محابا اڑان اور فارم کا کلاسیکی نظم و ضبط۔ یہ سب ہوا خوری کے مقامات پر حاصل نہیں ہوتا، ذات کے آئینہ خانہ میں بھی نہیں ملتا۔ کتابوں سے بھی سیکھا نہیں جاتا، بلکہ اپنی کھال میں جینے، زندگی کو ہر رنگ میں قبول کرنے، مختصر یہ کہ فلابیر کو بغل میں دبا کر ہگتے ہوئے چوتڑوں کے بیچ گزرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

آدمی ادب کیوں پڑھتا ہے۔ اس سوال کا جواب دوسرے سوال سے پانے کی کوشش کیجیے۔۔۔ آدمی نماز کیوں پڑھتا ہے۔۔۔؟ شاید کش مکش حیات سے تنگ آ کر، انقلاباتِ زمانہ سے ٹوٹ پھوٹ کر، مسلسل ناکامیوں سے شکست کھا کر۔۔۔ یا پھر روحانی تشنگی کو مٹانے کے لیے، لامحدود سے رشتہ قائم کرنے کے لیے، مابعد الطبیعاتی کرب سے نجات پانے کے لیے۔ یا پھر نارِ جہنم کے خوف سے، مئے دانگبیں کی لاگ میں، توبہ و استغفار کے لیے۔۔۔ نیک نامی یا

دکھاوے کے لیے یا محض عادتاً۔۔۔غرض یہ کہ بے شمار وجوہات بتائی جا سکتی ہے۔ضروری نہیں کہ نمازی ان وجوہات کا شعوری علم رکھتا ہو یا جو وجہ وہ بتائے وہی واحد یا صحیح وجہ ہو۔نماز سے آدمی اپنی بے شمار نفسیاتی، جذباتی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا رہا ہے لیکن نماز ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔نماز کا مقصد ایک ہی ہے آدمی اس کے ذریعہ ربّ ازل سے اپنا روحانی رشتہ قائم کرے۔نماز کے ذریعہ مختلف مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ مقاصد نماز کے فنکشن کا تعین نہیں کرتے۔ترقی پسند ملاؤں کی طرح مذہب کے ملاؤں کو بھی صحت کا لفظ بہت پسند ہے۔چنانچہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نماز ایک قسم کی ورزش ہے۔یہ ممکن ہے کہ نماز کی اُٹھ بیٹھ سے آپ کی کمر کا درد دُور ہو لیکن کمر کے درد کا علاج کرنا نماز کا مقصد نہیں۔اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ نماز سے آپ کے گھریلو مسائل او رجذباتی پیچیدگیاں سلجھ جائیں، لیکن نماز کے سامنے یہ واضح مقاصد نہیں ہیں۔ممکن ہے کہ تہجد پڑھنے کے باوجود یہ مسائل جہاں تھے وہیں رہیں یا زیادہ شدید ہو جائیں۔آخر تمام نمازیوں کے گھر فردوسِ بریں کا نقشہ نہیں ہوتے۔

ادب سے آپ بے شمار کام لے سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر تو ادب ایک ہی کام کرتا ہے۔ایک ایسے جمالیاتی تجربہ کی تخلیق جس کی قدر و قیمت سوائے تجربہ میں شرکت کے کچھ اور نہیں۔اگر ادب کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے اس کا یہ بنیادی فنکشن بے اثر بنتا ہے، اگر زندہ ادبی تجربہ کی قیمت پر علمی، تحقیقی اور تنقیدی سرگرمی ادبی فضا پر تسلط جماتی ہے تو آدمی تخلیقی ادب کے حیات پرور تجربات میں جینے کے بجائے تحقیق و تنقید و تدریس کی جھوٹی چمک دمک کا گرویدہ بنتا ہے،۔۔۔چاروں طرف نکمّے تحقیقی مقالات کے اوراق پھڑ پھڑاتے ہیں، نقادوں کا دور دورہ اور مدرسوں کی گرم بازاری ہوتی ہے، اور تخلیقی ذہن ذرا سہما ہوا اور گھبرایا ہوا، اپنے قاری اور اپنے ناشر تلاش کرتا پھرتا ہے:

جب ادب اپنے خَتم پر آئے
ہر مدرس ادیب کہلائے

(کمار پاشی)

مدرسہ کی فضا ہی ایسی ہوتی ہے کہ لسان العصر، بلبلِ شیراز اور طوطیِ ہند سب سُرمہ پھانک لیتے ہیں۔صرف مدرّس جوٹرّاتا رہتا ہے اور کلاس روم کے در و دیوار ان معلومات سے گونجتے رہتے ہیں جن کا توانا تخلیقی تجربات سے دور کا بھی سروکار نہیں ہوتا۔ہر ذی روح کی طرح مدرس بھی عمرِ دراز کے چار دن مانگ کر لاتا ہے۔۔۔دو دن پی ایچ ڈی کے موضوع کی تلاش میں اور دو موضوع پر ''کام'' کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ مدرس کے لیے پی ایچ ڈی کے مقالے کی وہی اہمیت ہے جو داستانی عہد کے سورماؤں کے لیے ہفت خواں کی ہوا کرتی تھی۔کہ ہفت خواں نہ ہوں تو سورماؤں کے لیے کنوئیں جھانکنے کے سوا کوئی کام ہی نہ رہتا تھا۔ مدرس ان عجوبۂ روزگار لوگوں کی اولادِ معنوی ہے جو اگلے زمانہ میں چاول پر قل ھو اللہ لکھا کرتے تھے، کہ اُن ادیبوں پر بھی جن کا ادبی جثہ چاول کے دانہ سے کچھ ہی بڑا ہوتا ہے۔پانچ سو صفحہ کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنا اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔اس مقصد کے لیے وہ عہدِ وسطیٰ کے کیمیا گروں کی طرح تاریک تہہ خانوں میں بیٹھا نوابان اودھ کی داشتاؤں کی فہرست بنا رہا ہوتا ہے۔اب آپ یہ نہ پوچھیے کہ بھلا نواب کی داشتاؤں کا شاعر کے اُن قصائد سے کیا تعلق جو نواب کی شمشیر جوہردار کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔کیا آپ کو نہیں معلوم کہ داشتہ آید بکار، کی ضرب المثل مدرسوں اور محققوں کے یہاں اسمِ اعظم کا مقام رکھتی ہے، مدرّس ہر ادیب پر مضمون لکھ سکتا ہے۔ ہر مجموعۂ کلام پر تبصرہ لکھ سکتا ہے ۔ ہر کتاب پر ایسی رائے دے سکتا ہے جو دوسرے مدرّسوں کے کام آئے حالانکہ بہت سی کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی تزکیۂ نفس اور راہِ سلوک کے آخری مقام پر پہنچ کر بھی اُن کے متعلق لب کشائی کرے تو بھنچے ہوء لبوں سے سوائے بے نقط ملفوظات کے کچھ اور باہر نہ نکلے۔لیکن مدرس بے نقط کبھی نہیں بولتا۔جب بھی بولتا ہے تنقید ہی بولتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب تک مدرس کے دم میں دم ہے وہ کسی شاعر کو اپنی طبعی موت مرنے نہیں دیتا۔وہ جو دوسروں کے لیے مر گئے وہ بھی حنوط زندہ ممیوں کی طرح مدرّس کے مقالوں میں زندہ ہیں۔جن شاعروں پر نول کشور فاتحہ پڑھ چکے، اُن کا عرس منانے کے لیے مدرس ماوراء النہر سے چلتا ہے تو پانی پت میں آ کر دم لیتا ہے۔غزل کے ان اشعار کو سمجھنے کے لیے جن میں شوخ طبع شاعر نے نوخیز لونڈوں کے سبزۂ خط پر بھیگی بھیگی نظریں ڈالی تھیں، مدرّس احمد شاہ درّانی کی خوں آشام تلواروں کی چقا چاق کا نغمۂ روح فرسا اس وقت تک سنتا رہتا ہے، جب تک موجِ خوں سمندِ تحقیق کی کمر تک نہیں پہنچتی۔ اگر شاعر نے اپنے کلبۂ تاریک میں بیٹھ کر شکارنامہ لکھا ہے تو یہ جاننے کے لیے کہ نواب نے کون سے جنگلوں میں کون سے جانوروں کا شکار کھیلا تھا وہ وزارتِ جنگلات تک کو سوال نامہ بھیجنے سے احتراز نہیں کرتا۔مدرّسوں میں یہ قول حدیث اقدس کا مقام رکھتا ہے کہ قدیم تذکرہ نگاروں میں تنقیدی شعور نہیں تھا۔میرا خیال ہے کہ اچھا ہی ہوا کہ نہیں تھا۔ورنہ لالہ سری رام بھی ہر شاعر کا کما حقہ، تنقیدی مطالعہ پیش کرتے تو خم خانۂ جاوید کے سامنے طلسمِ ہوش ربا کی جلدیں تجریدی افسانوں کی طرح مہین معلوم ہوتیں۔ میں پوچھتا ہوں فلک سیر تخیل کے اڑن کھٹولے کا پایہ تھامے ستاروں سے جگمگاتی فضاؤں میں پرواز کرتی روح کا ان تہہ خانوں کی سرگرمیوں سے کیا تعلق ہے؟

ایک وہ ہیں جن کی دانشورانہ ورزش موضوع پر سماجیاتی بحث ہے۔ ادب ان کے لیے سیر و سیاحت نہیں بلکہ بزنس ٹور ہے۔وہ لوگ جو گڑ خریدنے جاتے ہیں راستے میں گنّے کے کھیت نہیں دیکھتے دوسرے وہ ہیں جو بوژداژیوں کے .Prestige conscious fads اور کلچر کے کرگسوں کے Offbeat intellectualism کی ببھوت ملے اساطیر کے جنگلوں میں ان علامات کی کھوج کرتے ہیں جو خوبصورت عورتوں کی کٹی ہوئی گردنوں کی مانند درختوں کی

شاخوں پر لٹکتی ہیں۔اُن کی تنقید کمال کو پہنچے ہوئے بزرگ کا وہ طلسماتی نقش ہوتی ہے جو کٹی گردنوں کو دھڑوں سے پیوست کرتی ہے۔موضوعِ سخن چاہے،لندھور بن سعدان ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ بات ہی کیا جو کیلاش کے دیوتاؤں اولمپس کے خداؤں پر اپنی کمند نہ پھینکے۔دانشورانہ جمناسٹک ، سنابری اور سوفسطائیت جھوٹے نگینوں کی چمک ہے۔دانش مندی میں حسین شام کی ملاحت اور دلربائی ہے۔خود آگاہ آرٹ اور خودنگر تنقید دونوں شاخِ گل کی لچک،جنگلی پھول کی مہک اور وحشی کے ڈھول کی دھمک سے محروم رہتے ہیں۔عظیم آرٹ قاری کے سامنے کم سے کم مطالبات رکھتا ہے اور زیادہ سے زیادہ بصیرت اور مسرت بخشتا ہے۔چیخوف کے افسانوں کا خوبصورت لینڈ سکیپ اس سرسبز وادی کی مانند ہے جس کی مخملیں پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتا سورج سنہری کرنوں کا جال پھینکتا ہے۔یہ منظر لازوال ہے اور ہر اس شخص کے لیے ہے جو وادی تک جانے کی زحمت گوارا کرے۔آرٹ حسن ومسرت کا مسلسل بہتا جھرنا ہے۔اس وادیٔ گل سے لطف اندوز ہونے کے لیے صرف ذوقِ تماشا اور نگاہِ شوق کی ضرورت ہے۔آرٹ کوہ کنی نہیں ہے۔علامتوں کے جنگلوں کا سراغ پانا نہیں ہے۔مرغابی کا سب سے بڑا انڈا لانا نہیں ہے۔یہ مہمات ہیں اور ادب کا قاری مہم سازی نہیں کرتا، وادی رنگ ونور میں گل گشت کرتا ہے اور دھنک کے سات رنگوں سے تارِ نظر کو مالا مال کرتا ہے۔تجریدی افسانہ پہاڑ کی سیر نہیں کراتا، بلکہ پہاڑے گنواتا ہے۔وہ ادب جو آدمی کو ہانپتا کر دے اس عورت کی مانند ہے جو منزّل نہیں ہوتی۔جب عظیم فن پارہ سامنے ہوتا ہے تو قاری کے دل کی دھڑکن اور روح کی لرزشیں،الفاظ کے زیروبم اور اسلوب کی ردھم سے ہم آہنگ ہوتی ہیں سفید کاغذ پر کالے حروف غائب ہو جاتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے لق ودق میدان ابھرتے ہیں جن پر برفانی ہوائیں سنسناتی ہیں،اور جھیل کے خاموش پانی پر بنی ہوئی کشتی ایک چپ چاپ گھورتے پہاڑ سے گزرتی ہے،اور سرخ صوفے پر بیٹھی ہوئی خوبصورت عورت کے سنہری بالوں میں ڈوبتے سورج کی کرن الجھ جاتی ہے۔کہاں ہیں الفاظ،کہاں ہے کتاب،کہاں ہے قاری۔وہ الفاظ معدوم ہو گئے ہیں جن میں منظر قید ہے۔نظر کتاب پر ہے لیکن صاحبِ نظر مشاہدے میں گم ہے یہ ہے مادّے پر تخیل کی آخری فتح۔لسانی تنقید لفظوں کی کیا چھان پھٹک کرے گی۔جب کہ قاری لفظوں کو پڑھ نہیں رہا بلکہ لفظوں سے ماوراء کسی اور چیز کو دیکھ رہا ہے کتاب اور قاری کے بیچ، دونوں کے جدلیاتی ٹکراؤ سے تجربہ کی ایک نئی کائنات نے جنم لیا ہے جس کی نیلگوں فضاؤں میں قاری کی روح ایک پرندے کی مانند ڈوبتی چلی جاتی ہے۔میں پوچھتا ہوں کیا وہ چیستانی ادب جس کے مطالعہ کے دوران قاری کتاب کو کھلی اور برہنہ چھوڑ کر اکیس بار پیشاب کرنے جاتا ہے،اہتزاز کا یہی لمحہ فراہم کرتا ہے؟۔

عظیم آرٹ میں پیچیدگی اور تہہ داری کے باوصف جو سادگی ،شدت اور سچّا ہوتی ہے خود آگاہ آرٹ اس سے محروم ہوتا ہے۔طاقتور تخیل کی توانا تخلیقی گورکی کی اس جفاکش کسان عورت کی زچگی ہے جسے کھیت سے گھر لوٹتے وقت راستہ ہی میں بچہ ہو جاتا ہے۔وہ بچہ کو پھٹے پرانے کپڑے میں لپیٹ کر، سر پر ایندھن کی لکڑیاں رکھ کر پھر گھر کی راہ لیتی ہے۔اس تنومند عورت کا مقابلہ آج کی دھان پان زچاؤں سے کیجیے۔پانچ شعر کی غزل اور تین صفحوں کا افسانہ جنم لیتا ہے تو آسمانِ ادب کے کنگورے ہل جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے گویا اس گائے نے اپنا سینگ بدل دیا جس پر زمین شاعری رکھی ہوئی تھی۔آج کا ادیب حمل ٹھہرنے سے قبل ہی وہ تمام کتابیں پڑھنا شروع کر دیتا ہے جو ایامِ حمل میں بچہ کی نگہداشت کے لیے ادب کے عطائیوں نے ضروری قرار دی ہیں۔معالج نقّادوں کا ایک طائفہ ہے جو تنقید کے مطب میں بیٹھا علامت، متھ، آرچی ٹائپ، عصری آگہی اور نظریاتی وابستگی کے سفوف کھرل میں گھوٹتا رہتا ہے تاکہ نورِ چشم نوراً علی نور پیدا ہوں۔حاملہ کی طرح فنکار کو خوب ذہنی ورزش کرائی جاتی ہے۔کبھی وہ انسان دوستی کی لمبی گہری سانس لیتا ہے کبھی کمٹ منٹ کی زنجیر سے بندھا جہاں کھڑا ہے وہیں دوڑتا رہتا ہے۔کبھی چشمۂ شعور کی لہروں پر ہولے ہولے بہتا ہے اور کبھی فلسفہ کا بانس تھامے مابعد الطبیعات کے خلاؤں میں چھلانگ مارنے کی کوشش کرتا ہے تو مجھ جیسے لوگ چیخ اٹھتے ہیں ''میاں! کیا کرتے ہو۔تم حاملہ ہو، اسقاط ہو جائے گا!''۔۔۔اور اسقاط ہوتا ہے۔

میں نئے لکھنے والوں کے تخلیقی تجربات اور جدید ادب کے دانشورانہ خمیر کے خلاف نہیں ہوں بلکہ تخیل کے اس غلط استعمال کے خلاف ہوں جو Wholesomeness کی بجائے **Brilliance** پر اپنی قوت صرف کرتا ہے۔اسی لیے میں نئے تجربات کو ان کی Facevalue پر قبول نہیں کرتا بلکہ ان کی پرکھ کلاسیکی ادب کے تناظر میں کرنا پسند کرتا ہوں۔میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی سوفسطائیت کی دھاک بٹھانے کے لیے غیر دلچسپ کتابوں کی بیاباں نوردی کرتے رہتے ہیں۔ادب اگر دلچسپ نہیں تو گویا وہ اس عنصر ہی سے محروم ہے جو اس کے ہونے کا جواز ہے تہذیبی سناب کلاسیکی ادب کا شعور نہیں رکھتا اور اپ ٹو ڈیٹ ادب، تازہ ترین رجحان اور جدید ترین تجربہ کا ذکر کرتا ہے۔اس کے نزدیک تو اردو زبان زرعی تمدن کی یادگار ہے جو محل سراؤں میں بیگموں اور داہیگنیوں کے درمیان بات چیت کے لیے وجود میں آئی تھی۔وہ اردو شاعر اور قوّال میں کوئی فرق نہیں کرتا اور اس کے لیے اردو ادیب کا مطلب ہے وہ منشی جو کھٹاؤ آلفریڈ کمپنی میں پارسی سیٹھوں کے لیے ڈرامے لکھتا تھا۔ایسے اپ ٹو ڈیٹ لوگوں کے سامنے آپ نے بیس سال ادھر کی بات کی، حتیٰ کہ فیض اور اختر الایمان کو پسند کیا تو آپ پان چبانے والے اس اگال دانی شہر کے باشندے ٹھہرے جہاں لوگ پیدل رکشا میں سوار ہو کر چتا جان کے کھوٹے پر خواجہ وزیر کی غزلیں سننے جاتے ہیں۔

جی نہیں مجھے ایسا دو آتشہ جدید یا بننا بھی منظور نہیں۔میں کوشش کرتا ہوں کہ فلسطیت اور سوفسطائیت دونوں سے پہلو بچا کر چلوں کہ دونوں ادب سے لطف اندوزی کے دشمن ہیں۔اسی لیے میں ادب آرٹ اور تہذیب کے معاملہ

میں کسی تحریک، رجحان یا مکتب سے کمٹ ہونا پسند نہیں کرتا۔ مجھے اپنی نظر پر اعتماد ہے اور نظر کو میں کسی نظریہ کا پابند کرنا گوارا نہیں کرتا۔

''کتابیں پڑھ کر بھول جانے کے بعد جو کچھ ذہن میں محفوظ رہتا ہے وہ کلچر ہے۔'' کلچر کی یہ تعریف گسے دی آرتیگا نے کی ہے۔ یہ تعریف مبہم سہی لکن ہم اس کی گہری معنویت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ کتابیں پڑھ کر ہم بھول جاتے ہیں جو کچھ بچتا ہے وہ ذہن کو حسن و رعنائی عطا کرتا ہے۔ لیکن آج کل کلچر ریاست، اکاڈمی اور کمرشیل اداروں کا وظیفہ دار چوبدار ہے۔ ریاست کلچر کے لیے ہواخوری کے مقامات پر زچہ خانے تیار کراتی ہے۔ اکاڈمی کے ہاتھوں بقول سائمن ویل کلچر ایک ایسا ذریعہ ہے جو پروفیسر پیدا کرتا ہے جن کا کام دوسرے ایسے پروفیسر پیدا کرنا ہے جو پیدا ہوتے ہی مزید پروفیسر پیدا کرنے کے کام میں جت جائیں۔ تجارتی اداروں کا کام کتابوں کے ڈائجسٹ، مشکل کتابوں کے آسان نسخے، کلاسیک کے کامک، ناولوں کی تلخیص، ڈراموں کے پلاٹ، نظموں کی نثر، اور فارمولوں کے مطابق تفریحی ادب پیدا کرنا ہے۔ اس طریقۂ کار نے ایک طرف تو تہذیب کے Consumers پیدا کیے اور دوسری طرف تہذیب کے گدھ۔ تہذیب کفایت سے بچائے ہوئے لمحاتِ خلوت میں ذہنی سکون اور روحانی سرشاری کے حصول کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ نمود و نمائش، گپ بازی اور ڈینگ ڈانگ کا ذریعہ بن گئی۔ بزم ناؤنوش میں تلچھٹ چکھنے والا ہم چشموں میں بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کا ذکر اس طرح کرنے لگا گویا خم پر خم لنڈھا کر آیا ہے۔ مطالعۂ ادب کا مقصد فن پارے کی تخیلی فضاؤں میں خود فراموشی کے بجائے یہ ٹھہرا کہ محفل ادب میں آدمی لقمہ چینی کی سعادت سے محروم نہ رہے۔ کلچرل پروگراموں کی ہنگامہ خیزیوں اور چلتی پھرتی تنقیدوں میں اپنی پاکیزہ اور نفیس شخصیت کی نمود و نمائش کا بھلا تنہائی کے اُن لمحات سے کیا سروکار جن میں ایک منکسر مزاج قاری اپنی ذات، اپنے عقائد اور اپنے نظریات کے حصاروں سے باہر نکل کر اس دنیا میں تحلیل میں ہو جاتا ہے جو ایک معجز نما تخیل نے لفظوں کی ذریعہ تخلیق کی ہے۔ جمالیاتی تجربہ خود فراموشی ہے۔ تجربہ کی اپنی ایک اہمیت او رقدر ہے اور تجربہ اسی وقت تک تجربہ ہے جب تک وہ کیا جا رہا ہو۔ تنہائی کا وہ لمحہ جس میں فن پارہ اپنے اسرار و رموز کے نقاب کرتا ہے، اور رنگ و نور کی ایک طلسمی کائنات تخلیق کرتا ہے اتنا پُر کیف، پُر نشاط، گراں بہا اور بے مثال ہے کہ اسے کھو کر کسی اور چیز کو پانے کی ہر کوشش ہیچ اور اسفل معلوم ہوتی ہے۔ وہ جو ایسے تجربات سے گزرے ہیں ان کا ادب کا ذوق شوق میں، شوق لگاؤ میں لگاؤ جذبہ، اور جذبہ جنوں میں بدل جاتا ہے۔ فن کی کشش عورت کے جواں جسم کی پکار اور پہاڑ کا بلاوا بن جاتی ہے۔ آرٹ ذریعۂ بے خودی بھی بنتا ہے اور موجب ہوشمندی بھی، جراحت دل کا مرہم اور بے قرار روح کا قرار بھی۔ جھلسے ہوئے اعصاب کا سکوں، اور ٹکڑے ٹکڑے ذات کا گوشۂ اماں بھی۔ ادب ہاتھی دانت کا مینار نہیں ہے لیکن روشنی کا وہ مینار ضرور ہے جہاں کھڑے ہو کر آپ زندگی کی تلاطم خیزیوں کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ ادب جزیرۂ فرار نہیں ہے۔۔۔ لیکن وہ جزیرہ ضرور ہے جس کی پرکیف اور سرانگیز فضاؤں میں تھوڑی دیر ستا کر اور اس کی بلند چوٹی سے زندگی کے بحر بے کنار پر نظر ڈال کر، چٹانوں سے سر پھوڑتی شوریدہ سر موجوں کا تماشا دیکھ کر۔۔۔ پھر اپنی کشتی کو طوفان موجوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ ادب اور آرٹ میں مسرّت، سکون، قرار، توازن، دل جوئی اور دلاسا دینے کی جو قوت ہے۔۔۔ ناسازگار کو سازگار اور بدآہنگ کو خوش آہنگ بنانے کی جو طاقت ہے اس کا اثبات تو مطالعۂ ادب کے ہمارے روزمرہ کے طور طریقوں ہی سے ہوتا رہتا ہے۔ جب ہم دن رات کام کرنے سے تھک جاتے ہیں، چھوٹی موٹی پریشانیوں سے گھبرا جاتے ہیں، محفلوں اور ہنگامہ آرائیوں سے اکتا جاتے ہیں، طویل سفر سے لوٹتے ہیں، جب موسم خوشگوار ہوتا ہے اور دن چمکدار ہوتا ہے اور وہ لمحہ جس میں ہم زندگی سے خوش نظر آتے ہیں ایک پرکیف نشہ کی مانند ہمارے وجود پر چھاتا ہے، جب رات خاموش اور پراسرار ہوتی ہے اور بے کراں خلاؤں کے سناٹے ہماری تنہائی کو شدید سے شدید تر بناتے ہیں۔ اس وقت ایسے لمحات میں، کبھی شیکسپیئر کو، کبھی وڈز ورتھ کو، کبھی فلابیر اور چیخوف کو، کبھی میر و غالب، کبھی فراق اور فیض کو بک ریک سے اٹھا لیتے ہیں اور مطالعہ کا لمحہ ہمارے لمحۂ انبساط کی توسیع، غمِ جاں گداز کا مرہم اور رموزِ حیات کا عرفان ثابت ہوتا ہے۔ سنگیت کاروں نے صبح و شام اور رات کے الگ الگ راگ بنائے ہیں۔ عوام کے پاس چمکتی دھوپ میں دھان بونے اور دھان کاٹنے کے پر مسرت گیت بھی ہیں اور وہ رقص نغمے اور کہانیاں بھی جن سے وہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیروں پر رنگ و نور کا شب خوں مارتے ہیں۔ ادب آرٹ اور شاعری انسان کو فطرت کے ساتھ جینے کے آداب سکھاتی ہے کیونکہ وہ اُن جذبات و احساسات کا بیان ہوتی ہے جو بدلتے رات دن، اور بدلتے موسموں اور بدلتے زمانوں کے زائیدہ ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم رات کی خاموشی میں کوئی راگ سنتے ہیں، اسی طرح رات کی خاموشی میں ہم شیکسپیئر اور فراق کی آواز سنتے ہیں۔ ہمارے مطالعہ کے یہ طور طریقے ہی مقصدی اور تعلیمی ادب کے کھٹل نظریات کا انکار ہیں۔ ادب کا مطالعہ مارکسزم، مودودیات اور سماجیات کا مطالعہ نہیں ہے۔ یہ کوئی کارِ خیر کارِ ثواب خدمت علم اور خدمت انسان نہیں ہے۔ یہ روح کی اڑان ہے ان آسمانوں میں جہاں تخیل کی چاندنی چھٹکتی ہے اور احساس جگمگاتے لفظوں کی کہکشاں میں ڈھلتا ہے۔ زندگی اگر محض ذوقِ پرواز ہے، قوتِ حیات کا بروز ہے فشار رنگ و نور ہے۔ نت نئے فینو مینا کا اٹوٹ سلسلہ ہے تو پھر ادب بھی محض ذوقِ پرواز، کارواں کا بے منزل سفر، تخیل کی آوارہ اڑان اور الفاظ کی نازک انگلیوں سے احساس کے موہوم دھندلے لینڈ اسکیپ کی بے نقابی کیوں نہیں ہو سکتا۔ جو دنیا ادب تخلیق کرتا ہے اگر اس وادی کی مانند حسین ہے جہاں قافلۂ نوبہار ٹھہرا ہے، جو تجربہ ادب ہمیں بخشتا ہے اگر تاروں بھری رات کی مانند دل آویز اور پُراسرار ہے، جو شعور ادب ہمیں عطا کرتا ہے اگر پُرخطر پہاڑی

راستہ کی مانند ہولناک ودلفریب ہے تو وارفتہ نگاہوں اور کیف وسرور وتحیر میں ڈوبی نظروں سے ان طلسماتی مناظر کا مشاہدہ کرنے کی بجائے ہم سٹّا بازیوں کی نفع و نقصان اور پرہیز گاروں کی صالح اور غیر صالح اور اطبّا کی مفید اور غیر مفید جارگون والی زبان کیوں بولنے لگ جاتے ہیں؟

نبا کوف کے دلچسپ ناول Palefire میں ناول کے مرکزی کردار جان شیڈ جو ایک شاعر ہے کے متعلق یہ جملے دیکھنے کو ملتے ہیں:

''یہ رہا ہو (جان شیڈ)۔۔۔ میں اسے دیکھ کر سوچتا ہوں، یہ ہے اُس کا سر جس میں وہ دماغ ہے جو جیلی جیسے اُن پلپلے بھیجوں سے بہت مختلف ہے۔ جنھیں لوگ اپنی کھوپڑیوں میں لیے گھوما کرتے ہیں۔ وہ جھروکے میں کھڑا دور جھیل کی طرف دیکھ رہا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ فی الحقیقت میں ایک عجیب جسمانی فینومینا کو دیکھ رہا ہوں میں شاعر جان شیڈ کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ کھڑا ہوا دنیا کا نظارہ کر رہا ہے، اور اس نظارے کے دوران میں وہ دنیا کو Transform بھی کر رہا ہے۔ وہ دنیا کو اپنی ذات میں جذب کرتا ہے اور پھر اسے اپنی ذات سے الگ کرتا ہے۔ وہ دنیا کے عناصر کو نہایت پاکیزگی سے اپنی ذات میں محفوظ کرتا ہے اور محفوظ کرنے کے دوران انہیں ایک نئی ترتیب عطا کرتا ہے اور وہ یہ سب کچھ (غیر شعوری طور پر اس لیے) کرتا ہے کہ مستقبل کے کسی نا معلوم لمحہ میں وہ ایک Organic معجزہ پیدا کرے۔۔۔ موسیقی اور تصویری پیکر کا Fusion جسے شعر کہتے ہیں۔

''اور جان شیڈ کو دیکھ کر مجھے وہی Thrill محسوس ہوئی جو بچپن میں میرے چچا کے یہاں ایک جادوگر کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ حیرت انگیز شعبدے بتانے کے بعد کرسی پر بیٹھا آئس کریم کھا رہا تھا۔ میں اس کے اُن رخساروں کو دیکھ رہا تھا جن پر غازہ لگا ہوا تھا اور اس پھول کو بھی دیکھ رہا تھا جو مختلف رنگ بدلنے کے بعد اب سفید کارنیشن کی صورت میں ایک کے کالر کے بخیہ میں رونق افروز تھا۔ لیکن میری پرشوق نگاہیں خاص طور پر ان سبک اور چالاک انگلیوں پر جمی ہوئی تھیں جو چاہتیں تو چمچہ کو دبا کر روشنی کی کرن میں تحلیل کر دیتیں یہ طشتری کو فاختہ بنا کر ہوا میں اڑا دیتیں۔

''جان شیڈ کی نظم بھی جادو کا یہی شعبدہ ہے''

وہ لوگ جو بقراط ہیں، جن کے چہرے لمبوترے ہیں، اور جو سارے جہاں کا چودھرا پا لیے ہوئے ہیں، اگر جادونگری میں داخل بھی ہو گئے تو یہی چلّاتے رہیں گے کہ فاختہ کو دوبارہ طشتری بنا دو کہ طشتری کام کی چیز ہے۔ زمانہ شاعر کو پاگل پیکن اور بچہ کہتا آیا ہے۔ مدرّس پاگل پر ہنستا ہے، پیکن سے ڈرتا ہے اور بچہ سے ایک ہی بات کہتا ہے۔ ''آموختہ سناؤ''۔ فاختے اڑانا اس کے نزدیک شوقِ فضول ہے اور اسی لیے وہ خلیل خاں کی بات کو خلیل اللہ تک پہنچاتا ہے کیونکہ وہاں آگ ہے، اولادِ ابراہیم اور امتحان ہے اور امتحان میں مدرس کی دلچسپی عیاں ہے۔ لیکن خلیل اللہ بھی پیغمبر تھے مدرس نہیں تھے۔ ترقی پسند ہوتے تو آگ کو گلزار میں بدلنے کی بجائے روٹیوں کے انبار میں بدل دیتے، لیکن انھوں نے اس شاعری کی طرح جو غم جاں گداز کے شعلۂ جوّالہ کو ایسا حسن عطا کرتا ہے کہ چمنِ شاعری دہک اٹھتا ہے، انگاروں کو پھولوں میں بدل دیا۔ شاعر اور پیغمبر دونوں تجرید میں نہیں تجربہ میں جیتے ہیں۔ ان آوازوں کو سنتے ہیں جو کسی کو سنائی نہیں دیتیں۔ دونوں کو پیغامات اور مضامین غیب سے آتے ہیں۔ نوائے سروش دونوں کا سرچشمہ فیض ہے۔ انسان، فطرت اور کائنات کا علم وہ کتابوں سے نہیں بلکہ چشم بینا سے حاصل کرتے ہیں اور یہ آنکھ صاحبِ بصیرت کی آنکھ ہوتی ہے۔ مشاطۂ فطرت ان کے تخیل کی حنا بندی کرتی ہے اور ان کا تخیل حواس سے ماورا تجربات کا ادراک کرتا ہے۔ مکتب میں مذہب علم الکلام اور شاعری علم البیان بن جاتی ہے اور جب دونوں باہر نکلتے ہیں تو دونوں کی جبیں تند، لب بھنچے ہوئے اور آنکھوں میں معلّم اخلاق کے عتاب کی سرخی ہوتی ہے۔

نابغہ الہام ہے، القاء ہے، انکشاف ہے، علامت کا بروز ہے۔ شاعرانہ ٹائپ کی بحث میں یونگ نے بتایا ہے کہ شاعر، پیغمبر اور ہیرو کی قوت کا سرچشمہ اس کا لاشعور ہے۔ یونگ کہتا ہے کہ عقل تمام حالات میں استدلال اور منطقی طریقوں سے مسائل کے حل تلاش کرتی ہے جو بالکل فطری ہے۔ لیکن مہتم بالشان، فیصلہ کن اور غیر معمولی معاملات میں عقل ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ عقل امیج اور علامت تخلیق نہیں کر سکتی، کیونکہ علامت غیر عقلی ہوتی ہے، اور اس کا سرچشمہ لاشعور ہوتا ہے۔ جب عقل اپنی آخری حد کو پہنچ جاتی ہے اور اسے کوئی حل نظر نہیں آتا تو حل وہاں پر ملتا ہے جہاں ملنے کی امید سب سے کم ہوتی ہے۔ الہام جہل کے اندھیروں میں کوندے کی وہ لپک ہے جو ہمیں وہاں راستہ بتاتی ہے جہاں پہلے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اور ان گوشوں کو روشن کرتی ہے جو چشمِ ظاہر بین سے اب تک مخفی تھے۔ کوندے کی اس لپک میں بیک وقت علم، تحیّر اور مسرت کا گنج گراں مایہ ہوتا ہے۔ یہی نابغہ کی طاقت ہے اور اس طاقت کے سامنے ہم سب بے دست و پا ہیں۔ واعظ، خطیب اور مدرس پیغمبر اور شاعر سے نچلے درجہ کے لوگ ہیں۔ وہ تلقین تعلیم اور ترغیب سے کام لیتے ہیں۔ آپ فصاحت اور بلاغت کے دریا بہایئے لیکن وہ آدمی جو قائل، راغب اور رضا مند ہونے کو تیار نہیں تو دریائے بلاغت محض پانی کا جھاگ ہے۔ رضا مندی کا تعلق ہماری ذات سے ہے اور ذات کے آہنی حصاروں پر لفظوں کی گولا باری سے شگاف پڑ سکتے ہیں، راستے پیدا نہیں ہوتے۔ اسی لیے تبلیغ اور پروپیگنڈا وہیں کامیاب ہوتا ہے جہاں آدمی کا شعورِ ذات اور احساسِ انفرادیت کمزور ہوتا ہے۔ فنکار خطیب ولسان کی طرح فصاحت اور بلاغت کے دریا نہیں بہاتا بلکہ جیتے جاگتے تجربہ کا ایک ایسا طلسم تخلیق کرتا ہے جس سے گزرنے کے بعد آپ وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے۔ یہ ذات کے حصار پر باہر سے گولا باری نہیں، بلکہ حصار کے اندر معنی خیز اور ہوش ربا تجربہ کا ایسا بیج بونا ہے جو آہستہ آہستہ بڑھ کر ایک تناور درخت بنتا ہے۔

خدا کی مملکت کی مانند آرٹ کی جادوگری میں بھی وہی شخص داخل ہو سکتا ہے جس کا ذہن ایک بچہ کے ذہن کی مانند معصوم ہو۔ مطلب بچکانہ ذہن سے نہیں بلکہ بقول یونگ کے ایک ایسے ذہن سے ہے جو تعصّبات اور آراء سے پاک ہو، جو عارضی طور پر ذہن کی غیر یقینی کو معلق کر سکے، جو پُراسرار کی سریت کو بوکھلائے بغیر حیرت زدگی سے دیکھ سکے، اور طشتری کو فاختہ لفظ کو رنگ اور رنگ کو آواز بنتے دیکھے تو شوق و انبساط سے کھِل کھلا اٹھے۔ رسکن نے بتایا ہے کہ علم، اعتقاد، فیاضی اور بشاشت بچہ کی بنیادی صفات ہیں۔ قاری ہر بڑے فنکار کے سامنے منکسر المزاج ہوتا ہے۔ ہمالہ، تاج، شیکسپیئر اور غالبؔ کے سامنے فرد کے پندار کی قیمت کیا ہے حسن کے حضور ہر قسم کا پوز اور اتراہٹ سوقیانہ پن ہے۔ یہ نیاز مند پُرشوق انگلیاں ہوتی ہیں جو جلوۂ حسن کو بے نقاب کرتی ہیں۔ شیکسپیئر کو آدمی جب پڑھتا ہے تو ایک اداکار کی مانند اپنی ذات کو اس کے رنگا رنگ کرداروں میں فنا کر دیتا ہے۔ بھلا غالبؔ کے نغمے پُرنخوت پتلے لبوں پر کیسے تھرک سکتے ہیں۔ بچہ کو دیکھئے کس سہجتا سے مختلف رول ادا کرتا ہے۔ اور بچہ اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتا جب تک وہ کھیل کے روپ میں اس کے سامنے نہ آئے۔ کل کیا ہوگا اس کی فکر کیے بغیر آج جو کچھ ہو رہا ہے اس میں وہ مگن ہوتا ہے۔ وہ مقطع صورت جو کندھوں پر انسانیت کا بارِ امانت اٹھائے پھرتے ہیں، شہر کے قاضی اور گاؤں کے چھودھری کے مانند کل کی فکر میں دُبلے ہوتے جا رہے ہیں، سماجی انجینئر کی مانند دنیا کو بدلنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں، وہ اس بشاشت سے محروم ہوتے ہیں جو جادوگری کی سیر کے لیے ضروری ہے ایسے لوگوں کے سامنے تو آدمی ناول اور افسانے پڑھتے ہوئے بھی شرماتا ہے اور خود کو چنڈو خانہ کا افیمی محسوس کرتا ہے۔۔۔ بیمار، لذت پسند، انحطاط کا مارا گندے کمبل کے تلے گندے کام کرنے والا بدعادت یرقانی۔ ایسے لوگوں سے مصافحہ کرنے کی ہمت بھی اسی وقت ہوتی ہے جب بغل میں تعمیرِ ملّت کی کوئی دبیز کتاب دبی ہو۔ سچ بات تو یہ ہے کہ لیڈروں اور صحافیوں نے پیغمبروں اور شاعروں کا دور ہی ختم کر دیا۔ لدگئے وہ زمانے جب آدمی بچوں کی سی معصومیت اور بشاشت سے پیغمبر کا پیرو اور شاعر کا پرستار بنتا تھا۔ اب پیروی اور پرستاری پی ایچ ڈی میں بدل گئی ہے۔ جسے دیکھو کان پر قلم اور ہاتھ میں فیتہ لیے جادوگری کا طول و عرض ناپتا ہے اور تھرمامیٹر نکال کر عصری آگہی کا درجۂ حرارت دیکھتا ہے۔ ادب اب ایک پیشہ ہے، کیریر ہے، کام ہے، زیور آرائش ہے، شریفانہ مشغلہ ہے، تمام مسائل کا حل ہے۔ تمام سوالات کا جواب ہے وِٹ گنسٹائن نے دلچسپ بات کہی ہے کہ تمام مسائل کا حل تلاش کرنا فلسفیوں کی پیشہ ورانہ بیماری ہے۔ ادیب بھی جب فلسفی بنتا ہے تو اس بیماری سے بچ نہیں سکتا۔ حالانکہ ادب کی امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ حل تلاش کیے بغیر بھی وہ مسئلہ سے آنکھیں چار کر سکتا ہے سوال کا جواب دینے میں نہیں بلکہ سوال کی سل کو ذہن کی دہلیز پر نصب کرنے میں اس کی طاقت کا راز ہے۔ الجھانے اور سلجھانے کی سطح سے بلند ہو کر ایک ایسے تجربہ کی تخلیق جو فی نفسہٖ مکمل، اطمینان بخش بصیرت افروز اور مسرت انگیز ہوتا ہے ادب کا وہ کام ہے جو بلا شرکت غیرے وہ کرتا رہا ہے۔ ادب تفریحی عنصر کا حامل ہوتا ہے لیکن تفریحی ادب تخلیقِ حسن کی طاقت سے محروم ہوتا ہے اسی لیے جو تجربہ وہ بیان کرتا ہے وہ نامکمل اور غیر اطمینان بخش ہوتا ہے چٹخارہ کام و دہن کو مشتعل کرتا ہے لیکن تسکین نہیں بخشتا۔ سُراغ رسانی کا قصہ ادبی ناول سے زیادہ نشہ آور ہوتا ہے لیکن پختگی کو پہنچا ہوا مذاقِ سلیم صناعی اور فنکاری کے فرق کو پہچانتا ہے، اور جانتا ہے کہ وہ ادب جس میں تخلیقی تخیل کا استعمال اپنی شدید ترین شکل میں ہوتا ہے اور جو نازک اور لطیف جذباتی پیچیدگیوں کے منظر نامے کو بے نقاب کرتا ہے وہ اس ادب سے افضل ہے جس میں تخیل کا استعمال صرف تحیر خیزی اور سنسنی خیزی کے لیے ہوتا ہے۔

آج کل تو ترقی کوشی کا یہ عالم ہے کہ ادھر کتاب پریس میں جاتی ہے ادھر ادیب پاسپورٹ آفس میں۔ نہ جانے کب آفروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں جانا پڑے یا پتہ نہیں کون سے تہذیبی وفد میں شامل کیا جائے تیاری شرط ہے۔ اہلِ ایمان کی نظر ہمیشہ عقبیٰ پر رہتی ہے اس لیے کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے حور و قصور کا معاملہ کھٹائی میں پڑے۔ میراجی نے ''لب جوئبارے'' لکھ کر آغازِ کار ہی میں اپنے مقدر کا فیصلہ کر لیا۔ انعام و اکرام اکاڈمی اور راج بھون سب کے دروازے بند۔ مجتہد کا کام مہارشیوں کو خوش کرنا نہیں بلکہ ایک نیا فنی شعور پیدا کرنا ہوتا ہے۔ وہ ناکام بھی ہو تو ایک تنہا ٹوٹتے ستارے کا منفرد حسن رکھتا ہے۔ سناب کامیاب بھی ہو جائے تو اس کا مقام اسٹیبلشمنٹ کی صفِ نعلین میں ہوتا ہے کیونکہ مہارشیوں کو خوش کرنے کے لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بہتر وہ لکھ چکے ہیں۔ وہ نورچشم جو بزرگوں کا منظورِ نظر بننا چاہتا ہے جوانی ہی میں بزرگانہ باتیں کرتا ہے اور قبل از وقت بوڑھا ہو جاتا ہے۔ مسمار حویلی کے ورثہ پر جو نظریں جمائے رہتے ہیں وہ داداجان کی اجازت کے بغیر بیت الخلاء تک نہیں جاتے۔ وہ لوگ جو اپنی دنیا آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ میراجی اور منٹو کی طرح پہلے ہی سے کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ کی خوشنودی ان پر حرام ہو جاتی ہے۔ فن نہ اب جلبِ منفعت کا ذریعہ رہتا ہے نہ سماجی وقار و منزلت کا۔ انھیں پالتو بنانے کی سماج کی تمام امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ورنہ سماج تو آپ جانتے ہی ہیں چاہتا ہے کہ دیوتا صفت فنکار شریف النفس لوگوں کے جذبات کی کنگھی کرتا رہے۔ ایسی مفید اور صحت مند شاعری اور بادلیئر بائرن اور گنز برگ کی ابلیسی افکار کی شاعری میں وہی فرق ہے جو فوجی بینڈ اور بیتھوون کی سمفنی میں ہے۔ باجا تو دونوں بجاتے ہیں لیکن ایک اس آدمی کے لیے جو اپنی ذات کو پریڈ، پکچٹ جلوس اور قومی میلوں کی بھیڑ میں گم کرتا ہے اور دوسرا اس کے لیے جو سنگیت کی لہروں پر ذات کی بے کرانیوں کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔

میری مکارتھی نے مادام بواری پر جو معرکتہ الآراء مضمون لکھا ہے اس میں اس نے بتایا ہے کہ یہ ایما نہیں جو رومانی ہے۔ ایما تو ادب میں اس عورت کا اولین نمونہ ہے جسے ہمارا کمرشیل کلچر پیدار کرنے والا تھا۔ ناول کا رومانی کردار

تو ایما کا کڈھب، غیر دلچسپ بے رنگ اور بے زبان شوہر شارل بواری ہے۔ وہ پہلی بار ایما کے جوان حسن کو دیکھتا ہے تو سمجھ تک نہیں پاتا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ لیکن وہ حسن کے Mystique کو محسوس کرتا ہے۔ شادی کے بعد اپنے معمولی گھر میں وہ چاروں طرف بکھرے ہوئے ایما کے کپڑے، جوتے، جرابیں، کرؤشیئے اور سنگھار کے ساز و سامان سے جو ایک نازک اور لطیف نسائی فضا قائم ہوتی ہے اسے بھی وہ سمجھ نہیں پاتا لیکن غیر شعوری طور پر اس کے حسن کو وہ اپنی روح میں جذب کرتا رہتا ہے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت آرٹ کے حسن کی ہے۔ حسن کے حضور آدمی خاموش اور بے زبان ہو جاتا ہے۔ آرٹ کے اثر و نفوذ، اس کے جادو، ہمارے دل و دماغ پر اس کے طاقتور غلبہ، ہمارے جذبات پر اس کی حکمرانی کو ہم محسوس کرتے ہیں لیکن اس کا بیان نہیں کر سکتے۔ اس رفعت، سیرابی اور شادابی کا تخمینہ نہیں نکال سکتے جو آرٹ کے تجربہ سے گزر کر ہماری روح کو حاصل ہوتی ہے۔ جب ایسا کرنے بیٹھتے ہیں تو تجربہ کی رنگین اور پہلو دار دنیا سے نکل کر منطق، استدلال، تقسیم اور تجرید کی سرد لیبارٹری میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اُن سرگرمیوں پر ناک بھوؤں نہیں چڑھاتا لیکن محسوس کرتا ہوں کہ اُن کا ادب میں اس قدر غلبہ ہے کہ آدمی اعلیٰ ادب کے حسن سے لطف اندوز ہونے کی اپنی صلاحیت آہستہ آہستہ کھو رہا ہے۔ خشک، بے رنگ، صفر درجۂ حرارت والی ٹھُپ تنقیدوں کی راکھ کے نیچے تخلیقی ادب اس طرح بجھا پڑا ہے کہ ادیب کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے ان استادوں کے چہرے گھوم جاتے ہیں جن کی زیرِ نگرانی درجن بھر طلباء تحقیقی مقالے لکھتے ہیں، جو کتابیں پڑھاتے ہیں، کتابیں ایڈٹ کرتے ہیں، نصابی کتابیں مدوّن کرتے ہیں، کتابوں پر کتابیں لکھتے ہیں اور اپنی کتابوں پر اپنے ہی جیسے دوسرے اساتذہ سے تبصرے لکھواتے ہیں، اور کتاب کے لیے انعام اور اپنے لیے وظیفہ مقرر کرانے کے لیے ادب کی قومی اہمیت کا ایک نیا چکر شروع کرتے ہیں، کیونکہ حکومت اسی ادب کو سمجھتی ہے جو بینڈ باجے کی طرح بجتا ہے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ان اساتذہ کی پوری زندگی کتاب کے گرد و پیش، ادب کے محور پر گھومتی ہے لیکن ایک چیز جو وہ نہیں پڑھ پاتے وہ کتاب اور ادب ہی ہے۔ اُن کی تنقیدوں سے کبھی پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے زندہ ادب کے ساتھ زندہ رشتہ قائم کیا ہے۔ کتاب کو محض پڑھنے کی خاطر پڑھا ہے۔ ہر چیز سے تھک کر آکتا کر کسی فن پارے کی طرف اس طرح رجوع ہوئے ہیں گویا وہ تشنہ کام روح کا آخری ملجا و ماویٰ ہے۔ سلگتے صحرا میں جس کی پیاس ٹھنڈے پانی سے بجھی ہو، اس سے پوچھئے کہ پانی اس کے لیے کیا ہے۔ شاید وہ کچھ نہ بتا سکے۔ وہ بھلے کچھ نہ بتا سکے لیکن پانی کی تعریف میں کم از کم اس سے وہ زبان نہیں بولی جائے گی جو کٹورا بجاتا بہشتی اور واٹر ورکس کا میکینک بولتا ہے۔ ہمارے اساتذہ شعروں کی تعریف بھی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ماہی گیر مچھلیوں کی تعریف کرتا ہے۔ تعریف پوری بھی ہونے نہیں پاتی کہ مچھلی ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔ چلو دوسری سہی۔ اہم چیز تعریفی کلمات ہیں ورنہ مچھلیاں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مکتبی تنقید کی سرد برفیلی سِل پر سینکڑوں اشعار مری ہوئی مچھلیوں کی طرح بساند مارتے نظر آئیں گے۔ لوگ چاہتے ہیں میں اس مچھلی بازار میں ایک دکان کھول لوں۔ مشغلہ کو پیشہ بناؤں اور پیشہ وروں کی زبان بولوں۔

لیکن ادب میرے لیے پیشہ نہیں، کام نہیں، کیریر نہیں، محض ایک ذہنی مشغلہ اور شوقِ فضول ہے، اور آڈن نے بتایا ہے کہ وہ چند چیزیں جن کے لیے آدمی اپنی جان کی بازی تک لگا دیتا ہے اُن میں اس کا شوقِ فضول بھی شامل ہے۔ مقصدیت اور افادیت ادب کے لیے ایک ایسا سائیبہ بوم ثابت ہوئی جس میں حقیقت نے اپنی معروضیت، تجربہ نے اپنی برجستگی اور تخیل نے اپنی اُڑان کھو دی۔ فنکار کے پاس وہ نظر نہ رہی جو شوریدہ سر جبلتوں کے گہرے پانیوں میں جھانکتی تھی، روح کے کرب، جسم کی پکار، ابدیت کی تمنا، لامحدودیت کی تڑپ، جہانِ آرزو کی حشر سامانی اور آگ بگولا جذبات کی قیامت خیزیوں کو سمجھتی تھی۔ ہم نے پیغمبر کی جگہ ملاّئے مکتب، مجاہد کی جگہ اکھاڑے کا استاد، کلیم کی جگہ خطیب اور مسیحا کی جگہ عطائی پیدا کیے۔ ایسی تمام باتیں کہ شاعری بلبل کا نالۂ بے اختیار ہے، موجِ دریا کی بے قراری ہے، ندی کا خرام ناز ہے، جنگل کی ہانپ، صحرا کا سناٹا، جواں لہو کی چنگاریوں کا سنگیت، بے بسی کے آنسو، گھایل روح کی لرزتی چیخ اور دل کے تاریک شگافوں سے پھوٹتا اداس نغمہ ہے۔۔۔ رومانیوں کی لن ترانیاں قرار پائیں۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ لکھ لوٹ کی جگہ اُن بساطیوں نے لے لی جن کے سروکار تھے روزانہ گھر خرچ کا حساب رکھنا، بڑھتے ہوئے بچوں کے کپڑے ڈھیلے سلوانا، جوتوں کے تلوؤں میں کیلیں ٹھکوانا، اور سبزی فروش سے مرچیں اور قصائی سے گردہ اینٹھنا۔ جہیز میں نکّو کی سات دکانوں کو لکھوانے والے اُن جذبات کو سمجھ بھی کیسے سکتے ہیں جو بوسوں پر سلطنتوں کو قربان کرتے ہیں۔

میں مفید ادب کو سب سے زیادہ غیر مفید اور بے ضرر تنقید کو سب سے زیادہ ضرر رساں سمجھتا ہوں۔ تنقید میرے لیے جوتیاں سیدھی کرنے کا نہیں بلکہ گریباں چاک کرنے کا کام ہے۔ وہ ادب جو ضرب نہیں لگاتا، وہ تنقید جو وار نہیں کرتی اس نازک اندام لونڈے کی مانند ہے جس سے لڑکیاں سہیلیوں کا سا سلوک کرتی ہیں۔ میں ادب کا آبلہ پا ہوں۔ اور شعلہ بکف مسائل پر لکھتا ہوں، اور مدرسہ کی ٹھٹھری نمناک فضاؤں سے نکل کر تخلیقی کرب کے اس جوالا مکھی میں جھانکتا ہوں جہاں فنکار کا احساس پگھلے ہوئے لاوے کی مانند کھولتا ہے۔ جب سورج سوا نیزے پر ہو، اور زمین آہن کی بھٹی کی مانند شعلے اگلتی ہو اور عقائد کی دیواریں موم کی طرح پگھلتی ہوں، اس وقت اردو ادب میں پیرڈوی'' اور اردو میں خطوط نگاری'' اور میر انیس کی جذبات نگاری جیسے مضامین چھوتے ہوئے بدن میں سرد پھریریاں آنے لگتی ہیں۔ میں ادب کو نواب کا دربار، اولیاء اللہ کا مزار، سماج سیوک کا آشرم اور کمشنر کا دفتر نہیں سمجھتا۔ ادب میرے لیے وہ وادیٔ خیال ہے جو سر پھروں، بد دماغوں، غم زدوں اور جگر فگاروں کی تتانا ہو سے گونجتی ہے جہاں خوبصورت الفاظ کی تتلیاں پھدکتی ہیں،

استعاروں کی دھنک رنگ بکھیرتی ہے اور علامات کے ستاروں کے کنول ٹوٹتے ہیں۔ ادب بانگی کی بانگ نہیں بلکہ شب زندہ دار کا نعرۂ مستانہ اور آہِ نیم شبی ہے۔ یہ مخطوطات کی بارہ دری میں مدرس کی چہل قدمی نہیں بلکہ اس بگولہ صفت کی آوارہ خرامی ہے جو ہزار فریب شکنی کے باوجود جلتی ریت کی لہروں کو موجِ آب سمجھتا ہے اور تشکیک کے کانٹوں سے پاؤں کے چھالے پھوڑتا ہے۔ کٹھ ملاّ کے کٹھل عقائد پر میں اس درویش کی تشکیک کو ترجیح دیتا ہوں جو روح کی اندھیری راتوں کے ہولناک مقامات سے گزرتا ہے۔ میں اس فنکار کی جستجو کی تڑپ جانتا ہوں۔ جو لاشعور کے گھنے جنگلوں میں اس علامت اور اسطور کا متلاشی ہے جو سانپ کے من کی مانند پُرنور اور پُراسرار ہے اور جو تفسیر بنتا ہے اس تہذیبی اور تمدنی انتشار کی جس سے فنکار کا دور عبارت ہے۔ مجھے خوف آتا ہے ان فقیہوں سے جن کے تقشّف کا یہ عالم ہے کہ اسکیمو کو پانی سے وضو کراتے ہیں اور جنھوں نے تنقید میں صحت مند ادب کے حمام کھول رکھے ہیں۔ تاکہ مجذوب پاک صاف بنے، کلمۂ کفر سے احتراز کرے اور عقائد صحیحہ پر عمل پیرا ہو۔ عرفان کو شرع کا، اور ادب کو عقائد کا پابند بنا کر ہم نے کیا پایا؟۔۔۔ راست بازوں کا وہ پندار کہ لکنت زدہ بھی عقائد راسخہ کی آستاں بوسی کر کے خود کو گوہر ریز و گوہر بار سمجھنے لگا۔ میں ڈرتا ہوں ان مدرّسوں سے جنھوں نے ادب کو بھوگنے کی بجائے بھگتنے، کارشیریں کی بجائے کارِ خیر، روح کی پرواز کی بجائے ذہن کی ورزش بنا کر رکھ دیا۔ جو چاک گریباں اور چاک داماں تھا، رسواسِر بازار اور بے ننگ و نام نہ تھا، ناصح سے گریزاں اور محتسب سے پریشاں تھا، وہ جسے ایک بے نام خلش، ایک بے چین تجسس، ایک مسلسل اضطراب گلی گلی غبارِ ناتواں کی صورت لیے پھرتا تھا، ریاست اور سرکار کا صیدِ زبوں، بزرگوں کی خوشنودی کا تمنائی اور قبولیت عامہ کا طلبگار بنا، اپنی ذات، اپنے فن اور اپنے زمانہ سے سچائی سے پیش آنے کی بجائے سنابری اور فیشن پرستی کو راہ دی، اور عقائد کو سرمایہ افتخار اور تمغۂ دِلاوری سمجھا۔ بچہ کی حیرانی، درویش کی سادگی، جادو گر کی طلسم آفرینی، پیکن کی رنگینی، پیغمبر کا القا، تخیل کی نزاکت اور فکر کی صلابت، اور جذبہ کی برجستگی کی قیمت پر اس نے معلم اخلاق کی خشک بیانی، رہبر قوم کی اشتعال انگیزی اور سوشل انجینئر کی منصوبہ بندی کو اپنایا۔ ملک و قوم و ملت کی باتیں تو چوراہے کا ہر آدمی کرتا ہے۔ کہاں ہے وہ فنکار جس کی گرمی اندیشہ سے صحرا جلتے ہیں اور گنجینۂ بازِ خیال محفلیں برہم کرتا ہے۔ منبر کی سیڑھیاں تو ہر خطیب چڑھ سکتا ہے لیکن وجود کے پہاڑ کی آخری چٹان پر پہنچنا اس طرف زندگی کے المیہ طربیہ کی دھوپ چھاؤں اور اُس طرف عدم کے بے کراں خلاؤں کی ہیبت کا نظارہ کرنا، اور گھبرائے اور چکرائے بغیر، اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے، اس تجربہ کو سرمدی نغموں میں بدل دینا بڑے صاحب بصیرت لوگوں کا کام ہے۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ بجلی اور جوہری توانائی کی طاقت انسان کو کائناتِ عظمیٰ کا سیاح بنا سکتی ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تخلیقی تخیل کی طاقت نے جس طرح آدمی کے اندرون کو منور کیا ہے اور باطنی زندگی کی عجیب و غریب دنیاؤں کی سیر کرائی ہے وہ نہ بجلی کی طاقت سے ممکن ہے نہ جوہری توانائی سے میں سائنس داں اور سوشل انجینئر کے کام کی قدر کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ اپنے کام میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوں اور انسانی مسرت اور آسائش میں اضافہ کریں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ فنکار کو بھی اپنا کام کرنے دیں تاکہ وہ بتاتا رہے کہ جو دنیا انھوں نے بنائی ہے اس میں آدمی کے جینے کا تجربہ کیا ہے۔ مجھے سیاست پسند نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ سیاست سے مفر ممکن نہیں۔ میں ادب میں بہترین سے کم پر سمجھوتہ نہیں کرتا کیونکہ ادب میں بہترین کی اتنی افراط ہے کہ کمتر پر قناعت تنگ ظرفی ہے۔ لیکن سیاست میں، میں بد کو بدتر پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ سیاست اپنی فطرت ہی میں بہترین کی گنجائش نہیں رکھتی۔ سیاست میں، میں اُن لوگوں کے ساتھ جینے پر مجبور ہوں جو سوہانِ روح اور عذابِ جاں ہیں۔ لیکن ادب میں، میں اُن لوگوں کے ساتھ جیتا ہوں جو راحتِ جاں اور جگر لخت کا درماں ہیں۔ میں اپنے ووٹ کو قیمتی سمجھتا ہوں اور اخبار بینی کی اہمیت سے واقف ہوں لیکن میرے لیے وہ لمحہ بہت اہم ہے جسے غم روزگار اور بہر جمع خس و خاشاک کی تگ و دو سے بچا لایا ہوں۔ اور اسے میں وقف کرتا ہوں اس طلسمِ حیرت کی سیاست میں جو فنکارانہ تخیل صفحۂ قرطاس پر تخلیق کرتا ہے۔ سیاسی آئیڈیلزم روز بروز کے پتھراؤ سے چکنا چور ہوتا رہتا ہے اور خوش نصیب ہے وہ آدمی جو اس سنگ باری میں اپنے آدرش کو سالم بچا لے جائے اور میں جانتا ہوں کہ میں اُن خوش نصیبوں میں سے نہیں ہوں۔ میں فنکارانہ تخیل کو فن کی دھندلی فضاؤں میں پھلتا پھولتا دیکھنا پسند کرتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ سیاسی منطق کی چلچلاتی دھوپ میں فنکار کے خیالات کی کھال کے جھلسنے کا تماشا دیکھوں۔ مجھے اس فنکار پر ہنسنا نہیں آتا جو شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپاتا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جنہوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں انھوں نے سوائے ریت کی آندھیوں کے کچھ نہیں دیکھا۔ وہ جو سیاست کا فریب خوردہ ہے اس کے چہرے پر میں کالک اس لیے نہیں ملتا کہ خود میرے ہاتھ شیشۂ فریب کی ٹوٹی کرچیوں سے لہولہان ہیں۔ ادب کا زندگی سے وہ تعلق نہیں جو سیاست کا ہے۔ خراب نظم زیادہ سے زیادہ ذہنی کدورت پیدا کرتی ہے لیکن خراب سیاست تو گیس چیمبر کے دھوئیں سے تاریخِ انسانیت کو سیاہ کار بناتی ہے۔ اسی لیے میں سیاسی پیمانوں سے ادب کو پرکھنے کی بدعت کو اپنے وقت کی سب سے بڑی لعنت سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ شاعر اور فنکار کو عوام کی عدالت میں کھڑا کر کے عقل و منطق کی تیز روشنی میں اسے اپنے سیاسی موقف کی وضاحت پر مجبور کیا جائے۔ میں فنکار کے غلط سیاسی رویوں پر کبیدہ خاطر ہوتا ہوں لیکن کف دروہاں نہیں ہوتا کیونکہ مجھے اپنے رویوں کے درست ہونے کا یقین نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وقت کی جھولی میں ایسے پتھروں کی کمی نہیں جو جامِ یقین کو پاش پاش کرتے ہیں اور اچھے اچھوں کا بھرم توڑ دیتے ہیں۔ فاشزم کے جہنم زار سے گزرنے کے بعد نوبل انعام یافتہ اطالوی شاعر مونتالے نے اپنے شعر میں کہا تھا:

''آج کل ہم تمہیں صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ ہم کیا نہیں ہیں اور کیا نہیں چاہتے۔''

ہم چاہے مستقبل کے رنگین خواب نہ بن سکیں لیکن اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں دوبارہ اس کابوس سے گزرنا قبول نہیں جس سے ہمارا ماضی عبارت ہے۔

براہِ راست

چہارسو کا ہر ’’قرطاسِ اعزاز‘‘ ہمارے دل میں شوق کا اک نیا دریچہ کھول دیتا ہے۔ زیرِ نظر ’’قرطاسِ اعزاز‘‘ اس قدر پُر لطف و پر کیف ہے کہ دل و دماغ میں اشتیاق و انبساط کے بے شمار دریچے وا ہو گئے ہیں۔ مقامِ مسرت کہ ہمارے عصر کے بہت ہی نامور، بلند قامت اور قابل احترام پروفیسر **وارث علوی** صاحب نے پیرانہ سالی اور روز بہ روز گرتی صحت کے عالم میں اس اشاعتِ خاص کے لیے جس قدر تعاون، شفقت اور رہنمائی فرمائی اُس کے بعد وہ تمام الفاظ، معنیٰ و مفہوم سے معذور ہو گئے جن کے ذریعہ اظہارِ ممنونیت کیا جاتا ہے۔ البتہ! اس خصوصی اشاعت میں محترمہ پروین شیر، جناب شاہ فیصل اور بھائی نند کشور وکرم ہر طرح کے اظہار ممنونیت کے حقدار اس لئے ٹھہرتے ہیں کہ اُن کے تحرک، تعاون اور تدبر کے بغیر یہ خوبصورت علمی، ادبی کوہِ گراں سر کرنا ہمارے لیے قطعی ممکن نہ تھا!!!

گلزار جاوید

☆ آپ کی اجازت کے ساتھ گفتگو کی ابتداء خاندانی پس منظر سے کرنا چاہیں گے؟

☆☆ خاندانی پس منظر یہ ہے کہ میرے والد سید حسینی پیر طریقت تھے۔ اردو فارسی عربی گجراتی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ خاندانی مخطوطات کو سنبھالا اور بڑی تحقیق کے بعد حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کے حالاتِ زندگی تذکرالوجیہ کے نام سے اشاعت پذیر کی۔ سال میں ایک مرتبہ مریدوں میں جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ نوجوان مرید مجھے گھیرے رہتے کیونکہ میں آزاد کی آب حیات سے کہانیاں سناتا اور شام کو ان کے ساتھ باغ میں جا کر ہری گھاس پر بیٹھتے اور میں فلموں کی کہانیاں سناتا۔ ابّا کے بعد میں نے پیری مریدی کا سلسلہ تو نہیں رکھا لیکن والد صاحب کا اثر لیتا گیا تھا کہ لوگ اب بھی آتے ہیں۔ میں خوش دلی سے ملتا ہوں۔ میری صورتِ حال ایسبرڈ ڈرامے کے اس ایکٹر کی ہو گئی ہے جس کا سٹیج کی setting سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے لیکن وہ اپنے مکالمے بولتے جا رہا ہے۔ یہ میری زندگی کا عجیب پیریڈوکس رہا ہے۔ نام ہے میرا بغاوت کام ہے میرا اطاعت۔ ہر دقیانوسی چیز کے خلاف بغاوت کی لیکن دقیانوسیوں کے ساتھ علیک سلیک بھی رہی۔

آخر میں صرف والدہ مرحومہ کا ذکر کر کے خاندانی کوائف کے اس تذکرے کو ختم کرونگا۔ نام حفیظ النساعرف ذبی بی بی تھا خدا نے انہیں ظرافت کا وہ مادہ دیا تا کہ جہاں سہلیوں کے بیچ بیٹھ گئیں ہنسی کے فوّارے بلند ہوتے اسی حس مزاح کے ورثہ نے راقم الحروف کی تنقید کو زعفران زار بنایا۔

☆ کچھ اپنے دوستوں، اساتذہ اور کتب کا تعارف کرائیے جن کے زیر اثر آپ کا مزاج علم و ادب کی جانب راغب ہوا؟

☆☆ میں اپنی ہائی سکول اور کالج کی زندگی تک گھر میں والد صاحب سے لے کر کالج کے تمام اردو فارسی کے اساتذہ اور ہم جماعت طالبِ علموں تک جس کا لگ بھگ ایم اے تک میرا ساتھ رہا محققین سے گھرا رہا۔ اتفاق سے والد صاحب کا ایک چھوٹا موٹا آپریشن صابرمتی ندی کے پل کے اس پار ایک بڑے اسپتال میں ہوا۔ مضافات کا یہ علاقہ میرے لئے ایک نئ دنیا تھا۔ خوبصورت عمارتیں، کشادہ سڑکیں، صاف ستھرے خوش پوش لوگ، میں شہر کے جس علاقہ سے آیا تھا وہ گلی کوچوں، مسجدوں، قبرستانوں، قصاب کی بکریوں مینگنیوں، چھیچھڑوں کھلے میں اجابت کے ڈھیروں اور ان کے وسط میں بیٹھے بیڑیاں پیتے مدقوق مہتروں اور مہترانیوں کا نہایت ہی غلیظ بدبودار علاقہ تھا۔ جس اسپتال میں والد صاحب کا آپریشن ہوا تھا اس کے سامنے ایک نہایت ہی دلکش عمارت رنگ بہ رنگ کے پھولوں سے جنتِ نظارہ بنی ہوئی کھڑی تھی۔ اس پر گجراتی حروف میں کندہ تھا۔ سیٹھ مانگ لال جیٹھالال لائبریری۔

میں نے لائبریری کے اندر قدم کیا رکھا کہ ایک طلسماتی دنیا نظروں کے سامنے آئی۔ وہ بڑے سے ہال میں دیوارں سے چسپاں اخبارات پڑھتے ہوئے لوگ۔ وہ میزوں پر کھلے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور اندر سینکڑوں شیلف پر سجی ہوئی کتابیں۔ یکا یک میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ سفید براّق کھادی میں ملبوس گورے رنگ اور سفید بالوں میں ایک من موہنی صورت والے شخص نے مجھ سے پوچھا۔ کہاں پڑھتے ہو۔ میں نے کہا انجمن اسلام ہائی سکول میں انہوں نے مجھے لائبریری فارم لا کر دیا۔ دوسرے روز لائبریری کے دو کارڈ میری جیب میں تھے۔ دنیا بھر کے ادب سے مالا مال الماریاں میرے لئے کھل جاتیں۔ اس لائبریری نے میرے لئے کالج کے اساتذہ کی جگہ لے لی ورنہ محققین کی صحبت کے زیر اثر کسی کاظم علی خان یا کسی ناظم علی خان پر ایک مقالہ لکھ کر خوش ہو لیتا اور دنیا کے کتنے تخلیلی کارنامے میری نظروں سے اوجھل رہتے۔

☆ آپ پر پہلی بار کب اور کس طور آشکار ہوا کہ آپ کے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے؟

☆☆ یہ احساس کسی خاص مضمون سے پیدا نہیں ہوا لیکن مختلف اوقات میں قلم اس طرح چل نکلتا کہ میں جملے کو اس گیند کی مانند دیکھتا جو باؤنڈری کراس کرنے والی ہے اور ایک عجیب خوشی اور خود اعتمادی کے ساتھ دوسری گیند پھٹکارنے کیلئے قلم کاغذ پر رکھتا۔ کسی ایسے ہی لمحہ میں میں نے نقّاد بننے کا فیصلہ کیا ہوگا۔

☆ بے پناہ علمی، ادبی صلاحیتوں کے باوجود تخلیق کے بجائے تنقید کا

انتخاب کس جذبے کے زیراثر کیا؟

بے پناہ علمی اورادبی صلاحیتوں اپنے لئے ایسے بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال دیکھ کرخوشی ہوئی۔لیکن یہ الفاظ اتفاق سے زورِ بازو کوظاہر کرتے ہیں اور اپنے یہاں شاعری نیز دیگر تخلیقی کاموں کیلئے ایک ضرب المثل ہے۔

ایں سعادت زورِ بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

☆ دیگر اصنافِ ادب کی نسبت اردو افسانہ آپ کی توجہ کا زیادہ حق دار کیوں ٹھہرا؟

☆☆ اس لئے کہ افسانہ اورناول پڑھنے کا شوق تھا۔اس میں آرٹ کے ساتھ ساتھ زندگی اور معاشرے کے مسائل پر بھی گفتگو ہوسکتی تھی ناول کو دورِ جدید کی فلسفیانہ سرگرمی کہا گیا ہے۔دورِ جدید کو شاعری کا نہیں ناول کا ہی عہد کہا گیا ہے۔دوسری بات یہ کہ انگریزی کے سبب دنیا کی تمام زبانوں کے بہترین ناولوں سے آپ واقف ہوسکتے ہیں۔مطالعہ کا اتنا بڑا سرمایہ کسی اور صنف میں نہیں مل سکتا۔اورادب کے مطالعے میں شخص اور شوقیہ ترجیحات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔

میں انگریزی ادب کا استادرہا ہوں۔ادب کے نظریات ارسطو سے لیکرایلیٹ تک پڑھاتارہا ہوں لیکن کلاس روم نوٹس کو میں نے مضامین میں تبدیل نہیں کیا۔البتہ ادب کے ان تصورات جن پر ہمارے یہاں گفتگو ہوتی رہی ہے مثلاً آئیڈیولوجی کا مسئلہ،کمٹ منٹ کا مسئلہ پروپیگنڈے کا مسئلہ وغیرہ پر دل کھول کر لکھا ہے۔

☆ آپ کے ہاں نظریاتی مضامین کے سلسلے کا آغاز کب اورکس طور ہوااوراس کے نتائج کیا رہے نیز اُس نظریہ کی تفصیل ضرور بتلایئے جس کی ترسیل وتبلیغ کے لیے آپ کو مضامین کی جانب رجوع ہونا پڑا؟

☆☆ میرے بہت سے نظریاتی مضامین ، بے شمار شاعروں اور افسانہ نگاروں پر مضامین،منٹو اور بیدی پر میری کتابیں سب نہایت سنجیدہ اور پروقار اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔لیکن میرے چٹخارے دار اسلوب کے رسیا انہیں پڑھ کر کہا کرتے کہ یہ تمہارے مخصوص اسلوب میں نہیں۔میرے یہاں اسالیب کا تنوع ہے اور میں نے کسی ایک اسلوب کو اپنی پہچان نہیں بنایا۔

☆ اردو افسانے پر اپنے کام کو آپ ردِعمل گردانتے ہیں مثلاً کس چیز اور شخص کے ردِعمل میں آپ نے افسانہ پر تنقیدی کام کیا اور آپ کے پیشِ نظر کیا چیز زیادہ اہم تھی۔

☆☆ گلزارمیاں!سچی بات یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال میری سمجھ سے بالا ہے۔

☆ آپ کے تنقیدی اسلوب کو طنزیہ،مزاحیہ اور شوخ کہنے والے کیا کچھ کہنے کی کوشش کررہے ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس قسم کی رائے دینے والے ادب میں کس مقام کے حامل ہیں لہٰذا میں جو کہنا چاہتا تھا بین السطور کہہ دیا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

☆ آپ کو فکشن کا باوا آدم کن معنوں میں گردانا جاتا ہے؟

☆☆ یہ تو میں بھی نہیں جانتا اور مجھے تو کسی بھی شعبہ کا باوا آدم بننے کے بجائے گلشن کا گلچیں بننا پسند ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ پر ادبی تنقید کا ڈکٹیٹر ہونے کا الزام کیوں لگاتے ہیں؟

☆☆ کیا کبھی آپ نے اتنا ہنس مکھ، ہنسے ہنسانے والا زندہ دل ڈکٹیٹر کہیں دیکھا ہے جتنا میری اپنی تحریروں سے لوگ محظوظ ہوئے ہیں اس کی مثال ذرا کم کم ہی ملے گی۔

☆ وہ کون لوگ اور طبقہ ہے جو آپ کے خلاف رسائل اور جرائد میں جھوٹے الزامات پر مبنی خطوط شائع کراتا ہے اوران کے مقاصد کیا ہیں؟

☆☆ جاوید میاں!ہم تو آپ کو بہت سمجھ دار آدمی سمجھتے تھے آپ بھی ان گپ گولوں کے چکر میں پڑ گئے۔

☆ آج کی نشست میں اُن زیادتیوں کی نشان دہی کیجیے جو اردو والوں نے آپ کے ساتھ روا رکھیں اور اُن کا جواز آپ کے خیال میں کیا تھا؟

☆☆ میری ذات کا جہاں تک تعلق ہے تو میں دوسروں کی زیادتیوں کی نسبت اپنی کوتاہیوں پر زیادہ نظر رکھتا ہوں۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ تنقید اور تعریف کے بیان میں اس قدر جذباتی ہوجاتے ہیں کہ توازن برقرار نہیں رہ پاتا خاص کر جوش،فراق اور راشد کی حمایت میں یہ امر زیادہ دکھلائی دیتا ہے اور تو اور آپ نے ندا فاضلی کو فراق اور اقبال کے ہم پلہ قرار دے ڈالا؟

☆☆ اقبال،فراق اور ندا فاضلی کی والدہ کے موضوع پر نظموں کا ذکر ہوا ہے۔تینوں نظموں کا تقابلی مطالعہ بھی نہیں۔شاعروں کا تقابل بھی نہیں۔اقبال کی نظم فلسفہ سے بوجھل ہوگئی ہے۔اس کا اعتراف دوسرے نقادوں نے بھی کیا ہے اور ندا فاضلی یا کسی بھی نئے شاعر کی طرف ایسی حقارت کا رویہ کیوں۔آپ ذرا اس بات کو بھی دھیان میں رکھیے کہ اپنی تنقیدوں میں میں نقادوں کو جکڑتا ہوں۔لیکن فنکاروں کی طرف میرا رویہ ہمیشہ ہمدردانہ اور حوصلہ افزا ہوتا ہے۔ناقدانہ رویوں کی بہت سی نزاکتوں کو آپ ابھی سمجھ نہیں پاتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کے ہاں صنفِ نازک کے لیے نرم گوشے کی نشان دہی کرتے ہوئے بہت سی غیر اہم تخلیق کاروں کی مدح سرائی کا الزام بھی لگاتے ہیں؟

☆☆ لالی چودھری امریکہ میں ہیں۔ان کی تو میں نے تصویر بھی نہیں دیکھی ظاہر ہوا کہ میں کتابیں دیکھ کر لکھتا ہوں۔چہرے دیکھ کر نہیں۔

☆ آپ کے بات کہنے کا فن جس قدر دلکش دلنشین ہوتا ہے اُسی قدر

طویل کیوں ہوا کرتا ہے؟

☆☆ چونکہ دل کش اور دل نشین ہوتا ہے۔

☆ اس خیال میں کس حد تک صداقت ہے کہ اردو ادب نے جس قد کاٹھ کے افسانہ نگار پیدا کیے اُس معیار کے قدآور ناقدین نہ مل سکے؟

☆☆ یہ حقیقت ہے کہ ہم افسانہ کے ایسے ناقدین پیدا نہیں کر سکے جو ہمارے نامور افسانہ نگاروں کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ اوّل تو فکشن کو موضوع بنانے والے نقاد ہی انگلیوں پر گنے جا سکیں اتنے بھی پیدا نہیں ہوئے اور جو ہوئے ان کے رویے اور راہیں بھی متنازعہ رہیں۔ دراصل ہمارے بیشتر مصنفوں کے ذہن شاعری اور مذہب کے اثرات کے تحت پروان چڑھتے تھے، نثر اور فلسفہ کے ڈھالے ہوئے نہیں تھے۔

☆ آپ کے خیال میں جدید افسانہ نگار کس قسم کی دھوکہ دہی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مناسب خیال فرمائیں تو چند اہم نام ضرور گنوائیے؟

☆☆ دیکھئے وقت گذرنے کے ساتھ بہت سے شعلہ بکف مسائل ختم ہو جاتے ہیں، معاصرانہ چشمکیں دم توڑ دیتی ہیں اور ادبی لڑائیاں اپنی دلچسپی کھو دیتی ہیں، انہیں دہرانا ایک مرے ہوئے گھوڑے کو چابک مارنا ہے۔ پھر آپ کا یہ تقاضہ کہ کچھ نام بھی دیے جائیں بہت نازیبا ہے۔

☆ تاریخی ناول سے آپ کی عدم دلچسپی کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ تاریخی ناول تھوڑے بہت شباب کے زمانہ میں پڑھے ہیں لیکن ان میں بہت دلچسپی نہیں رہی۔ ناول کی بہت سی قسمیں ہیں۔ لیکن ناول کا میرا مطالعہ شروع سے لیکر آج تک مرکزی روایت کے ناولوں کا رہا ہے جن کا تعلق عموماً انسانی مقدر انسانی اخلاقیات سماجیات اور نفسیات سے رہا ہے۔

☆ وہ گھپلے اور دھاندلیاں کس قسم کی تھیں جو آپ کے بقول ترقی پسندوں کے سرخیل کرتے رہے؟

☆☆ آپ ایسے سوال نہ پوچھئے جن کے جواب طویل مضامین کی صورت میں دیے جاتے ہیں۔

☆ ادب کی جگہ آئیڈیا لوجی کو اہمیت دینے کے اسباب وعلل اور نقصانات کی بابت آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ یہ سوال بھی ایسا ہی ہے جس کے جواب میں مجھے کم از کم میرے ہی نصف درجن مضامین کا خلاصہ بیان کرنا پڑیگا۔ مختصراً یہ ہے کہ میں ادب کو آئیڈیولوجی کی زنجیریں پہنانا پسند نہیں کرتا۔

☆ ہیئت پسندوں کی چودھراہٹ ماننے سے انکار والی بات وضاحت طلب ہے؟

☆☆ جس مضمون سے آپ نے یہ سوال پیدا کیا ہے اس میں ہیئت پسندوں کی چودھراہٹ کا ذکر ہوگا۔ اب سیاق وسباق یاد نہیں۔ لیکن اتنی سی بات میں کہہ سکتا ہوں کہ ہیئت پسندوں کا یہ اصرار کہ صرف ہیئت یا زبان یا اسلوب ہی ادبی جمالیات کا تعین کرتا ہے۔ ان کی چودھراہٹ ہے۔ اس سے ادب کی سماجیات نفسیات اور اخلاقیات اب ثانوی بن جاتے ہیں۔ ہیئتی تنقید کے رواج پانے سے قبل ناول اور ڈرامے کی تنقیدیں انہیں قدروں کا چلن تھا۔ انہیں یک قلم شدرد کرنا چودھراہٹ ہے۔

☆ ترقی پسندی بطور فلاسفی اور اُسے Import کرنے کے اسباب کے علاوہ مستقبل میں اس کا انجام کیا نظر آتا ہے؟

☆☆ ایک نظر سے دیکھئے تو ادب میں ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی، لیکن وہ اپنے اثرات چھوڑ گئی۔ بائیں بازو کی فکر کو سرمایہ دارانہ نظام ختم نہیں کر سکا۔ اداروں کو وہ ختم کر سکتا ہے لیکن فکر کو نہیں۔ جو آج بھی پوری دنیا میں نوجوانوں کے ناولوں، ڈراموں، فلموں اور شعر ونغمہ میں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ جھلکیاں پھر کسی تحریک کی شکل اختیار کرینگی۔ ان مسائل پر گفتگو کرنے کیلئے بہت وقت چاہئے۔

☆ آپ کا شمار جدیدیت کے ناقدین میں کیا جاتا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار بلکہ اُس کے فروغ کا اہم ذریعہ تھیں؟

☆☆ کون سی چیز آج سرمایہ داری کا شاخسانہ ہے یا نہیں ہے یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ ترقی پسندی یعنی طبقاتی کشمکش کا شعور کارل مارکس کی تصانیف کے ذریعہ فطری چیز تھی۔ لیکن اس کی تحریک تنظیم اور پھر اس پر روسی ایجنسیوں کی گرفت اور ترقی پسندوں کی روس کی پرستش، اور وہاں کی حکومت سے جلب منفعت اور ادب کو ایک ہی ڈھرّے پر ہانکنے کی ان کی کوشش یہ سب غلط تھا اور اس کے خلاف ردعمل جدیدیت کی صورت میں ہوا۔ بے شک میں جدید نقادوں لیکن میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ میری فکر پر کسی سرمایہ داری سازش کا سایہ ہے کیونکہ اس فکر نے مشرق ومغرب کے کلاسیکی ادب سے نشوونما پائی تھی جو جمہوری تھا، عوام پسند تھا، لوک سنسکرتی سے جس نے بہت کچھ اخذ کیا تھا۔ مابعد جدیدیت کے متعلق فضیل جعفری نے بتایا ہے اور بعض انگریزی تنقیدوں میں بھی میں نے پڑھا ہے کہ ہر معاشرے میں بڑھتے ہوئے بائیں بازو کے اثرات کے ازالہ کے طور پر ڈریڈا کو امریکہ بلایا گیا اور پھر سے یہ کوشش کی گئی کہ ادب کو صرف زبان، بیانیہ، اور ہیئت تک محدود کر دیا جائے۔ انہی وجوہات کی بنا پر مابعد جدیدیت میں میری دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس تصور سے ادبی معاملات پر کوئی نئی روشنی نہیں پڑتی، شاید فن تعمیر اس سے زیادہ فیض حاصل کرتا ہو۔

☆ اردو شاعری کو حسن وعشق کی بہتات اور متاشاعروں کے نت نئے تجربات نے جس حال تک پہنچا دیا ہے اُس کا ازالہ کس طرح ممکن ہے؟

☆☆ موضوع حسن وعشق ہو یا کچھ اور شاعروں کے ہاتھوں شاعری خراب ہی ہوگی۔ اس کا ازالہ اچھے شاعر اپنی شاعری کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں۔ آج کل گجراتی میں غزلوں کا بڑا زور ہے۔ مسٹر مودی نے ولی گجراتی غزل اکاڈمی

قائم کی ہے جو ہر سال لاکھ روپے کا انعام غزل کے بہترین شاعر کو دیتی ہے۔ غزل کے میگزین نکالتی ہے اور غزل پر سیمنار منعقد کرتی ہے۔ جو بے تحاشا غزلیں کہی جارہی ہیں وہ حسن وعشق کے موضوع پر اتنی نہیں جتنی کہ جدید غزل نے بے سرو پا غزلیں کہہ کر تک بندی کرکے، جدید غزل کا خاکہ تعمیر کیا ہے اسی سے اکتساب موضوعات ہوتا ہے۔ یہاں ایک دلچسپ بات یہ بھی عرض کردوں کہ ولی گجراتی غزل اکاڈمی کو ولی گجراتی کے آگے سے ہٹا کر ولی کے آگے رکھ دیا اور اکاڈمی صرف گجراتی غزل کی اکاڈمی بن گئی۔ خاکسار نے بحث پر فل سٹاپ لگایا اور میٹنگ سے اسی طرح اٹھ کر چلا آیا جس طرح غزل سے حسن وعشق کے مضامین رخصت ہوئے اور چلتر بازیوں کا رنگ جمنے لگا۔

☆ کلیم الدین احمد، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، فضیل جعفری اور دیگر ناقدین کی نسبت آپ کے اختلافی نظریات ادبی حلقوں میں زیر بحث رہا کرتے ہیں مگر آپ کا سخت گیر قلم ان ناقدین کے ذکر میں اکثر نرم بلکہ فکاہیہ ہو جاتا ہے؟

☆☆ میں فکاہیہ کا مطلب نہیں سمجھا، کیا میں تالی کے لئے ہاتھ بڑھا کر مَیں کرنے لگتا ہوں۔

☆ غور وفکر سے عاری وہ کون سا طبقہ ہے جسے نارنگ صاحب اور فاروقی صاحب نے ذہنی طور پر کرپٹ کیا۔ الزام درست مان لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اُن کے اس عمل میں کیا مقاصد کارفرما تھے نیز یہ کہ صرف نارنگ اور فاروقی اس عمل کے مرتکب ہوئے یا دیگر ناقدین کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

☆☆ آپ ایسے سوال نہ پوچھیئے جن کے جواب کیلئے مجھے اپنے مضامین پھر دہرانے پڑیں۔

☆ آج کی نشست میں اُن خود ساختہ ناقدین کی نشان دہی ضرور فرمایئے جو آپ کے خیال میں نقاد تو کیا قاری کے معیار پر بھی پورا نہیں اُترتے؟

☆☆ ایسے لوگوں کے پیچھے وقت غارت نہیں کرنا چاہئے۔

☆ آپ حالی کی شاعری، سرسید کی انشا پردازی سے زیادہ اُن کی تنقیدی بصیرت کے قائل کیوں ہیں؟

☆☆ سوال میں سے لفظ زیادہ نکال دیجئے۔ میں حالی کی شاعری کا اتنا ہی قائل ہوں جتنا ان کی تنقیدی بصیرت کا۔

☆ آزاد اور شبلی کے تنقیدی روّیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

☆☆ یہ سوال تو بالکل امتحان کے پرچے جیسا ہوگیا۔ امتحان اور انٹرویو میں جو فرق ہے وہ بھی آپ کو بتانا پڑیگا۔

☆ سودا کی ہجو یہ شاعری کا دفاع بھی بعید از قیاس ہے؟

☆ انڈو پاک کے ادب اور تنقید کو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اگر ہاں تو نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں؟

☆ یہی سوال اگر اردو تنقید کی نسبت کیا جائے تو نتائج کیا ہونا چاہیے؟

☆☆ یہ تینوں سوالات میرے نزدیک اہمال کے لبریز پیالے ہیں۔

☆ سیکولر بھارت میں اردو زبان وادب کا حال اور مستقبل آپ کے خیال میں کس طرح کا ہونا چاہیے؟

☆☆ بالکل اسی طرح جس طرح نان سیکولر۔

☆ رسم الخط کی بحث کے حوالے سے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

☆☆ جن مسائل کا حل دور دور تک نظر نہیں آتا میں ان پر بحث نہیں کرتا۔

☆ آپ کم وبیش نصف درجن زبانوں اردو، ہندی، عربی، فارسی، گجراتی اور انگریزی پر عبور رکھتے ہیں اگر آپ سے ان زبانوں کے ادب اور تنقید کے موازنے کا کہا جائے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ میرا جواب وہی ہوگا جو بقراط اور سقراط کا ہوگا۔

☆ آپ کے بعد کی نسل میں ایسے ناقدین کی تعداد کتنی ہے جن سے اردو ادب بہتری کی اُمید لگا سکتا ہے۔ اگر ناموں کی مدد سے نشان دہی ہوجائے تو بہتر ہے؟

☆☆ آپ کو ایسے سوال قائم کرتے وقت میری عمر (86 سال) اور صحت (دن بہ دن گرتی ہوئی) کا خیال کرنا چاہئے۔ خیر غالب کا ایک مصرع یاد آرہا ہے۔

دھمکی سے مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا

☆ ہماری خواہش اُن ناقدین سے آگاہی کی ہے جنھیں آپ غیر جانب دار اور بالغ نظر گردانتے ہیں اور جن کے اثرات آپ کے ہاں تلاش کیے جاسکتے ہیں؟

☆☆ اتنے سب نام جمع کرکے آپ کیا کریں گے۔

☆ اگر یہ استدلال درست ہے کہ آپ کی تنقیدی روح کا سفر طے نہیں ہوا تو اس کا جواز اور ذمہ دار کون ہے؟

☆☆ سوال میں غلط بحث ہے۔

☆ آپ کی تقریر دلپزیر کے بے شمار مداح پائے جاتے ہیں مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ آپ ہر تقریر کے بعد پہلے سے زیادہ مضطرب اور منتشر کیوں دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ آپ نے میری کوئی تقریر سن کر یہ بات کی ہوتی تو میں وہ دھراتا۔ لیکن آپ نے تو میری ایک بھی تقریر نہیں سنی۔ ویسے لوگ باتیں تو بناتے ہی رہتے ہیں۔

☆ آنے والے وقتوں میں دنیا کی بے شمار زبانوں کے مستقبل کی بابت طرح طرح کے خدشات اور اُن کے خاتمے کی پیش گوئی کی جارہی ہے۔ اردو زبان وادب کی نسبت آپ کا موازنہ اور رہنمائی نہایت اہم ہے؟

☆☆ یہ آخری سوال وہ بم ہے جو انٹرویو کے شروع میں پھٹ جاتا تو ہم بہت سے مہمل سوالات اور بے سروپا جوابات کی یلغار سے بچ جاتے۔ نہ رہتا بانس نہ بجتی بانسری۔

''جب بھی دیکھا تجھے''

شفاعت قادری

(احمد آباد، بھارت)

وارث علوی خطرناک چیز ہیں۔ وہ ہمارے عہد کے سربرآوردہ نقاد ہیں۔ معاصر تنقید میں انہیں بلند مقام حاصل ہے۔ اردو تنقید میں وارث علوی کا یہ کارنامہ ہے کہ ان کی تجزیاتی نگاہ، فکر ونظر کی تازگی اور تنقیدی بصیرت نے اردو تنقید کو سوچ کی نئی رفعت بخشی اور ہم عصر دانشورانہ فضا کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بے تکلف بے باک اور طنزیہ، مزاحیہ اسلوب سے اردو تنقید کے خارزار کو لالہ زار Readable اور دلچسپ بنایا ہے۔ یہ اسی تنقید کا نتیجہ ہے جو قاری کو اردو کے بہترین تخلیقی شاہکاروں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگر وہ ان تخلیقی شاہکاروں پر تنقید نہ لکھتے تو قاری کا ان تخلیقی شاہکاروں سے رشتہ منقطع ہو چکا ہوتا۔ وارث علوی ایک ایسے نقاد ہیں جن کی ذہنی تربیت مغربی تنقیدی پیمانوں اصولوں اور تھیوری سے نہیں مشرق و مغرب کے اعلیٰ ترین فنی شاہکاروں کے تنقیدی مطالعہ سے ہوئی ہے۔ ان کے یہاں وہ بصیرت ہے جو ادب کے بے لوث اور نشاط جو مطالعہ کے زائیدہ ہوتی ہے۔ میر، سودا، غالب، اقبال، جوش، فراق، راشد، فیض، مجاز، سردار جعفری، ساحر، اخترالایمان، باقر مہدی، محمد علوی، ندا فاضلی، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ، رام لعل، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ، اشک، اقبال مجید، بانو قدسیہ، غلام عباس، غیاث احمد گدی، عصمت چغتائی اور ضمیر الدین احمد پر نئے زاویئے سے لکھے ہوئے مضامین ان کی عملی تنقید کے اچھے نمونے ہیں۔ عملی تنقید کے علاوہ انہوں نے فن فنکار، ادب کلچر، سماج، عوام، پروپیگنڈہ، کمٹمنٹ اور تعلیم کے موضوعات پر بھرپور اور مبسوط طریقے سے نظریاتی مضامین لکھے ہیں جو حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب آرٹ اور تہذیب کے معاملے میں وہ کسی تحریک رجحان یا مکتب سے کمٹ ہونا پسند نہیں کرتے۔ انہیں اپنی نظر پر اعتماد ہے اور وہ نظر کو کسی نظریہ کا پابند کرنا گوارا نہیں کرتے۔ وارث علوی کے یہاں Killer Instinct ہے جو ان کی تنقید کو جارحانہ اور بے رحمانہ تنقید بناتی ہے۔ انہوں نے سماج، تعلیم، تحقیق، کمرشل کلچر، ہارٹی کلچر، بورژوا کلچر، ریاستی کلچر، اکاڈمک کلچر، آئیڈیولوجی کمٹمنٹ اور اسٹیبلشمنٹ کو اپنی جارحانہ تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ اپنی زہرناک تنقید کے ذریعہ مکتبی معاشرتی تدریسی مارکسی لسانیاتی اسلوبیاتی اور ساختیاتی تنقید نگاروں کی سطحیت اور کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ سفید پوش، وضعدار اور پوپلے منہ والے ثقہ نقادوں کی بہت ہی منطقی انداز میں دلائل کے ساتھ قلعی کھولی ہے۔ اپنی تنقیدی قوت کے ذریعہ ان نقادوں کو آمریت کے خلاف آواز بلند کی اور ان نقادوں کو خوف زدہ کیا جن نقادوں نے اپنی تنقید سے سچے شاعروں اور ادیبوں اور ادب کے عام قاری پر اپنی ہیبت طاری کی تھی۔ وارث علوی نے اپنے فکر انگیز مضامین کے ذریعہ ہمیں صرف چونکایا ہی نہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کے مضمون کا انتظار کیا جاتا ہے اور وہ مضمون مباحث کے نئے باب کھولتا ہے۔ وارث علوی کی تنقید کیا ہے؟ یہ تنقید انکشاف اور دریافت کا عمل ہے۔ یہ تنقید Exposure ہے۔ یہ تنقید ایک مہذب آدمی کی دوسرے مہذب آدمی سے سرگرم گفتگو ہے۔ یہ تنقید ادبی سناب پیشہ ور اور ادب کے خود ساختہ محافظ نقادوں کو Shock Treatment دینے کا عمل ہے۔ وارث علوی کی اردو تنقید کو یہ دین ہے کہ انہوں نے اردو تنقید کی ایک نئی تعریف پیش کی ہے۔ بقول وارث علوی تنقید دنیا میں جو کچھ بہتر سوچا گیا ہے اسے اپنے اندر سموتی ہے۔ تنقید جہاں افکار ہے جس کی سیاحت ولولہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ تنقید ادب کا تذکرہ ہے اور ذکرِ یار وصل یار کا لطف رکھتا ہے۔ اسی لئے تنقید شعر و ادب کے شوق کو انگیز کرتی ہے۔ ذوق کو نکھارتی ہے۔ تلاش و تجسس کے جذبہ کو وقار دار بناتی ہے۔ ماضی کے ادب میں ہماری دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے۔ ادب خلوت کا مشغلہ ہے لیکن ذہن میں محفلیں برپا کرتا ہے۔ تنقید ادب کی بزم آرائی ہے۔ ان محفلوں اور ہنگاموں کا بیان جو قاری کے ذہن میں برپا ہوتے رہتے ہیں۔ تنقید وہ سردلبراں ہے جو منبر پر فاش کیا جاتا ہے۔ وہ وعظ ہے جو راز کی صورت میں راز دانوں کو بتایا جاتا ہے تنقید تخیل کی جادونگری کی سیر ہے۔ جہاں افکار کی سیاحت ہے۔ ماضی کے کھنڈروں میں زندہ تجربات کی تلاش ہے۔ شعر کے مئے دوآتشہ کی سرمستی اور سرشاری ہے۔ لفظ کی کسوٹی زبان کی پرکھ اور معنی کا پیمانہ ہے۔ تنقید سے ادب میں گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ہے ورنہ قاری اپنی پسند اپنے تجربہ اور اپنے مطالعہ کا زندانی بن جائے۔ تنقید رابطہ ہے قاری اور قاری کے بیچ، قاری اور فنکار کے بیچ اور نقاد اور فنکار کے بیچ۔ اپنی آخری شکل میں تنقید گفتگو ہے اہل علم کی اہل علم سے، اہل دل کی اہل دل سے خوش طبعی ہے یاروں کے بیچ۔ بے تکلفی ہے احباب کے درمیان۔ بحث وتکرار ہے مشربوں سے۔ چھینا جھپٹی ہے مخالفوں سے، پھکڑ اور ٹھٹھول ہے حریفوں سے۔ آپ کچھ بھی کہئے تنقید سے ادب میں چہل پہل ہے گرمی ہے حرارت ہے۔ لیکن آج کل جو تنقید لکھی جا رہی ہے وہ وارث علوی کی مندرجہ بالا تعریف کے معیار پر پوری اترتی ہے؟ آج کل تنقید میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے پڑھ کر ایک عجیب اندرونی خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ آج کے زمانے میں قاری کو تنقید نے اتنا بڑا دھوکا دیا ہے جتنا کہ جدید افسانہ نگاروں نے۔ اگر نقاد قاری کی تربیت یافتہ شکل ہے تو جو نقاد ہم نے پیدا کئے ہیں وہ تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ شکلیں تو ہیں لیکن ادب کے قاری کی نہیں بلکہ مذہب کے مولوی کی سیاست کے کھلاڑی کی اور کالج کے

مدرس کی۔ ان سب کی کچھ دینی اور پیشہ ورانہ مجبوریاں ہیں جن کے تحت وہ ادب کا مطالعہ ایک بے لوث قاری کی لگن سے نہیں بلکہ چند شخصی اور دانشورانہ تحفظات کے تحت کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو کام انہیں مذہب سیاست صحافت کے تعلیم کے میدان میں کرنا چاہئے تھا انہیں چھوڑ کر انہوں نے اپنی کارکردگی کے لئے ادب کا میدان کیوں پسند کیا؟ انہیں ادب میں دیکھ کر وہی حیرت ہوتی ہے جو میخانہ میں واعظ کو دیکھ کر۔ دراصل انہیں مذہب پڑھنا چاہئے تھا۔ سیاست پڑھنی چاہئے تھی اور لسانیات پڑھنی چاہئے تھی اور انہی موضوعات پر کام کرنا چاہئے تھا۔ ان کا ذہن ایسے ہی کاموں کے لئے بنا تھا۔ عقیدت مندانہ راحت مندانہ مقصدیت کا حامل اپنے مذہبی اور سیاسی تصورات کا زندانی، آدرشوں کا غلام، احتساب اور اخلاقی سخت گیری کا خوگر اور نشاط زیست سے گریزاں۔ ادب کی جادونگری میں داخل ہونے کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ قاری کا ذہن غیر ابر آلود ہو۔ حیرت خانہ طلسم کا تماشائی ہو۔ مسرت کا خوگر ہو۔ چشم ہر رنگ میں وا ہونے کے آداب جانتی ہو۔ ورنہ پڑھنے کے لئے مذہبی رسالوں اور سیاسی پمفلٹوں کی کہاں کمی ہے۔ وہ جو ذہن کی آزادانہ جستجو کا حوصلہ نہیں رکھتے ایسی ہی چیزیں پڑھا کرتے ہیں۔ ان کو سب سے بڑی مسرت ان کے عقائد کی تشفی ہے۔ ان کا نصب العین بھی دوسروں پر اپنے عقائد لادنا ہے۔ دوسروں کو اپنا ہم خیال، ہم مشرب اور ہم سفر بنانا ہے۔ ارادت مندوں کا کارواں تیار کرنا ہے۔ تاکہ ایک ایسا معاشرہ اور ریاست قائم کی جاسکے جوان کی مذہبی اور سیاسی آئیڈیولوجی کے مطابق ہو۔ تنقید کے سامنے اپنے حوصلہ مند عزائم نہیں ہوتے۔ وہ ایک آزاد ذہن کی سرگرمی ہے جو دوسروں کو اپنا ہم خیال یا ہم عقیدہ بنائے بغیر انہیں ادب کے تجربے میں شریک کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تنقید ایک کھلے ذہن کا دانشورانہ عمل ہے۔ تنقیدی شعور کا کام ہی یہی ہے کہ وہ ذہن کی ایسی تربیت کرے کہ وہ بڑی سے بڑی آئیڈیولوجی اور طاقتور تصورات کے سیلاب میں بہہ جانے کا خوف لئے بغیر ان سے آنکھیں چار کر سکے۔ ادب اور ادب کا تنقیدی مطالعہ اس نظر کو عام کرتا ہے کیونکہ ادب کا ایک اہم فنکشن (Function) حقیقت اور دکھاوے کے فرق کو نمایاں کرنا ہے۔ ادب کے تنقیدی مطالعہ کا لازمی نتیجہ اس بصیرت کا حصول ہے جو زندگی کی بنیادی سچائی سے مالا مال ہوتی ہے۔

یوں تو ہمارے یہاں Mediocrity رائج ہے Excellence کمیاب ہے لیکن اس Mediocrity میں وارث علوی کا ذہن منفرد ذہن ہے اردو ادب میں ایسا ذہن کمیاب ہے۔ ان کی تنقید ایک مہذب شائستہ تربیت یافتہ شوخ طرار اور متجسس ذہن کا عکس ہے۔ انہوں نے اپنے طاقتور اسلوب میں چند بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں جن کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔ ان مضامین میں Relevant سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ ان مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جو انہیں اہم دل پسند اور معنی خیز بناتے ہیں۔ نقادوں کی بھیڑ میں وارث علوی کی اپنی شناخت ہے۔ وہ ادب کو انسان کی تہذیبی اور روحانی زندگی کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کی تنقید کا تعلق ادب زندگی اور سماج سے براہ راست ہے۔ وہ ادیب کی آدرشی وابستگی مقصدیت کے محدود تصور اور سطحی حقیقت نگاری کے مخالف ہیں۔ ان کی Penetrate کرتی ہوئی نظر فن کا Totality سے مطالعہ کرتی ہے۔ فنکار زندگی کو اس کی اصلیت میں دیکھتا ہے۔ وہ زندگی کے تاریخی اور انفرادی المیہ اور طربیہ کا شاہد ہوتا ہے اور یہ نظر وارث علوی کو فنکاروں کی عطا کی ہوئی ہے۔ وارث علوی کی شخصیت کا برہنہ اظہار ان کے تنقیدی اسلوب میں ہوا ہے۔ ان کا اسلوب حسن عسکری اور سلیم احمد کے اسلوب سے کتنا مختلف ہے۔ وہ حسن عسکری اور سلیم احمد کے اسلوب کو Surpass کر گئے ہیں۔ اس اسلوب میں تصنع نہیں بناوٹ نہیں نرمی اور ملائمت نہیں، شاعرانہ اسلوب کا لجلجا پن نہیں، عبارت آرائی نہیں۔ مضامین دوسرے علوم کے خام مواد سے اٹے ہوئے نہیں اس لئے اصطلاحوں کلیشیز اور Taboos کا بھی استعمال نہیں ہے۔ وہ اختصار پسند نہ سہی لیکن ان کی زبان کا کمال یہ ہے کہ یہ زبان تنقیدی زبان ہے۔ وارث علوی کی نثر ان کی باغ و بہار طبعیت کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے نثر کو اپنے انفرادی رنگ میں جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے اسے خوبصورت انداز میں ادا کیا ہے۔ ان کی نثر میں زبردست Power ہے۔ یہ نثر بول چال کی زبان سے قریب اور آرائش سے بے نیاز ہے۔ ان کی تنقید میں گھٹن کا احساس نہیں۔ یہ تنقید احساس جرم پیدا نہیں کرتی کیونکہ وہ برابری کی سطح پر مخاطب ہوتے ہیں۔ نہ کہیں علم کی نمائش، نہ رعب، نہ دانشورانہ فوقیت کا اظہار۔ پیش پا افتادہ خیالات نہیں، سرسری اور عمومی نوعیت کی باتیں نہیں۔ نہ اپنی رائے منوانے پر اصرار نہ دوسروں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش۔ ان کے یہاں کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ تنقید میں گہرائی ہے۔ ندرت ہے کیونکہ وہ موضوع کا چیلنج قبول کرتے ہیں۔ دقت طلب مسائل سے الجھتے ہیں وضاحت کرتے ہیں مثالیں دیتے ہیں سوالات پوچھتے ہیں اور کسی ایک فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں لہجے کی بے تکلفی اور طنز کی کاٹ ہے۔ وہ طنز کا تنقید میں سلیقے سے استعمال کرتے ہیں اور یہ سلیقہ اپنی شخصیت کو صحیح انسانی اور اخلاقی قدروں پر تعمیر کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ ان کے یہاں طنز اور تنقید یکساں طور پر اپنا جادو جگاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ تنقید کرتے ہیں تو طنز اپنا اثر کھو دیتا ہے اور طنز کرتے ہیں تو تنقید نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں شخصی غور و فکر ہے بصیرت ہے طنز ہے بذلہ سنجی ہے جملے بازی ہے اور فقرے بازی ہے۔ کہیں بھی تجریدی فکر نہیں تجریدی نثر نہیں۔ نثر میں پیکر تراشی کرتے ہیں اور پیکر تراشی میں فقرے بازی اور جملے بازی کرتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وارث علوی کے چند مضامین وقت کی گرد برد سے بچ جائیں اور جو مضامین بچ نہیں سکیں گے انہیں بھی ان کو جملے بازی اور فقرے بازی کے لئے ضرور پڑھا جائے گا۔

وارث علوی کے لئے تنقید ایک سماجی تہذیبی اور ذہنی سرگرمی ہے تخلیقی فنکاروں کے نقاد بھی انہی کے سطح کے ہوتے ہیں۔ اردو کے چند تخلیقی فنکاروں پر وارث علوی کا تفکر اور بصیرت کا تجربہ ان تخلیقی فنکاروں کی شاعری

افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے تجربہ سے مختلف کم ہوش ربا سہی لیکن فکر انگیز اور بصیرت افروز ثابت ہوتا ہے۔ بے شک تخلیقی تجربہ حسن ہے جو تنقید نہیں ہوتی۔ تخلیق کا تجربہ جمالیاتی ہے تنقید کا دانشورانہ لیکن خیال کا بھی اپنا حسن ہوتا ہے اور اظہار خیال کا بھی۔ دونوں مل کر تنقید کو وہ حسن عطا کرتے ہیں جو عموماً خشک مکتبی اور مدرسانہ کتابوں میں نہیں ہوتا۔ تنقید چونکہ بے مثال فن پاروں اور بڑے فنکاروں سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ان کے متعلق خیال آرائی کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے جو اپنا حسن لے کر آتا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اردو کے چند بڑے فنکاروں کا مطالعہ کرنے والے لوگ اپنی مشکلات حل کرنے کے لئے یا ان کو تحسین اور تفہیم کی خاطر یا ان تصورات اور خیالات کو گہرائی کا شعور حاصل کرنے کیلئے ان تنقیدوں کو بھی ضرور پڑھیں گے جو وارث علوی کی وسیع مطالعہ اور طویل عرصہ پر پھیلی ہوئی دانشورانہ ریاضت کا ثمر ہے۔ وارث علوی تجربات کی دنیا کے سیاح ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھنا زندگی کی کتاب کو پڑھنے کے مترادف ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے لیکن تحریروں میں مطالعہ کا بوجھ نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں مستعار کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ ہے وہ ذاتی تجربہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ انہیں پڑھتے ہوئے ہم یہ محسوس کرتے ہیں۔ جیسے ہم ترقی یافتہ شعور کی صحبت میں ہوں موضوعات کی رنگارنگی اور اس پر انفرادیت کی چھاپ، ایسے لکھتے ہیں جیسے گفتگو کر رہے ہوں۔ ان کی تحریر بظاہر آسان نظر آتی ہیں لیکن دراصل فکر انگیز ہوتی ہیں۔ یہ تحریریں اس قدر آسان اور دلچسپ کیوں ہیں؟ مجھے تو اس کی یہی وجہ نظر آتی ہے کہ جس شخص کے یہاں Clarity of mind اور Clarity of Idea ہو عمل میں چوکھا پن اور باطن میں کوئی الجھن نہ ہو پریشانیاں نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو ان الجھنوں اور پریشانیوں کو کس طرح حل کرنا چاہئے اس کی سجھ بوجھ ہو وہی شخص اتنی سہجتا سے لکھ سکتا ہے۔

ہمارے زمانہ میں نقادوں کی کثیر تعداد اپنے آپ کو ادب کا Clearing Agent سمجھتی رہی ہے۔ ان نقادوں کو معلوم ہی نہیں کہ تنقید کا افق وسیع اور زیادہ آزاد ہوا ہے۔ فن کی اپنی صداقتیں ہوتی ہیں۔ تنقید میں صرف علم کام نہیں آسکتا ہے بلکہ علوم سے حاصل شدہ بصیرت کو پس منظر میں رکھتے ہوئے فن کی اپنی صداقتوں کو اجاگر کرنا پڑتا ہے۔ مختلف ادبی روایتوں کا شعور مختلف سماجی اور تہذیبی رویوں پر تجزیاتی نگاہ اور تجربات کی تنقید میں اہمیت ہوتی ہے۔ وہ تجربات جو زندگی کو مشاہدے اور ادب کے عمیق مطالعہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ تجربات کا دھارا رک جائے تو تحریر خشک ہو جاتی ہے۔ اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ اکاڈمی کے انعام کے لائق ہو جاتی ہے۔ وارث علوی ادب سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنے تجربات میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ انہوں نے صرف عملی اور نظریاتی تنقید ہی نہیں کی بلکہ اردو کے بیشتر نقادوں کی شخصیت کے مضحک پہلوؤں پر اپنے طنز کا حربہ استعمال کیا ہے۔ ان نقادوں کی سطحیت اور کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے اور ان پر یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کا شعور ناقص مطالعہ سطحی اور علم فرومایہ ہے۔ وہ نقاد تو کیا اچھے قاری بھی نہیں ہیں۔ وارث علوی کو اپنی ذات پر اعتماد ہے اس لئے سب کو خوش رکھنے اور سب کے ساتھ چلنے کے لئے سلامتی کا راستہ پسند نہیں کرتے۔ اپنی زہرناکی تنقید بت شکنی اور معرکہ آرائیوں کے باعث ملامتوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دوست کم اور دشمن زیادہ بناتے ہیں۔ ان کے مضامین کا شدید ردعمل ہوتا ہے لیکن میں نے آج تک ایسا ایک بھی مضمون نہیں پڑھا جو ان کے تنقیدی مضمون کی تردید میں لکھا گیا ہو۔ برعکس ادبی رسائل میں ان کے خلاف خطوط شائع ہوتے ہیں۔ جن میں ان کی ذات پر اوچھے اور گھٹیا قسم کے حملے کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان خطوط سے ان کے مضمون کی تردید نہیں ہوتی کیونکہ یہ خطوط بے معنی ہوتے ہیں۔ ان کے لئے یہ خطوط تفریح اور تفنن کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنے لکھے ہوئے مضامین سے مطمئن ہیں۔ اس لئے تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ انہیں یہ خوف نہیں ہے کہ ان کے خلاف تنقید سے ان کی کارکردگی پر پانی پھر جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے خلاف بھی ایسے ہی مضامین لکھے جائیں جو ان مضامین کا سخت تنقیدی محاسبہ کر سکیں۔ وارث علوی کی تمام لڑائیاں نقادوں سے ہی ہیں فنکاروں سے نہیں۔ ان کی تنقید کا دامن سخت اختلافات سے بھرا پڑا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، سردار جعفری، مختار حسین، احتشام حسین، آل احمد سرور، وزیر آغا، عبادت بریلوی، محمود ہاشمی، سلیم احمد، شکیل الرحمٰن، شمیم حنفی، وحید اختر، ابن فرید، محمد حسن، قمر رئیس اور دوسرے بے شمار چھوٹے بڑے نقاد ہیں۔ جہاں انہیں اختلاف ہوا برملا کہا اور سخت کہا۔ جبکہ فاروقی اور نارنگ کے خلاف نظریاتی جنگ چھیڑی، جہاں تک فاروقی اور نارنگ سے اختلاف کا سوال ہے فاروقی کا تعلق شرح و تفسیر تعبیر و معنی آفرینی فصاحت و بلاغت عروض و قوافی دیباچہ نگاری تبصرہ نگاری اور ادارت سے ہے۔ نارنگ کا تعلق تصنیف و تالیف ترتیب و تزئین اور تحقیق و تنظیم سے ہے۔ یعنی ایک شارح ہے مفسر ہے مبصر ہے عروض داں ہے اور مدیر ہے۔ دوسرا مصنف ہے، مرتب ہے مولف ہے اور منتظم ہے۔ یہ دونوں ان کاموں کے مرد میدان ہیں۔ یہ دونوں سب کچھ ہیں لیکن خالص ادبی نقاد نہیں ہیں۔ فاروقی اور نارنگ نے اردو قارئین کے سر پر اپنے ان غیر تنقیدی کاموں کو تنقید کے نام پر منڈھ دیا ہے۔ بقول وارث علوی "فاروقی اور نارنگ بنیادی طور پر نقاد نہیں ہیں جیسے کہ آرنلڈ ایلیٹ ومسٹ اور ایلن ٹیری ہیں۔ وہ ادب سے نہیں لسانیات اور اسلوبیات سے آئے اور دوسرے علوم مثلاً علم بیان اور ساختیات میں چلے گئے۔ "اردو زبان و ادب میں ان دونوں کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ انہوں نے شخصیت پرستی کو رائج کیا۔ ذہن کے آزادانہ جستجو سے قاصر عقیدت مندوں ارادت مندوں اور شخصی غور و فکر سے عاری محدود مفادات کا حاصل طبقہ پیدا کیا۔ اس طبقہ کو ذہنی طور پر Corrupt کیا اور اسے آزادانہ طور پر پنپنے نہیں دیا۔ فاروقی اور نارنگ نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت غیر ادبی طریقوں سے

خودکواس طرح Project کیا جیسے صرف وہی ہندوستان کے عظیم نقاد ہیں۔ دونوں اپنے اپنے ادبی عقیدے کے خودساختہ پیغمبر بن گئے۔ دونوں پیغمبروں کا یہ دعوی کہ ایمان لاتو صرف ہم پر۔ ہماراعقیدہ صحیح ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعرادیب افسانہ نگار اوراساتذہ ان دونوں پیغمبروں کی امت میں بٹ گئے۔لیکن وارث علوی نے ان دونوں پیغمبروں کے پیغمبرانہ دعوے کو چیلنج کیا اوران کے خلاف اس وقت آواز بلند کی جب ان کے پیغمبرانہ جلال شہرت اور عظمت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ انہوں نے اپنی جارحانہ تنقید اور بت شکنی سے ان دونوں کے دانشورانہ کردار کو بے نقاب کیا۔ان کے خلاف نظریاتی جنگ چھیڑی لیکن نظریاتی جنگ کو شخصی جنگ نہیں بنایا۔انہوں نے معرکہ آرائی کو محاذ آرائی اور محاذ آرائی کو ذاتی جنگ میں بدلنے نہیں دیا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ معاشرے کی توانائی کا اندازہ اس میں اختلاف رائے تو پنپنے کے امکانات سے ہوتا ہے۔کسی معاشرے میں اختلاف رائے کے مواقع جس قدر زیادہ ہوں گے وہ معاشرہ اس قدر صحت مند ہوگا۔

وارث علوی کل وقتی ادیب ہیں۔انہوں نے خودکو پڑھنے اور لکھنے کے لئے وقف کردیا ہے۔وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کہ "میں تو ادب کی خدمت کررہا ہوں۔" وہ ادبی سرگرمی کے علاوہ کسی اور سطح پر فعال نہیں ہیں۔ان کی وابستگی زبان سے نہیں Intellectualism سے ہے۔اور یہ وابستگی اس درجہ راسخ بھی نہیں کہ اپنی ذات اپنی نجی اور گھریلو زندگی دانشورانہ سرگرمی کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کرلے۔ اب نہ کانفرنس میں شرکت کرنے کا شوق ہے نہ سیمینار میں۔ایک وقت وہ تھا جب وہ سیمیناروں میں شرکت نہ کرتے تو انہیں جوشہرت ملی ہے وہ نہ ملی ہوتی۔لیکن آج وہ اس مقام پر ہیں کہ وہ جس سیمینار میں نہ ہوں وہ سیمینار یک طرفہ پژمردہ بے کیف اور بے جان محسوس ہوتا ہے۔وارث علوی یہ نہیں چاہتے کہ کوئی انہیں نقاد کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ان کی تو صرف یہ خواہش ہے کہ انہیں ایک ذہین قاری کے طور پر تسلیم کیا جائے۔وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا تعلق Book Culture سے ہوتا ہے اور جو Living Literature میں زندہ رہتے ہیں۔ادب ان کے لئے نہ ترقی ہے نہ شخصیت کی زینت ہے۔نہ دانشوری کی زرکاوی ہے۔ادب ان کے لئے جینے کا اسلوب ہے۔ایک جذباتی ضرورت اور ایک روحانی طلب ہے۔مطالعہ کرتے ہیں اپنے لئے دوسروں کے لئے نہیں۔علم کی نمائش کے لئے نہیں Well Read کہلانے کے لئے نہیں۔دانشورانہ لطف اندوزی Intellectual Pleasure کے حصول کے لئے۔وارث علوی نے جو مطالعہ کیا ہے۔وہ نقاد بننے یا لکھنے کے لئے نہیں کیا ہے۔ان کے مطالعہ میں سکالر اور Subject Expert کا نظم وضبط نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں ایک تجسس ہے۔ایک سیاح کا تجسس ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور تنقید کے علاوہ تاریخ، مذہب، نفسیات، سماجیات اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پڑھنا اچھا پڑھنا لکھنا اچھا لکھنا اور وہ بھی متنوع مصنوعات پر اسلوب کے تنوع کے ساتھ لکھنا کتنا مشکل عمل ہے۔ہم ان کی تحریروں سے اتفاق کرسکتے ہیں یا اختلاف۔انہیں قبول کرسکتے ہیں یا رد لیکن انہیں نظرانداز نہیں کرسکتے۔وارث علوی تو اس دن کے انتظار میں ہیں جب کوئی انہیں یہ کہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے بکواس ہے وارث علوی مست ہے فراڈ ہے۔ہمارے زمانے میں اردو ادب میں شخصیت پرستی اور پائے لاگن کی رسم رائج ہے۔آج تک وارث علوی پر خصوصی گوشہ اور نمبر شائع نہیں ہوا۔خصوصی گوشہ اور نمبر تو کیا آج تک ان پر کسی نے ایک مضمون تک نہیں لکھا۔جب کہ وارث علوی جنہیں اپنے ہم مشرب و ہم پیشہ اور ہم راز کہتے ہیں جن کا ادب میں رعب اور دبدبہ ہے جو اپنے قصیدہ گویوں کے ٹولے پالتے ہیں ان پر خصوصی گوشے اور نمبر شائع ہوتے ہیں۔ اور اب تو بقول فضیل جعفری ان کے چغلخوروں پر خصوصی گوشے اور نمبر شائع ہو چکے ہیں۔

بے شک وارث علوی ایک بے نیاز اور اپنی مستی میں مست رہنے والے آدمی ہیں لیکن ان کی طرف اردو تنقید کی بے رخی خود ہمارے ناقدانہ کردار کی اچھی مثال قائم نہیں کرتی۔آج تک وارث علوی کی حالی مقدمہ اور ہم، اپنے پیارے لوگو، تیسرے درجے کا مسافر، پیشہ تو سپہ گری کا، بھلا کچھ بچالایا ہوں، خندہ ہائے بیجا، منٹو، بیدی، فکشن کی تنقید کا المیہ، اوراق پارینہ، سرزنش خار، لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر، بورژ واژی بورژ واژی، ناخن کا قرض، جدید افسانہ اور اس کے مسائل، ادب کا غیر اہم آدمی، گنجینہ باز خیال اور دیگر کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔لیکن انہوں نے ان کتابوں کی تقریب رونمائی نہیں کی۔ بروشر نہیں چھپوائے کسی سے اپنی کتاب پر فلیپ اور دیباچہ لکھوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی اپنی کتاب پر کسی سے تبصرے کے لئے کہا۔انہیں ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں۔ انہیں اپنی اہمیت کا پورا احساس ہے۔جس کا ثبوت وہ تین ہزار خطوط ہیں جو ان کے چاہنے والوں نے لکھے ہیں۔وارث علوی اتنے منکسر مزاج بھی نہیں جو یہ کہیں کہ "میں تو بہت معمولی لکھنے والا ہوں"۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ صرف انہی کا حق ہے۔انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ انہوں نے بہت اچھے مضامین لکھے ہیں۔دوسروں کی نظر میں یہ مضامین اچھے ہوں یا برے۔یہاں اچھے اور برے کی اہمیت نہیں ہے۔انہیں اپنے آپ پر اعتماد ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ایسے ہی مضامین لکھتے رہیں گے جو استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔یہ ان کی رعونت ہے یا انانیت؟ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قلم کار کے لئے رعونت اور انانیت کا عیب بھی لازمی ہے۔وارث علوی کی رعونت یا انانت اپنی ناقدانہ بصیرت پر اس اعتماد کا نتیجہ ہے جو صلہ کی پروا اور ستائش کی تمنا سے ماورا ہوتی ہے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو منوایا ہے لیکن یہ Recognition غیر ادبی طریقوں سے حاصل نہیں کیا ہے۔وہ ادب کی دنیا میں ہر غیر ادبی چیز کے مخالف ہیں۔ان کے اس موقف کے باعث ان کے ساتھ کس قدر ناانصافی ہوئی ہے اور اس ناانصافی کا سلسلہ آج تک جاری ہے

لیکن انہیں اس ناانصافی کا رنج نہیں ہے۔ کیونکہ ناانصافی فن کار یا ادیب کی ادبی
توانائی کے لئے ضروری ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔ وارث علوی کے لئے یہ ناانصافی
مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس ناانصافی کے باعث ان کی اصول پسندی ایمانداری
راست بازی بے باکی بے چینی اور غصہ کی وقار اور تیز ہوتی ہے اور وہ شاعری
افسانہ نگاری ناول نگاری اور تنقید نگاری کے مختلف موضوعات پر لکھنے میں کس قدر
کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

وارث علوی کی تقریباً کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن آج تک انہیں
ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یا اور کوئی بڑا انعام نہیں ملا اور اب یہ انعام ملنے کی کوئی امید بھی
نہیں ہے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب اگر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملے تو انہیں
چاہیے کہ وہ اس انعام کو ٹھکرا دیں۔ کیا معنی ہیں اس ایوارڈ کے جب صحیح وقت پر صحیح
فنکار یا ادیب کو صحیح کتاب پر نہ ملے۔ جہاں تک انعام کے حصول کا تعلق ہے
انعام حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وارث علوی ایک قلم کار ہیں انہیں
چاہئے کہ وہ بے بصیرت مفاد پرست جاہ طلب اور ترقی کوش افراد سے تشکیل کردہ
انعامات تقسیم کرنے والی کمیٹیوں اور اکادمیوں کی مخالفت کریں۔ ان لوگوں کو بے
نقاب کریں۔ یہاں سوال اخلاقی قدروں اور شاعر و ادیب کے
Self-Respect کو خریدنے والی کمیٹیوں اور اکادمیوں کا نہیں ہے۔ سوال
شاعر ادیب یا دانشور کی خودداری اور غیرت وحمیت بے نیازی اور لاابالی پن کا
ہے۔ ماضی کے ان فنکاروں اور دانشوروں کا ہے جو ادبی روایت کے کہکشاں میں
درخشندہ ستارے کی طرح اپنی تابناکی چھوڑ گئے۔ سوال مستقبل کی ادبی شاہراہ پر
اپنے نقش قدم چھوڑ جانے کا ہے۔ سوال مفاد پرست خوشامد پرست اور بونوں کو
بے نقاب کرنے کا ہے۔ اگر وارث علوی یہ فریضہ انجام نہیں دیں گے تو اور کون
دے گا؟ انعاماتی کمیٹیوں کی تشکیل کون کرتا ہے؟ کیا انعاماتی کمیٹیوں کے طریقے
کار میں Transparency ہوتی ہے؟ انعاماتی کمیٹیوں میں کس ذہنی سطح اور
ادبی قد کے اراکین شامل ہوتے ہیں؟ کس کتاب کو "اعلیٰ ترین اور معیاری"
قرار دے کر انعام دینے والوں کے اعلیٰ معیار کے کون سے پیمانے ہیں؟ خاطر
نشاں رہے کہ انعامات اعزاز اور سرکاری قدردانی کی دنیا میں احباب نوازی اور
اقربا پروری کا زہر کہاں تک سرایت کر گیا ہے۔ اکاڈمیوں کی جانب سے دئے
جانے والے انعامات و اکرامات سے لکھنے والے کی قدرشناسی ہوتی ہے لیکن
ادیب یا دانشور کی کھری کسوٹی تو ادب ہی کا میدان ہے۔ محض انعامات و
اکرامات کے زور پر کوئی ادیب بڑا ادیب نہیں بنتا۔ بڑائی اسکی اس میں ہے کہ
ذہین قارئین کا طبقہ اس کی تحریروں کی پذیرائی کس صورت میں کرتا ہے۔ عزت
اور احترام آسانی سے نہیں ملتے۔ ریاضت محنت ذہنی یکسوئی اور عرق ریزی سے
حاصل ہوتے ہیں۔ جس شخص کو عزت واحترام کا نشہ چڑھتا ہے۔ وہ ہوش وحواس
کھو بیٹھتا ہے انسان دولت تو ہضم کر سکتا ہے لیکن عزت تو کچے سیماب کی طرح
پھوٹ نکلتی ہے۔ کئی آدمی ہر روز اخبار میں اپنا نام اور ٹی وی پر اپنا چہرہ دیکھ کر یہ
طے کر لیتے ہیں کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔ یہ دور Self advertisement کا
دور ہے۔ ہر آدمی اپنا ڈھول پیٹ رہا ہے۔ شاعر و ادیب اپنا جشن مناتے ہیں۔
خصوصی گوشے اور نمبر شائع کراتے ہیں۔ دراصل یہ شہرت یہ عزت یہ اقتدار سب
کچھ انسان کی خود پسندی سے پیدا ہونے والے مرض کی علامتیں ہیں۔ مقبولیت
جو ہے وہ Credit یا Esteem نہیں ہے۔ مقبولیت آدمی کے نام کا
Inflation ہے۔ جب کہ Reputation جو ہے وہ Credit کا عرق
ہے۔ کئی اشخاص مقبول ہونے کے ساتھ ہی باعزت باوقار بھی ہوتے ہیں۔
شہرت Reputation نہیں ہے۔ Publicity اور Fame بھی ہم
معنی نہیں ہیں۔ آدمی کی موت کے یا سال کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے
اسے Reputation یا Esteem کہتے ہیں۔ آدمی حیات ہو اور اس کی
زندگی میں اسے جو کچھ ملے وہ Publicity ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ہو
یا گیان پیٹھ ایوارڈ ہو سرسوتی سمان ہو بکر پرائز ہو یا نوبل پرائز ہو یہ سب
Publicity ہی کا حصہ ہیں۔ حافظ، خیام، میر، غالب، راشد اور منٹو کو کون سا
ایوارڈ ملا تھا؟ آج بھی کوئی آدمی ان کی شاعری یا افسانہ پڑھ کر مسرت اور
بصیرت حاصل کرتا ہے تو یہ ان کا Reputation ہے۔ کئی آدمی ماضی میں
حاصل کی ہوئی Credit کی جگالی کرتے رہتے ہیں اور اسے Cash کرتے
رہتے ہیں۔ صلاحیت خدا دیتا ہے۔ لوگوں کے ذوق اور دلچسپی میں تبدیلیاں ہوتی
رہتی ہیں۔ لیکن لوگوں میں گھرے ہونے کے باوجود لوگوں میں بکھر نہ جانے والا
فنکار یا دانشور اپنے مرکز پر قائم رہتا ہے۔ وارث علوی نے جو Reputation
حاصل کیا ہے وہ Public Relation, Self Projection, Self
Promotion اور دیگر غیر ادبی طریقوں سے حاصل نہیں کیا بلکہ اپنی
صلاحیتوں اور قلم کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ ان کے مضامین میں ایک ادیب کی
خوداعتمادی ہے اور جو ادیب اپنی خوداعتمادی کی حفاظت کرے شہرت اس کے
قدم چومتی ہے۔ Credit یا Reputation مانگنے سے نہیں ملتے۔ اس کے
باوجود بھی ہم اس کے دروازے پر کشکول گدائی لئے دستک دیں تو ہم فنکار
ادیب یا دانشور نہیں بھکاری ہیں۔

جو شخص وارث علوی کے قریب ہوا سی شخص کو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان
کے لاتعداد چاہنے والے ہیں۔ وہ اپنے مضامین کی طرح تقاریر کے ذریعہ اور
الفاظ کے جادو سے اپنے حسن بیان سے لوگوں کے دل میں بس گئے ہیں۔ لوگوں
کو آج بھی ان کی وہ تقریریں یاد ہیں جو انہوں نے "سخن کدہ" کی ادبی محفلوں
میں کی ہیں۔ یہاں "سخن کدہ" کے متعلق یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ شہر
احمد آباد میں انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بعد ایسا کوئی حلقہ بے
ارادہ نہیں تھا۔ جہاں دانشورانہ سوچ بچار کیا جاسکے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ
ایسا کوئی حلقہ بے ارادہ قائم کیا جائے۔ راقم المعروف عادل منصوری جینت پرمار
اور شہر کے دیگر ادب نواز حضرات ایسے ادبی حلقے کی کمی کو ایک عرصے سے محسوس

کر رہے تھے۔ مندرجہ بالا مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے شہر کے ادب نواز حضرات اور باذوق نوجوانوں نے "سخن کدہ" کے نام سے ایک ادبی حلقہ قائم کیا ہے۔ خاطر نشاں رہے کہ "سخن کدہ" شاعروں یا ادیبوں کی انجمن نہیں ہے Writers Guide نہیں ہے بلکہ یہ تو ان لوگوں کا حلقہ ہے جن کا تعلق شعرو ادب فکروفن اور کلچر سے ہے اور جن کی دلچسپی افکاروتصورات میں ہے اور جو شعرو ادب کے حوالے سے حیات وکائنات اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "سخن کدہ" کے قیام کے دیگر مقاصد یہ ہیں کہ آزادی فکری وخیال اور دانشورانہ روایت کو قائم رکھا جائے۔ ذہین اور منتخب قارئین پیدا کئے جائیں اور شہر کے نئے لکھنے والوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے۔ "سخن کدہ" ایک ایسا حلقہ ہے جس کا نہ تو کوئی صدر ہے کوئی سیکریٹری اور نہ کوئی خازن۔ صرف دو کنوینر ہیں وارث علوی اور شفاعت قادری۔ جو مہینے میں دوبارہ ایسی نشستوں اور محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں جن میں کسی ایک فنکار اور فن پارے پر فکر انگیز تقریر کی جاتی ہے۔ تقریر کی زبان اردو ہندی گجراتی یا انگریزی کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ زبان کے Barrier کو توڑنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان محفلوں کے لئے شہر کے مقتدر عالموں اور دانشوروں کی خدمات حاصل کرنے میں سہولت ہوئی ہے اور تقاریر کے موضوعات کا دائرہ ملکی زبانوں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کے ادبی شاہکاروں تک وسیع ہوگیا ہے۔ وارث علوی "سخن کدہ" کی ہر ادبی محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے ایک پرلطف اور خوش گوار فضا بنتی ہے۔ یہاں یہ بات اہم ہے کہ احمد آباد جیسے صنعتی اور تجارتی شہر میں "سخن کدہ" کی دانشورانہ سرگرمیاں ایک محدود لیکن مخصوص حلقے کے لوگوں کو فکر ونظر کی تازگی اور بصیرت کا سامان بہم پہنچا رہی ہیں۔ میں نے یہاں "سخن کدہ" کے قیام اور اغراض ومقاصد کا صرف اس لئے ذکر کیا کہ وارث علوی اور ان کی طرح مجھ جیسے دیگر نوجوانوں کی دلچسپی اور وابستگی صرف زبان سے نہیں افکاروتصورات سے ہے Intellectualism سے ہے۔ "سخن کدہ" کے زیر اہتمام جلسوں میں وارث علوی نے میر، فیض، راشد، جوش، فراق، سلیم احمد بیدی، غلام عباس اور انتظار حسین پر فکر انگیز تقاریر کی ہیں۔ ان تقریروں میں چند ایسے معنی خیز نکات بیان کئے ہیں جو آج تک ان کی تحریروں میں بھی شائع نہیں ہوئے۔ کاش ان تقریروں کو ریکارڈ کرلیا جائے۔ وارث علوی جب تقریر کرتے ہیں اس وقت محفل میں بھی ایک پرلطف، خوشگوار اور بے تکلف فضا تو بنتی ہے لیکن ان کے اردگرد محفل کا Nucleus تعمیر نہیں ہوتا جو سردار جعفری گجراتی کے نامور شاعر اور اسکالر اوماشنکر جوشی اور نرنجن بھگت کی موجودگی سے تعمیر ہوتا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں علمی رعب اور دبدبہ ہیں۔ وہ ایک بے تکلف شگفتہ خوش مزاج اور بذلہ سنج شخص ہیں۔ وارث علوی جادو بیاں مقرر ہیں۔ ادبی موضوعات پر فی البدیہہ تقریر کرتے ہیں۔ تقریر کرتے وقت ان کا مخصوص انداز ہوتا ہے۔ سینے کا بالائی حصہ آگے کی طرف ہوتا ہے۔ اکثر دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف ہوتے ہیں یا پھر دونوں ہاتھ اشاراتی حرکت کرتے ہیں۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ حرکت تیز یا سست ہوتی رہتی ہے۔ تقریر کا آغاز ٹھہراؤ سے ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ لہجہ چڑھائی کی طرف جاتا ہے۔ مگر ایک حد تک تقریر پھر اعتدال پر آجاتی ہے۔ مکالماتی انداز میں Conviction کے ساتھ الفاظ کی ادائیگی، الفاظ میں شخصیت کا وزن اور شدت جذبات کا احساس ہوتا ہے۔ دردمند لہجہ میں خیالات کا دھارا بہتا رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی تقریر Sentimentalize نہیں ہوتی۔ کیونکہ اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ تقریر میں توازن برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر ناقدانہ اور پرمغز ہوتی ہے۔ اپنی تحریروں کی طرح تقریر میں بھی عمومی اور سرسری نوعیت کی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ سردار جعفری کی طرح خطیبانہ انداز میں تقریر کرتے ہیں نہ Anecdote کا استعمال کرتے ہیں۔ خاطر نشاں رہے کہ وارث علوی سردار جعفری کو بڑا مقرر سمجھتے ہیں۔ وہ سردار جعفری کی جادو بیانی کے قائل ہیں۔ پہلے وہ سردار جعفری کے انداز میں ہی تقریر کرتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے ریاضت اور مشق کے ذریعہ اپنا ایک انفرادی انداز پیدا کیا۔ وہ تقریر کے بعد مطمئن نہیں مضطرب نظر آتے ہیں۔ میں نے کئی بار ان کی تقریریں سنی ہیں ان کی تقریروں میں Viality سحر آفرینی اور ندرت تو ہوتی ہے لیکن پھر بھی مجھے کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے انہیں گھنٹوں اور پہروں سنا ہے۔ جس کے باعث میں اثر پذیری کے عمل سے محروم ہو چکا ہوں۔

میں نے وارث علوی کے ساتھ احمد آباد دوردرشن سے میر، جوش، فراق، فیض، ساحر، مجروح، کیفی، سردار جعفری، اختر الایمان، بیدی اور احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن پر TV پروگرام پیش کئے ہیں۔ ان پروگراموں میں جب وہ بولتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ الفاظ سے حیرت زدہ نہیں کرتے الفاظ سے ہمارا رشتہ وابستہ کررہے ہوں۔ یہ الفاظ ان کی Transparent خاموشی میں تشکیل پاتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ کا ہجوم مشعل لے کر آگے نہیں بڑھتا بلکہ ان کے الفاظ میں چراغ کا ایسا اجالا ہوتا ہے جو اندھیروں کو چیرتا ہے۔ ٹی وی پر وہ عالمانہ انداز میں نہیں بلکہ عام سہل پسند تجزیاتی اور دلچسپ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنی ناقدانہ بصیرت سے فن پاروں کے حسن اور معنویت کو اجاگر کرتے ہیں۔ فنکار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ مکالماتی انداز میں واقعات آسانی سے ترتیب پاتے ہیں اور نکات آسانی سے بیان ہوتے ہیں۔ پوری گفتگو فن پارے کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور ہمارے سامنے وارث علوی کی صاف بلند آواز دلنواز شخصیت خیالات احساس اور تجربہ کی شکل میں الفاظ نما جسم باقی رہ جاتا ہے۔

شہر احمد آباد میں وارث علوی کی شناخت ایک بذلہ سنج خوش گفتار شخص پروفیسر روشن خیال دانشور اور جادو بیان مقرر کی ہے۔ وارث علوی شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے یہیں ان کی پرورش ہوئی یہیں تعلیم حاصل کی۔ انجمن اسلام

ہائی سکول میں ڈھائی سال تک سکول ٹیچر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔اس کے بعد سینٹ زیویرس کالج میں انگریزی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا بقول وارث علوی میں چاک و چوبند بیروکریٹ نہیں۔ وہ پروفیسر نہیں جو ڈھائی لاکھ کے وظیفہ پر ان موضوعات پر تحقیق کرتا ہے جن پر کام کرنے والے پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کر چکے۔ میں اساتذہ کی کانفرنس کے پریسڈیم کا صدر نہیں۔ ادیبوں کے وفد کا لیڈر نہیں۔ کسی میموریل کا ڈائریکٹر نہیں۔ وزارت تہذیب کی آنکھ کا تارا اور ساہتیہ اکاڈمی کا راج دلارا نہیں۔"
ترقی کا یہ حال کہ پہلے فارسی پڑھائی بعد میں انگریزی پڑھائی اور بطور پروفیسر ملازمت کی اور انگریزی ڈپارٹمنٹ کے صدر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ نہ موٹر کار نہ بنگلہ نہ شان وشوکت نہ سماجی اقتدار۔ وارث علوی کی ادبی زندگی کا آغاز بھی احمد آباد میں ہوا۔ آج وہ جس مقام پر ہیں وہ شہر احمد آباد کی بدولت ہیں۔
یہ شہر دہلی لکھنو علی گڈھ اور الہ آباد جیسے اردو مراکز سے بہت دور ہے۔ اس لئے اس شہر میں قیام پذیر ہونے کا انہیں سب سے بڑا Privilege یہ حاصل رہا ہے کہ وہ بے باک بے لاگ زہرناک اور جارحانہ تنقیدی مضامین لکھنے میں کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ آج اگر وارث علوی، وارث علوی ہیں تو اس شہر میں قیام پذیر ہونے کے باعث ہی ہیں۔ اگر وہ اردو مرکز میں قیام پذیر ہوتے تو وارث علوی نہ ہوتے کچھ اور ہی ہوتے۔ اس شہر کے لوگوں نے ان سے جتنی محبت کی اتنا ہی انہوں نے لوگوں کو پیار دیا ہے۔ اس شہر سے انہیں بے پناہ لگا ہے۔ وہ آج اس شہر کے غریب اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کے محلے میں اپنے قدیم طرز کے آبائی مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے گھر میں ایک کتب خانہ ہے جس میں انگریزی شاعری ناول ڈرامے اور تنقیدی کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ اردو کی انگنت کتابیں ہیں لیکن اردو کی خریدی ہوئی کتابیں بہت کم ہیں کیونکہ نقاد ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آئے دن اردو کی کتابیں اور رسالے تحفے میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ سرخ وسپید رنگ کلین شیوڈ چہرہ سر پر برائے نام بال میانہ قد گٹھا ہوا جسم صاف اور بلند آواز پرکشش شخصیت۔ وہ محفلوں میں جدید طرز کا لباس پہنتے ہیں تاکہ ڈھلتی ہوئی عمر کا احساس نہ ہو اور اپنے آپ جوانی اور تازہ دم محسوس کرسکیں۔ اس شہر میں ان کے شناسا تو بہت ہیں دوست بہت کم اور ہمراز کوئی نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ ان کے کوئی راز ہیں ہی نہیں۔ زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے۔ ان کے مکان پر مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں۔ ہمسایہ عزیز و اقارب طلبا سکول ٹیچر پروفیسر سیاسی اور سماجی کارکن۔ چھوٹا بڑا کوئی بھی شخص ہو جس وقت بھی ان سے ملنے کے لئے آیا ہو چاہے ان کو مصروفیات کے دوران ہی ملنے کے لئے آیا ہو پھر بھی وہ Disturb ہوئے بغیر اس سے اس طرح ملتے ہیں کہ ان سے ملنے والا شخص بھی ایک قسم کا اطمینان محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ Undivided ہو کر باتیں کرتے ہیں۔ وہ تو آدمی کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ کسی کی بھی بات کو غور سے سنتے ہیں۔ آپ بات کر رہے ہوں اس وقت وہ محض جسمانی طور پر ہی نہیں دماغی طور پر بھی حاضر ہوتے ہیں۔ کسی کو مکمل طور پر ملنا ہی سب سے اہم بات ہے۔ آدمی وہ ہے جس سے مل کر دوسروں کو خوشی محسوس ہو۔ اہمیت اس بات کی نہیں کہ ملاقات کے لئے کون کتنا وقت صرف کرتا ہے۔ ملاقات اس وقت معنی خیز ہوتی ہے۔ جب کسی سے مکمل طور پر ملا جائے۔
وارث علوی سے مل کر ایک مہذب اور شائستہ آدمی سے ملنے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تہذیب وشائستگی نے ان میں خودنمائی اور خود پسندی کی بجائے بے نیازی اور انکساری پیدا کی ہے۔ وہ شگفتہ مزاج اور خوش گفتار شخص ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ گھنٹوں اور پہروں باتیں کی ہیں۔ ان کے یہاں بات سے بات نکلتی ہے وہ برابری کی سطح پر بے تکلف انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ مخاطب کو Penetrate کرتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں بغور سنتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو زیر بحث موضوع کے نئے پہلو اجاگر کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی الجھنوں میں گرفتار ہو اور ان سے ملے تو اسے مشورے دیتے ہیں غمگساری کرتے ہیں چاہے اس کے دکھوں کا مداوا نہ کر سکیں۔ ان کی باتیں دکھے ہوئے دلوں کے زخم پر مرہم رکھتی ہیں۔ وارث علوی ہنستے بہت ہیں دوسروں پر کم اپنے آپ پر زیادہ۔ قہقہے لگاتے ہیں اور یہ قہقہے اتنی تیزی سے سننے والوں کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ وہ بات کی اصلیت اور اہمیت کا اندازہ لگا نہیں سکتا۔ جب وہ مذاق کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مذاق انہوں نے نہیں جس شخص سے باتیں کر رہے ہوں اس نے کیا ہو۔ جیسے مخاطب خود خوش طبع شخص ہو۔ وارث علوی ہر شخص میں دلچسپ لیتے ہیں لیکن اس شخص میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جس کا تعلق کتابوں اور رسالوں سے ہو۔ اکثر پوچھتے ہیں آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟ کیا لکھ رہے ہو؟ نئی کتابیں لائیں ہوں تو وہ دکھاتے ہیں۔ نیا پڑھا ہو تو اس کی باتیں کرتے ہیں۔ کس کتاب میں کیا پڑھا کیا بہت پسند آیا کون سی کتاب میں کیا لکھا ہے کون سی کتابوں کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ ان سب باتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان کی گفتگو کا دائرہ مختلف موضوعات پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ادبی موضوعات پر عالمانہ انداز میں رائے پیش کرتے ہیں فلسفہ سیاست اور تہذیب کے متعلق عالمانہ رائے پیش کرنے کے بجائے سوالات اٹھاتے ہیں۔ اور اپنے مخاطب کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تاریخ اور مذہب بھی ان کے مطالعہ کے مرغوب موضوعات رہے ہیں۔ مذہب میں تشکیک ان کا مقدر تھا اور آج بھی ہے۔
تشکیک ان کے لئے وادی سرسبز نہیں تو دشت پرخار بھی نہیں۔ ایک ذہنی اور فکری حالت ہے جس سے ہم آہنگ ہونے میں انہیں کسی بے پناہ روحانی اضطراب سے گزرنا نہیں پڑتا۔ مذہب کے نام پر انسان نے انسان کے ہاتھوں جو سلوک کیا ہے اس نے ان کے لئے تاریک کو ایک بھیانک خواب اور مذہب کو ایک استحصالی ادارہ بنادیا ہے۔ خیر بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ اگر دوران گفتگو بحث کی نوبت آجائے تو ان کی یہ شعوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کی رائے پر کسی اور کی رائے غالب نہ آجائے۔ اسی لئے اپنی بذلہ سنجی سے مخاطب کے دلائل کو چٹکیوں

میں اڑا دینا بھی جانتے ہیں۔ اپنی بات کو اہم بنا کر مخاطب کی اہم بات Over Simplify کرنے کے گر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وارث علوی اپنی ذہانت، علم اور قابلیت کے باوجود چھوٹے لوگوں کو یہ احساس نہیں دلاتے کہ وہ چھوٹے لوگ ہیں۔ جب کوئی نااہل ان سے ملتا ہے تو نہ وہ اس کی ذاتی نااہلیت کا احساس دلاتے ہیں اور نہ ہی اپنی قابلیت کا رعب گانٹھتے ہیں۔

کسی بھی قسم کے وسوسہ کے بغیر اور خالص خوشی کے زندہ رہنے والے انسان میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ جب آدمی خود ہو کر باتیں کرتا ہو اور خوشی کے ساتھ زندہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے اپنے مسائل نہیں ہیں۔ لیکن وارث علوی یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسائل کے حل کا ایک ہی راستہ ہے کہ زندگی کو سچائی زندہ دلی اور بھرپور طریقے سے جینا چاہئے۔ گلہ شکوہ اور فریاد کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ محبت کرنے کی ان میں غضب کی طاقت ہے۔ جب وہ کسی کو اپنا سمجھتے ہیں تو اس کی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کے سکھ دکھ کا خیال رکھتے ہیں۔ میں یا میرے سوا دوسروں کے مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ اتنے انسانوں میں دلچسپی لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ۔مسائل میں دلچسپی لینا اور مسائل حل کرنے کے بعد اسے بھول جانا۔ کسی پر احسان کرنے کے بعد اسے فراموش کر دینا اس احساس کے بغیر کہ اس پر احسان کیا ہے۔ وارث علوی دوسروں کے مسائل میں تو دلچسپی لیتے ہیں لیکن اپنے مسائل کے متعلق بہت کم بات کرتے ہیں۔ اپنے نجی اور ذاتی پریشانیوں الجھنوں اور بیماریوں کا شاید ہی ذکر کرتے ہیں۔ کئی آدمی ایسے ہوتے ہیں جو گلہ شکوہ اور فریاد کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ دراصل یہ فریاد کرنے والے اشخاص غیر مطمئن لوگ ہوتے ہیں۔ رحم کے طلبگار ہوتے ہیں۔ کوئی ان کی طرف متوجہ ہو تو انہیں اچھا لگتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تمام پریشانیوں تکلیفوں اور مصیبتوں کو خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ترحم کے جذبات سے دور رہتے ہیں۔ ناگہانی تکلیف اور مصیبت کو قبول کر لیتے ہیں کیونکہ دوسروں سے رحم کی طلب کرنا ذات کی توہین ہے۔ جسمانی یا ذہنی پریشانی کا برسرِ عام نیلام نہیں کرنا چاہئے۔ افسردہ چہرہ لئے پھرنے سے زندگی اور بھی الجھتی ہے۔ خالص خوشی اور مسرت سے اس کا مقابلہ کیوں نہ کیا جائے۔ کئی آدمیوں میں خودداری ہوتی ہے۔ اول درجہ کی خودداری وارث علوی انہی لوگوں میں سے ہیں۔ غضب Will Power کے آدمی ہیں۔ گمبھیر سے گمبھیر اور موذی بیماریوں میں مبتلا ہوئے لیکن انہوں نے شاید ہی اپنی بیماریوں کا ذکر کیا ہو۔ ان کی عیادت کے لئے گئے ہوں اور بیماری کی بات نکل جائے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ "اس جسم نے بہت کچھ بھوگا اب یہ بھی Enjoy کرے گا۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا اس کے بجائے جو کچھ ملا بے پناہ ملا اس کی خوشی ہے۔ دوسرا کچھ ملا یا نہ ملا انسانی زندگی ملی اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ " کسی چیز کا وسوسہ نہ ہوا اور اسی کا نشہ ہوا سی میں زندگی کی معنویت ہے۔

وارث علوی باغ و بہار طبیعت کے آدمی ہیں۔ وہ پرتصنع اور پرتکلف محفل کے قائل نہیں ہیں۔ وہ سنجیدہ اور گمبھیر محفل کی بجائے بےتکلف محفل زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی موجودگی سے سنجیدہ محفل بےتکلف محفل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس قسم کی بذلہ سنجی ان کی تحریروں میں ہے ان کی گفتگو بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔ جیسے وہ اپنی تحریروں میں بذلہ سنج ہیں ویسے وہ خود ہیں۔ وہ محفل میں ہلکی پھلکی اور دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ بات میں مزاح کے پہلو نکالتے ہیں۔ فقرے کستے ہیں اور جب آپ بھی ان پر فقرے کسیں تو وہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ محفل میں اپنے ہر چھوٹے بڑے انسان سے باتیں کرتے ہیں۔ محفل میں شریک ہر کسی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اس کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں۔ ہر شخص کو اظہار خیال کا موقع دیتے ہیں اور کسی کو بھی یہ پریشانی نہیں ہوتی کہ صرف انہی کی باتیں سننا پڑ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ باتیں کرتے وقت ان کی شخصیت رکاوٹ نہیں بنتی۔ وہ اس محفل میں بوریت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ان کی حیثیت محض Passive Listener کی ہو۔ اور وہ بھی یہ نہیں چاہتے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں Passive Listener کی طرح سنتے رہیں۔ وارث علوی اپنی تحریروں سے کہیں زیادہ شگفتہ اور دلچسپ صحبت میں ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بذلہ سنجی کو اپنی تحریروں سے زیادہ محفلوں میں بے دریغ لٹایا ہے۔

زندگی میں کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جنہیں سنتے ہی دل جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ میرے لئے ایسا ہی ایک نام وارث علوی ہے۔ وارث علوی میرے بزرگ دوست ہیں۔ مجھے وہ پسند ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ادیب نقاد یا دانشور ہیں۔ میرے اور ان کے تعلقات جبکہ وہ نقاد نہیں تھے اس سے قبل کے ہیں۔ ہماری قربت اور دوستی کو برسوں بیت گئے اور خدا کے فضل سے یہ دوستی گہری اور مضبوط ہوتی رہی ہے۔ دوست کا ایک ہی مطلب ہے دوستی۔ دوستی کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ دوست کی صحبت میں صرف بات کی اہمیت نہیں ہوتی الفاظ نہ ہوں تو خاموشی بھی گونجتی رہتی ہے۔ گفتگو اور خاموشی کی جو عزت کرے وہ دوست۔ دوست وہ جس کی صحبت میں دکھ سکھ کی باتیں خود بخود نکلتی رہیں۔ دوست وہ جس سے مل کر مسرت کی انتہا کا احساس ہو اور دکھ ہلکا ہو جائے۔ کسی بھی مقصد کے بغیر ملنا بغیر کسی وجہ کے معمولی باتوں میں ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں۔ ایسے دوست کہاں ہیں جن سے ہم ربط کی باتیں کریں اور جو ہر پل ہمارے ساتھ جئیں۔ کہاں ہیں ایسے دوست جن سے مل کر Holiday of mind کا احساس ہو۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے وارث علوی جیسا دوست ملا اور مجھے ان کے منفرد ذہن اور قد آور شخصیت کی قربت میسر ہوئی۔

جب بھی دیکھا تجھے عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

(احمد ندیم قاسمی)

''حقیقت اور تخیل''

ش۔ک۔نظام

(جودھ پور، بھارت)

برصغیر کے ناقدین کا اگر سخت سے سخت انتخاب کیا جائے تو بھی وارث علوی کا نام اس میں شامل ہوگا۔حیرت ہے کہ اس کے باوجود ان کی تنقید نگاری پر ہمارے پاس ایک بھی مضمون نہیں ہے۔مغربی اور دوسری مشرقی زبانوں کو تو چھوڑیے اگر ہماری علاقائی زبانوں میں بھی ایسی تنقیدی تحریریں موجود ہوتیں تو اب تک ان پر دو چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہوتیں۔اردو میں تو ایسا ہوتا ہی ہے !بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا ہمیں اس پر غور نہیں کرنا چاہیے؟ اگر وارث علوی کی تنقید سنجیدگی سے غور کرنے کی چیز نہیں ہے تو ان کی کتابوں کو اتنے شوق سے کیوں پڑھا جاتا ہے؟ آخر ان میں ایسا کیا ہے جو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے؟ میرا موضوع مجھے ان اور ایسے سوالات کی تفصیل و تفتیش میں جانے کی اجازت نہیں دیتا لیکن بار بار یہ سوال میرے ذہن میں سر اٹھاتا ہے۔اس لیے بھی کہ میری محدود معلومات کے مطابق، اب تک وارث علوی کے تقریبا ڈیڑھ درجن مجموعہ ہائے مضمون شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرے درجے کا مسافر(۱۹۸۱)، اے پیارے لوگو(۱۹۸۱)،حالی مقدمہ اور ہم (۱۹۸۳)، خندہ ہائے بے جا(۱۹۸۷)، کچھ بچالایا ہوں (۱۹۹۰)، پیشہ تو سپہ گری کا بھلا (۱۹۹۰)، جدید افسانہ اور اس کے مسائل (۱۹۹۰)، فکشن کی تنقید کا المیہ (۱۹۹۲)، منٹو: ایک مطالعہ (۱۹۹۷)، اوراق پارینہ(۱۹۹۸)، بورژ واژی بورژ واژی (۱۹۹۹) ،لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر (۲۰۰۰)، ادب کا غیر اہم آدمی (۲۰۰۱)،منتخب مضامین پاکستانی اشاعت (۲۰۰۰)،حالی مقدمہ اور ہم (۲۰۰۰) میں پاکستان میں شائع ہوئی۔انہوں نے ساہتیہ اکادمی کے لیے راجندر سنگھ بیدی (۱۹۸۹) اور سعادت حسن منٹو(۱۹۹۵)پر دو مونوگراف لکھے۔ان مجموعوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث علوی نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں۔نظریاتی مضامین میں انہوں نے ادب اور سیاست، ادب اور سماج، فسادات اور ادب، فاشزم وغیرہ پر استدلال کے ساتھ بحث کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب ادب مرکز سے ہٹ جاتا ہے تو ادب کے نام پر کیسی کیسی غیر ادبی باتیں ہوتی ہیں۔ان مضامین میں انہوں نے کمٹ منٹ اور ترقی پسند تحریک کی اس ذہنیت کو نشانہ بنایا ہے جس نے ادب کی جگہ آئڈیولوجی کو مرکز میں رکھا تھا۔ان کے ان مضامین نے جدیدیت کو ادب میں پاؤں جمانے میں بڑی مدد کی۔نظریاتی مباحث کے بعد انکی دلچسپی فکشن کے آرٹ سے ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے جب افسانے کو دوسری اصناف ادب سے کمتر قرار دیا اور ہر طرف خاموشی نیم رضا کے مصداق سناٹا چھا گیا، تب وارث علوی ہی نے وہ سناٹا توڑا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ زمان و مکاں کی قید کے باوجود افسانہ اتنا اسفل و ابتر نہیں ہے جتنا کہ بتایا جا رہا ہے۔انہوں نے منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، ضمیر الدین، عصمت چغتائی، کرشن چندر، بلونت سنگھ، اوپندر ناتھ اشک، رام لعل وغیرہ پر جس پیار سے لکھا ہے وہ فکشن کے آرٹ سے عشق کیے بغیر ناممکن ہے۔افسانے کے آرٹ سے وارث علوی کا عشق اندھا نہیں ہے بلکہ یہ آرٹ کے اعجاز کا اعتراف اور عرفان سے پیدا ہونے والا عشق ہے۔افسانے کے علاوہ انہوں نے شاعروں پر بھی بھرپور مضامین لکھے ہیں۔ان میں سودا، غالب، ن۔م۔راشد، مجاز، جاں نثار اختر، باقر مہدی، اختر الایمان، محمد علوی، ندا فاضلی وغیرہ پر جو مضامین لکھے ہیں، وہ ان شعرا کو سمجھنے کے لیے ایک نئی سمت دیتے ہیں۔شاعروں کے علاوہ انہوں نے تنقید پر بھی تنقید لکھی ہے۔مثلا آل احمد سرور کی دو کتابیں:" نظر اور نظریے "اور "مسرت سے بصیرت تک" میں انہوں نے سرور صاحب کی تنقید کا محاکمہ اور محاسبہ کیا ہے اور ان کی تحدید کی نشاندہی کی ہے تو شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب "افسانے کی حمایت میں "پر " فکشن کی تنقید کا المیہ " لکھی ہے اور "شعر، غیر شعر اور نثر "پر طویل تبصرہ کیا ہے۔ان تحریروں کو ان کے اتفاق و اختلاف کی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔تبصرے میں جہاں انہوں نے فاروقی کی جی کھول کر تحسین و تعریف کی ہے، وہیں ان کے محاکموں کی تنقیص اور محاسبوں کی تنکیر بھی وضاحت سے کی ہے۔"ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری "میں انہوں نے وزیر آغا کی نظریہ سازی اور عملی تنقید کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے اختلافات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تو شمیم حنفی کی کتاب "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس "پر لکھتے ہوئے انہوں نے شمیم حنفی کے علم کا اعتراف کیا ہے لیکن یہ بھی دکھایا ہے کہ علم کیوں تنقید بننے سے رہ گیا۔ان مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ انہوں نے اس طرح کے مضامین میں اردو کے اہم اور اپنے معاصرین ناقدین کے اہم کارناموں سے بحث کی ہے۔

جس نقاد نے مختلف موضوعات پر ایسا اور اتنا لکھا ہو اس کا چند صفحات میں احاطہ کرنا ناممکن حد تک دشوار ہے۔پھر انہوں نے ہر موضوع پر لکھتے ہوئے اس کے تمام سیاق و سباق کی بھی چھان پھٹک کی ہے اور مذکور موضوع کے تناظر میں تنقید کے تفاعل کی بھی وضاحت کی ہے۔مثلا متعدد مقامات پر انہوں نے بھی ہر نقاد کی طرح، تنقید کیا ہے، کا جواب ڈھونڈنے بتانے کی کوشش کی ہے۔تو دوسرے تنقید نگاروں کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تنقید کیا نہیں ہے؟ اس عمل میں انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہماری تنقید کی تحدید کیا ہے اور اچھی اور بری تنقید میں تفریق کیا ہے؟ مثلا انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تنقید بت شکنی کا عمل ہے۔تو اچھی اور بری تنقید میں تفریق

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بری تنقید رسومیات میں قید ہوتی ہے اور اچھی تنقید رسومیات کو توڑتی ہے۔ "دوسری جگہ لکھا ہے کہ "اچھی تنقید فکر انگیز ہوتی ہے، خراب تنقید اشتعال انگیز۔ اچھی تنقید دانشورانہ سوال اٹھاتی ہے۔ خراب تنقید احمقانہ۔ "ان کے نزدیک تنقید تو رابطہ ہے، یعنی وہ توڑنے کا نہیں، جوڑنے کا عمل ہے۔ ان کے الفاظ ہم آگے دیکھیں گے۔ پھر ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ تنقید تخریب کے مترادف نہیں ہے۔ اگر وہ بقول وارث علوی بت شکنی کا عمل ہے تو کعبہ سازی کا بھی تو عمل ہے۔ ادھورا دیکھنا غلط دیکھنا بھی ہے۔ تخلیق تجربہ بھی ہے اور تجربہ تبدل و تغیر سے بھی عبارت ہے۔ اگر تخلیق تجربہ، تبدل اور تغیر ہے تو اس کی تفہیم، تشریح اور تعبیر بھی مروج و مقبول معیار سے کیسے ممکن ہوگی؟ تخلیق کو محض روایت کی روشنی میں دیکھنا بھی صحیح نہیں ہے اور اسے صرف نئے معیار سے دیکھنا پرکھنا بھی صحیح نہیں۔ والیری نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ترقی اور روایت انسانی نسل کے دو بڑے دشمن ہیں۔ "بحر الفصاحت "ہی کی بنیاد پر میراجی اور راشد کا مطالعہ ممکن نہیں لیکن ہمارے لیے تو نہ "بحر الفصاحت "بے کار، نہ میراجی اور راشد۔ ادب میں دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔ اس لیے ان کے ایسے جملوں سے یہ رائے قائم کر لینا کہ وہ انہدام کے عاشق ہیں غلط ہے۔ آج حالی کا جو مقدمہ اردو تنقید میں اساسی اہمیت رکھتا ہے، جب وہ منظر عام پر آیا تب کیا ہوا تھا؟ کیا مقدمہ کے معاصرین نے اسے بھی متنازع فیہ نہیں کہا تھا؟

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات تو وارث علوی کی تنقید اور اس کی تفہیم کی ہے۔ کسی بھی تنقید نگار کی تفہیم کا سب سے معتبر وسیلہ اس کی تحریر ہے۔ چنانچہ ہمیں بھی وارث علوی کی تحریروں ہی سے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کا تنقیدی عمل کیا ہے؟

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب "شعر، غیر شعر اور نثر "پر تبصرہ کرتے ہوئے وارث علوی نے لکھا ہے:

" مجھے حالی کا نظریۂ شعر، جو بنیادی طور پر اخلاقی ہے، بہت زیادہ پسند نہیں، اس کے باوجود میں حالی کو اردو کا سب سے بڑا نقاد سمجھتا ہوں۔ کسی نقاد کے نظریے کو قبول نہ کرنے کے باوجود اسے بڑا نقاد سمجھنے کا مطلب ہے اس کی فکر و نظر کی اس طاقت کو شناخت کرنا جو اسے اس کی نظریاتی حدود سے بلند کرتی ہے۔ حالی پر میں نے جو طویل مضمون لکھا تھا، اس کا مقصد اردو تنقید میں حالی کا مقام متعین کرنا نہیں تھا بلکہ یہ دیکھنا تھا کہ اخلاقی نظریۂ شعر کی طرف میری ذہنی کشمکش کی نوعیت کیا ہے۔ ایک معنی میں دیکھیے تو میں حالی کے مسائل نہیں، بلکہ حالی نے جو مسائل میرے لیے پیدا کیے تھے، انہیں کو حل کر رہا تھا۔ مضمون میں جس چیز پر میری گرفت مضبوط تھی وہ حالی کی تنقید نہیں، بلکہ خود میرے Dilamma کے دوسینگ تھے۔"

یہ اقتباس ان کے تنقیدی عمل کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ حالی کے نظریۂ شعر، جو بنیادی طور پر اخلاقی ہے، کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اس کے باوجود حالی کو اردو کا سب سے بڑا نقاد سمجھتے ہیں۔ جملہ میں تضاد ہے۔ لیکن جب سب بتاتے ہیں تو جواز بھی سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی فکر و نظر کی اس طاقت کی شناخت جو حالی یا نقاد مذکور کو نظریاتی حدود سے بلند کرتی ہے۔ پھر یہ اعتراف کہ وہ طویل مضمون حالی مقدمہ اور ہم: جو صفحات کی کتاب ہے حالی کے مقام کو متعین کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذہنی کشمکش کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی تنقید خود تفہیمی کا عمل ہے۔ آگے کہتے ہیں میں اس مضمون کے وسیلے سے حالی کے مسائل حل نہیں کر رہا تھا بلکہ مقدمہ نے جو مسائل قاری کے لیے پیدا کیے، انہیں حل کرنے کی کوشش ہے۔ یعنی تنقید کسی مسئلہ کا حل نہیں بلکہ حل کرنے کی کوشش ہے۔ ادب اور اخلاق کے رشتوں کے ڈائیلمہ (Dilamma) پر گرفت بھی اسی بات کا اعلان ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس موضوع کے حوالے سے اپنے مسائل (ذاتی نہیں ادبی اور نظریاتی) کو حل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جس نقاد کی ادب سے رشتوں کی نوعیت ایسی ہو، اس کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ مخاصمت میں مضمون لکھتا ہے یا اس کا طریقہ کار معاندانہ ہے، صحیح نہیں۔ ایک سچا اور کھرا قاری کسی تخلیق یا تجربہ سے اور کس طرح مکالمہ کرتا ہے؟ ایک قاری احساس کی سطح پر ہی تخلیق سے رشتہ قائم کرتا ہے؟

تنقید نگار کے تفاعل کا تعین کرتے ہوئے ڈبلو۔ ایچ۔ آڈن نے پوچھا ہے کہ نقاد کون ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ جو میرے لیے مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک یا زائد خدمات انجام دے:

۱۔ وہ مجھے ان مصنفین یا تصانیف سے متعارف کرائے جن سے میں اب تک ناواقف تھا۔

۲۔ وہ مجھے اس بات کو باور کرائے کہ میں نے مصنف مخصوص یا تصنیف کی قدر سنجی میں کوتاہی برتی، کیوں کہ میں نے اسے خاطر خواہ توجہ سے نہیں پڑھا۔

۳۔ وہ مجھے مختلف ادوار کے ادب پاروں اور تہذیبوں کے تعلق کو سمجھنے میں مدد کرے جنہیں میں اپنی کم علمی کے باعث نہ تو جانتا تھا، نہ جان سکتا تھا۔

۴۔ وہ میرے سامنے کسی فن پارے کا ایسا مطالعہ (Reading) پیش کرے جو فن پارے کی تفہیم میں مدد و معاون ثابت ہو۔

۵۔ فن کارانہ تخلیقی عمل (Making) کو منور کرے۔

۶۔ فن کے زندگی، سائنس، معاشیات، مذہب، اخلاقی اقدار وغیرہ کے رشتوں پر روشنی ڈالے۔

آڈن کہتا ہے کہ پہلے تین مطالبوں کی تکمیل کے لیے Scholarship درکار ہے جب کہ آخری تین چیزیں Superior Knowledge نہیں بلکہ Superior Insight کا مطالبہ کرتی ہیں۔

آڈن کے آدرش ناقد کا جو تصور ہم نے دیکھا، کیا وارث علوی ان میں سے بیشتر کی تکمیل نہیں کرتے؟ جن لوگوں نے ان کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا ہے

یعنی محض حظ حاصل کرنے کے لیے نہیں پڑھا یا جوان کی تحریروں کو اپنے معاصرین کی بھد خراب ہوتے دیکھنے کے لیے نہیں پڑھتے، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ انہوں نے محض تنقید کو دلچسپ بنانے کے لیے یہ اسلوب اختیار نہیں کیا ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں اسے شاید اسی طرح کہا جا سکتا ہے۔ پھر ویسے بھی تنقید کا کوئی طے شدہ اسلوب تو ہوتا نہیں ہے کہ آپ اس طرح لکھیں گے تو تنقید ہوگی، ورنہ ایک تحریر محض ہوگی۔ بنیادی چیز تو تجزیہ ہے۔ اگر وہ نہیں تو پھر سنجیدگی اور نام نہاد بردباری کا بھی کیا مطلب ہوگا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ انہوں نے متعدد مقامات پر تنقید کی تعریف کی ہے، اس ضمن میں ان کا یہ قول دیکھیے:

" تنقید رابطہ ہے قاری اور قاری کے درمیان، اپنی آخری شکل میں تنقید گفتگو ہے اہل علم کی اہل علم سے، اہل دل کی اہل دل سے۔ خوش طبعی ہے یاروں کے بیچ، بے تکلفی ہے احباب کے درمیان، بحث و تکرار ہے ہم مشربوں سے، چھینا جھپٹی ہے مخالفوں سے، پھکڑ اور ٹھٹھول ہے حریفوں سے۔"..

جو تنقید نگار تنقید کو رابطہ مانتا ہو، گفتگو جانتا ہو، اس سے کلاس روم کے آداب و اطوار کی توقع تو بے معنی ہے۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تنقید کی زبان نہیں۔ کیوں نہیں ہے؟ اگر تنقید مختلف مدارج و مذاق و مزاج کے لوگوں سے گفتگو یا رابطہ کا وسیلہ ہے تو یہ زبان کیوں تنقیدی زبان نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ تنقید کی زبان نہیں یعنی یہ تنقید نہیں کیوں کہ ادب کا ہر فارم پہلے زبان ہے بعد میں کچھ اور، تو ہم اسے کیا سمجھ کر پڑھ رہے ہیں؟ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ ہم مختلف مزاق، معیار اور مدارج کے احباب سے ان کی زبان میں گفتگو کریں، ویسے ہی یہ کہاں ضروری ہے کہ آپ اور ہم لندن کے پارک یا منبر پر بیٹھے، بغیر اس بات کی فکر کیے کہ کوئی ہماری بات سن سمجھ بھی رہا ہے کہ نہیں، بولتے چلے جائیں۔ پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ وہ تخلیق اور تنقید میں صاف فرق کرتے ہیں اور انشائیہ بہر حال تخلیق ہے وہ تنقید نہیں انشائیہ لکھتے ہیں" چند احباب کا یہ خیال ہے وارث علوی نے لکھا ہے " تخلیق کا تجربہ جمالیاتی ہے تنقید کا دانشورانہ "۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ تجربے کی سطح پر دونوں میں تفریق کرتے ہیں۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ تنقید ایک دانشورانہ تجربہ ہے جس کا اظہار " گفتگو " تحریری یا تقریر کے توسط سے ہوتا ہے۔ وارث علوی بنیادی طور پر قاری ہیں۔ ادب کے عاشق صادق، ان کی کوشش ہے کہ مطالعہ سے مصنف اور قاری کے مابین رشتہ قائم ہو، چنانچہ لکھتے ہیں:

''بڑے ادیبوں سے رابطہ عالمی کانفرنسوں میں قائم نہیں ہوتا۔ تنہائی اور تخلیہ میں ان کتابوں کے پرسکون مطالعہ کے ذریعہ ان سے شناسائی حاصل کی جاتی ہے۔ سنجیدہ مطالعہ کیلئے ضروری ہے کہ ذہن کھلا ہو، غیر آلود ہو، بیدار خلاق ہو، سفید کاغذ پر تو سیاہ حروف ہی بکھرے ہوتے ہیں، لیکن پڑھنے والے کا ذہن ان حروف سے ایک پوری کائنات تخلیق کرتا ہے۔"

ابھینو گپت (Abhinavagupta) نے ایسے قاری ہی کو تو قاری کہا ہے۔ ایسے میں مطالعہ مصنف سے مکالمہ ہی نہیں بلکہ اس کے تجربات احساس اور اظہار دونوں میں شریک ہونا ہے۔ تجربات میں شرکت تب تک ممکن نہیں جب تک آپ تخلیق کے آگے ارادت و انکسار سے پیش نہ ہوں۔ رگ وید میں اسی لیے تو کہا ہے کہ فن کی دیوی صاحب ذوق کے آگے ہی اپنے اسرار کا انکشاف کرتی ہے۔ میر نے بھی شاید ایسی ہی کسی کیفیت میں کہا تھا۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اگر قاری نقاد بھی بنیادی طور پر تو قاری ہی ہوتا ہے خود ہر جا جہانِ دیگر کا دیدار نہ کرے تو آڈن کی بتائی ہوئی دوسری خدمت کو کیسے سرانجام دے گا۔ وارث علوی نے قاری کے اوصاف میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اس میں تخلیقِ مکرر کی صلاحیت ہو۔ چوں کہ وہ تخلیق کے عاشق ہیں اس لیے ان کی تنقید تخلیق کی طرف دار ہے۔ وہ ادب کے ساتھ نقاد کے آمرانہ رویے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تنقید کو قاضیوں کا فرمان تکفیر نہیں ماننے کا بھی یہی سبب ہے۔ ادب میں اختلاف کو تو وہ پسند کرتے ہیں لیکن انتہا پسندی سے انہیں نفرت ہے۔ وہ Prejudices کے بغیر تخلیق یا مصنف سے مکالمہ کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

" مطالعہ ذہن کی اعلیٰ ترین سرگرمی ہونے کے سبب حرکی اور جدلیاتی ہے، فکر انگیز، بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے۔ اسی لیے مطالعہ ایک مفکرانہ اور ناقدانہ عمل ہے۔"

اختلاف رائے کے متعلق لکھتے ہیں:

" اختلاف رائے نہ ہو تو تنقید ایک ایسا اکھاڑا ہے جس میں ورزش سب کرتے ہیں، کشتی کوئی نہیں لڑتا ہے، کمزور نقاد کمزور شاعروں پر برستا ہے۔ طاقتور نقاد کمزور شاعروں کا ذکر رواداری سے کرتا ہے۔ ان پر اس کی کتاب کتبہ ثابت ہوتی ہے۔"

وارث علوی کی کتاب " فکشن کی تنقید کا المیہ، جدید افسانہ اور اس کے مسائل "اور مجاز لکھنوی پر لکھا ان کا مضمون وغیرہ تحریریں ان کے اختلاف رائے ہی کا اظہار ہے۔ یہ ماننا بالکل غلط ہے کہ انہوں نے ایسے مضامین اور کتب اپنی پسند پر ہوئے حملے کے جواب میں لکھیں۔ دراصل یہ تحریریں ایک قاری کی دوسرے قاری سے عالمانہ گفتگو ہے، جو اختلاف کا اظہار بھی ہے اور آڈن کے بتائے گئے دوسرے اور چوتھے مطالبہ کی تکمیل بھی ہے۔ یہ قاری کا احتجاج بھی ہے، جو اپنے معاصر قاری سے یہ کہتا ہے کہ آپ نے تخلیق کو خاطر خواہ توجہ سے نہیں پڑھا، یا آپ نے اسے جس طرح پڑھا ہے وہ طریقہ تخلیق کے طلسم نہیں کھولتا بلکہ تخلیق کو مجروح کرتا ہے اور قاری کی نظر میں اس کے اعتبار کو کم کرتا ہے۔ پھر تخلیق کی تفہیم کیلئے آپ نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے وہ ادب فہمی کا واحد راستہ نہیں، اس کے علاوہ بھی بہت سے ممکن راستے ہیں مثلاً ایک تو وہی ہے جو

میں بتا رہا ہوں۔ انہیں ناقدین سے شکایت ہے تو یہی ہے کہ "وہ ادب کے پرشوق قاری نہیں ہیں۔ "وہ لکھتے ہیں:

"ان کی تنقیدوں میں علم اور اکسپر ٹائز بھی ہوتی ہے اور محنت اور مشقت بھی لیکن وہ بصیرت نہیں ہوتی جو نقاد کو ادب کے باشعور و باذوق مطالعہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ان کے مضامین غیر تخیلی اور غیر تخلیقی ہوتے ہیں۔"

شاید یہی سبب ہے کہ " فکشن کی تنقید کا المیہ "میں وہ لکھتے ہیں "اردو تنقید ابھی بھی منتظر ہے اس نقاد کی جو عظیم ماں کا روپ ہو۔ "اسی لیے انہوں نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ:

"ہماری تنقید کا المیہ بھی یہی ہے کہ ہم پہلودار نقاد پیدا نہیں کر پائے۔ سرور صاحب سے فکشن پر تنقید نہیں سنبھلی۔ کلیم الدین احمد شاعری اور تنقید کے دائرے سے باہر نہیں نکلے۔ افسانوں اور ناولوں پر ان کے یہاں ایک بھی مضمون نہیں۔ ممتاز شیریں شاعری اور تنقید سے بالکل بے بہرہ رہیں۔ احتشام حسین شاعری اور تنقید پر اچھا لکھ گئے لیکن فکشن کی طرف متوجہ ہوئے تو ان پر تھکن طاری ہو چکی تھی اور ان کے مضامین محض سرسری جائزے بن کر رہ گئے۔ فاروقی کی زیر تبصرہ کتاب بھی بتاتی ہے کہ فکشن ان کے بس کا روگ نہیں۔"

یہ ساری باتیں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہماری تنقید سے وارث علوی کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ اس عظیم ماں کے منتظر ہیں جو ادب کی حد تک گور کی کی ماں سے بھی بڑی ہو۔ جو ادب کی ہر صنف اور شعبہ کی پرورش، پرکھ اور پہچان کرائے اور یہ ساری چیزیں ادبی انا چھوڑے بغیر ممکن نہیں۔ انا اور عشق میں دوستی ممکن نہیں۔ ادب عشق چاہتا ہے۔ اسے انا پسند نہیں۔ وہ علم نہیں عرفان چاہتا ہے۔ وہ ادب کو گفتگو مانتے ہیں اس لیے ادب کی سماعی صفات کے بھی معترف ہیں۔ افسانے کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ:

"افسانہ بنیادی طور پر Social Gossip کا آرٹ ہے ۔۔ افسانہ کا آرٹ بنیادی طور پر زندہ انسانوں اور ان کے تعلقات اور مسائل میں کانا پھوسی کرتی ہوئی عورتوں کی طرح دلچسپی لینے کا آرٹ ہے Social Documentation کے بغیر افسانہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔"

رابطہ ان کا نصب العین ہے۔ رابطہ کی کئی شکلیں ہیں وہ گفتگو یا Gossip کو مقدم مانتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ادب کے بصری اوصاف سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا پورا اسلوب اسی مسئلہ کا احاطہ کرتا ہے وہ رابطہ چاہتے ہیں لیکن تنہائی اور تخلیہ میں فرق کرتے ہیں۔ انہیں جدید افسانہ نگاروں کے مقابلہ میں منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت، قرالعین حیدر وغیرہ زیادہ پسند آتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے وہ تجزیے دیکھئے جو انہوں نے منٹو اور بیدی کے افسانوں پر کیے ہیں۔ "بابو گوپی ناتھ "پر ان کی کتاب "منٹو: ایک مطالعہ " میں دو مضامین ہیں۔ اسی طرح بیدی کے افسانوں کی اسطور سازی، تہذیب اور افسانوی روایت کو سمجھنے اور سمجھانے کا جو کام وارث علوی نے کیا ہے، وہ اردو کے کس نقاد نے کیا ہے؟ بعض احباب کا خیال ہے کہ افسانے پر ان کا جتنا کام ہے وہ ردعمل ہے۔ میرا انہایت ادب سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا تنقید تخلیق پر ردعمل نہیں ہے؟ پھر دیکھا تو یہ جانا چاہیے کہ اس ردعمل سے سامنے کیا آیا ہے؟ کیا ان تجزیوں کو پڑھ کر مذکورہ افسانہ کو مکرر پڑھنے کی خواہش بیدار نہیں ہوتی؟ اگر ہوتی ہے تو نقاد کا کام تو ہو گیا نہ !

وارث علوی کے اختلاف کی مثالیں تو ہم نے دیکھیں، اب ان کی وہ مثالیں بھی ملاحظہ کر لیں جو انتہا پسندی کے خلاف ہیں۔ اپنے مضمون " کمٹ منٹ "میں وہ لکھتے ہیں:

"ادب کا موضوع تجریدی تصورات نہیں بلکہ تجربات اور حقائق ہوتے ہیں سوشلزم ادب میں ایک NORM اور ایک قدر کے طور پر کام آ سکتا ہے لیکن موضوع اور مواد کے طور پر کام نہیں آ سکتا۔"

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ادب حقیقت کا تخلیقی اور تخیلی بیان ہوتا ہے۔"

اور یہ مضمون اس جملہ پر ختم ہوتا ہے کہ "اگر فن کار کو کمٹ منٹ کی ضرورت پڑی بھی تو یہ کمٹ منٹ سوائے فن کے اور کس کے ساتھ ہو سکتا ہے؟" مجھے یہاں ہندی کے بڑے کوی اگیئے کا جملہ یاد آتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اگر مٹنا ہی ٹھہرا تو کم مٹنا کیوں، سب مٹیے۔ کم مٹ (Commit) سب مٹ (Submit) سے جو بات پیدا ہوئی ہے وہی تو وارث علوی چاہتے ہیں۔ فن کار کے لیے حقیقت کیا ہے؟ وارث کہتے ہیں:

"فن کار کے لیے تو وہی حقیقت ہے، جسے وہ تخیل کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے .. فن کار حقیقت کا ادراک اپنے وجدان سے کرتا ہے اور فن کار کے لیے کسی بھی مخصوص حقیقت کے وجدانی ادراک کا شعلہ صرف ایک بار بھڑکتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے سیاہ پوش ہو جاتا ہے۔"

ترقی پسند ناقدین کے تمام مطالبات کو رد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"فن کار کی اگر کوئی سماجی ذمہ داری ہو سکتی ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ بھیڑ، پبلک، عوام، عام آدمی کے ہاتھوں آرٹ کے Vulgarization کی تمام کوششوں کی مخالفت کرے۔ اپنے تخلیقی تجربے کے آزادانہ تجسس کے اختیار پر زور دے۔"

فن اور فن کار سے مطالبات کی فہرست جب شاعری کی شرح بننے لگتی ہے اور جب ادب کا معیار محض "عوام ہی کے لیے "ہونے لگتا ہے۔ جب آدمی کی خواہش یہ ہونے لگتی ہے کہ فن کار اس کی روٹی کپڑا اور مکان کے مسائل حل کرے۔ ریاست اسے اپنے آدرشوں اور منشور کے مبلغ کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے تو فن اور فن کار دونوں ہی انتہا پسندیوں کے حصار میں آ جاتے ہیں۔ پارٹی کی سوچ جب فن کار پر صلابت کرنے لگے تب؟ ترقی پسندی کا عاشق

وارث بغاوت کرتا ہے اور فن وفن کار کی طرف داری کرنے لگتا ہے۔ انقلابی کا Fanatic ہونا ضروری ہے جب کہ فن یا فن کار Fanatic نہیں ہوسکتا۔ وارث علوی کے وہ مضامین جو ترقی پسندوں اور "سب مرے سوا کافر" کی ذہنیت کے خلاف ہیں۔ وہ ان کا احتجاج ہے۔ انکار میں اٹھی ہوئی انگلی ہے۔ "ترقی پسند تنقید کا اسلوب" میں وہ لکھتے ہیں:

ترقی پسند تنقید کی بنیاد چند اعتقادات، مفروضات اور تصورات پر ہے جو ادب سے نہیں بلکہ ایک مخصوص فلسفے سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے جو ان کے ہم عقیدہ نہیں انہیں ترقی پسند یا تو اپنا دشمن سمجھتے ہیں یا اگر کشادہ دلی کا ثبوت دیں تو ناگوار دوست۔ ترقی پسند تنقید یا تو مبلغانہ ہے یا محاربانہ .. ادب اور زندگی کی تفسیر Dogmatic اور Partisan ہوتی ہے اور اسی سبب سے ترقی پسند، تنقید کے بنیادی عناصر یعنی آزاد فکری تفحص، معروضی تحقیق و تجزیہ اور تحلیل سے مبرا ہیں۔ حالانکہ تنقید ایک ایسی ذہنی سرگرمی ہے جس کی تعمیر نقاد کے عقائد کی بنیاد پر نہیں بلکہ ادبی حقائق کی بنیاد پر ہوتی ہے۔"

ترقی پسندوں سے ان کا تخالف جگ ظاہر ہے۔ لیکن اسے بھی انہدان سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ وہ انتہا پسندی کے خلاف ہیں۔ ان کا اختلاف انتہا پسندوں کے اس رویے سے ہے جس میں ادب اور ادیب کی حیثیت پر ہی استفہامیہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ ترقی پسندوں کے خلاف ہیں تو مجاز کے دفاع میں مضمون کیوں لکھ رہے ہیں؟ علی سردار جعفری کی کیوں تعریف کررہے ہیں؟ کرشن چندر پر کیوں لکھ رہے ہیں۔ منٹو تو خیر ترقی پسندوں کے لیے مطعون اور ملعون تھا۔ بیدی اور عصمت پر کیوں لکھ رہے ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف انتہا پسندی سے ہے، ترقی پسند ادب سے نہیں۔ بہ الفاظ دیگر ان کا اختلاف سرخیلوں کی غیر ادبی سرگرمیوں سے ہے، جنہیں وارث علوی "دھاندلی" اور "گھپلے" کہتے ہیں۔ رلکے نے نوجوان شاعر کو تنقید نہ پڑھنے کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ تنقیدی تحریریں طرف داری اور تعصب سے پر ہوتی ہیں۔ وارث علوی کی تنقید ان ناقدین کی طرف داری کو بے نقاب کرتی ہے۔ ان کے تعصّبات کو طشت از بام کرتی ہے۔ اس لیے لوگ ان سے محبت بھی کرتے ہیں اور ان سے خائف بھی رہتے ہیں۔ قربت اور دوری کی اس کشا کش میں ایک عجیب Love Hate Relationship ہے۔

وہ ترقی پسند تحریک کی انتہا پسندی کے سخت مخالف ہیں۔ اس لیے کہ وہ ادب کو مرکز میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آئیڈیولوجی کو نہیں۔ یہاں آئیڈیولوجی سے مراد محض کمیونزم نہیں ہے۔ وہ ہر اس نظریے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جو ادب کی مرکزی اہمیت سے انحراف کرتا ہے۔ اس لیے وہ ہر تجویزی تنقید کے خلاف ہیں۔ ان کی اس فکر میں کہیں کوئی ادغام نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

"ادب تخلیق کرنا ہے تو ادب کے اصولوں پر ہی تخلیق ہوگا اور ادب کا بنیادی اصول ہے، اس کے میڈیم کا مناسب استعمال۔ ادب کا میڈیم لفظ ہے اور لفظ آواز بھی ہے، آکار بھی اور معنی بھی ہے۔ لفظ کے ان تین عناصر میں سے کسی ایک عنصر پر زور دینا یا معنی کو نظر انداز کر کے اسے محض آواز یا آکار کے طور پر ہی استعمال کرنا ممکن نہیں۔ معنی کے ساتھ ہی خیال کے ساتھ ہی شعور کا عمل دخل شروع ہوجاتا ہے۔ گویا ادب کا میڈیم بذات خود فن کار کو اپنے قابو میں رکھتا ہے اور اسے بہکنے نہیں دیتا۔"

Form اور Content دو الگ چیزیں ہیں، جو ایسا مانتے ہیں یہ ان کو جواب ہے۔ وہ تو یہ مانتے ہیں کہ ثنویت نہیں ہے۔ ان کا زور تو اس بات پر ہے کہ ادب کی تخلیق ادب کے اصولوں پر ہی ہوگی، انسانی خیر سگالی کے گن گانے والی آئڈیولوجی کے اشارے پر نہیں۔ ادب کا بنیادی اصول میڈیم کا مناسب استعمال ہے اور ادب کا میڈیم لفظ ہے۔ یعنی ادب الفاظ کا مناسب استعمال ہے۔ اس لیے وہ استادوں کی زبان دانی اور ان کی عروضی موشگافیوں کے بھی اتنے ہی مخالف ہیں۔ یعنی محض زبان وبیان وعروض کی Acrobatics ہی شاعری نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں "شاعری کا مسئلہ خیال سے نجات پانے کا نہیں بلکہ خیال کو Image میں بدلنے کا ہے۔ "خیال کو Image میں بدلنے کا عمل کیا ہو؟ میڈیم یعنی لفظ کا مناسب استعمال، مناسب لفظ کے لغوی معنوں پر غور کریں۔ یعنی نسبت رکھنے والا۔ نگاہ رکھنے والا۔ موزوں، لائق، واجب، موافق، سزاوار، شایاں، زیبا، ٹھیک، درست، معقول، بہتر وغیرہ۔ تو وارث علوی لفظ کی کلیدی حیثیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ ہیئت پسندوں کی "چودھراہٹ" کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں وہ کسی آئیڈیولوجی کے ہاتھ پر بیعت بھی کیسے کریں گے؟ تنگ نظری، ملائیت اور کٹر پن کو بھی کیسے قبول کریں گے؟ اس لیے وہ جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع تو نہیں مانتے لیکن اردو جدیدیت کو وہ کسی تخلیقی تقاضے سے تعبیر بھی نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے مضمون "اواں گارد" میں بہت صاف لکھا ہے:

"ہمارے یہاں جدیدیت کی تعمیر ہی میں اک صورت خرابی کی تھی۔ جدیدیت زندگی کی پارینہ اقدار کے خلاف سرکش نوجوانوں کی بغاوت نہیں تھی بلکہ مرتی ہوئی ترقی پسندی کے خلاف تھکی ہوئی ترقی پسندی کا انحراف تھا۔"

اپنے اسی مضمون میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

"جدید ادب میں ادیب کے اعصاب کا تو پتہ چلتا ہے۔ احساس کی خبر نہیں ملتی، کیا جدید ادب کو پڑھ کر ہم جدید فن کار کے یہاں کسی جدید حسیت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔"

ادب میں اعصاب کی جگہ احساس کے متلاشی وارث علوی آگے لکھتے ہیں:

''جدیدیت نے ناکارہ لکھنے والوں کا جو جم غفیر پیدا کیا اس نے جدیدیت پر تنقید کے امکانات ہی ختم کردیے۔ ان کے حوالے سے ادب اور آرٹ اور دور جدید میں تخلیقی اور جمالیاتی رویوں کی گفتگو ہی ممکن نہیں رہی۔

شاعری میں تو خیر روایت نے بہت سوں کو سنبھالا لیکن افسانہ کا تو بنتا دھار ہو گیا۔

جدید افسانے کا قاری سے رشتہ استوار نہ ہو سکنے کا ایک ممکن سبب یہ بھی ہے۔لیکن یہاں شعری تنقید کے حوالے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وارث علوی نے جس روایت کے سبب شاعری کے سنبھلنے کی بات کہی ہے، کیا ہم ترقی پسندوں کی تذلیل کرتے ہوئے وہیں نہیں پہنچ گئے ہیں جہاں سے ترقی پسندوں کے انحراف کی داستان کا آغاز ہوا تھا۔ترقی پسندوں نے انحراف کرتے ہوئے " کیا کہا ہے " کو مقدم مانا تھا" کیسے کہا " کو ثانوی حیثیت دی تھی۔یہ دو الگ چیزیں ہیں کہ نہیں، یہ بحث طلب ہے۔لیکن کیا ہماری شاعری کی تنقید پھر وہیں پہنچ رہی ہے؟ تو کیا ہماری شعری تنقید کا Circle مکمل ہو گیا ہے؟ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات تو جدیدیت کی تھی اور وہ بھی اردو جدیدیت کی جو بقول وارث علوی پارینہ اقدار کے خلاف سرکش نوجوانوں کی بغاوت نہیں تھی۔تو کیا جدیدیت ہمارے یہاں صرف فیشن تھی؟ مغرب میں جدیدیت کے بنیاد گزاروں کا یہ ماننا تھا کہ جدیدیت فن کی آزادی نہیں بلکہ فن کی ضرورت ہے۔یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ مغرب میں جدیدیت جس فکر کی، جس احساس وادراک کی نمائندگی کرتی ہے، وہ عالمی جنگ اور تکنالوجی سے درآئے انتشار کے سبب تھی۔ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں ایسا کچھ نہیں ہوا لیکن جو ہوا وہ انسانی رشتوں پر ایسا وار تھا کہ اس کے نتائج ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔ہم جس تہذیبی بحران سے گزرے ہیں وہ تو ہمیں جانتے ہیں۔کیا ایسے میں ہمارے مسائل ان سے مختلف نہیں ہو جاتے؟ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ دوسرے کی آنکھ سے خود کو دیکھتے ہیں۔ ہماری شناخت کا دارومدار دوسروں کی شہادت پر ہے۔ہمارے ادب کی بھی یہی مشکل ہے۔ ہمارے یہاں مذہب افیون کب تھا؟ اور یہ ایک رات میں ہو بھی نہیں سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں خدا مر ہی نہیں سکتا۔اس لیے اس کی موت کا ملال اور ماتم ہمارے معاشرے کا مزاج کیسے بن سکتا ہے؟ مستعار احساس وادراک کی رسائی کہاں تک ہوگی؟ اگر ہم اپنے ترقی پسند اور جدید ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ادب میں مذہب کا جو روپ رنگ تھا وہ غائب ہونے لگا ہے۔ ہمارے ادب نے دھرم یا مذہب کے اس روپ کا جس کا تعلق Ritual سے ہے، ہمیشہ مذاق اڑایا ہے۔ ہمارا ادب اپنے روز اول سے محبت اور انسان دوستی کا طرف دار رہا ہے اور ہم نے مذہب پر محبت کو ترجیح دی ہے۔ادب کے اس مزاج سے ہمارے دھارمک یا مذہبی پیشوا بھی واقف رہے ہیں۔اس لیے وہ اپنی مخالفت کو کبھی مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ تو کبھی چیں بہ چیں ہو کر، تو کبھی خنداں پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اردو معاشرہ مذاہب کے معاملات میں اپنی رواداری (Tolerance) کا ثبوت دیتا رہا ہے۔کیا وہ رواداری آج باقی رہی ہے؟ چند واقعات سے اگر صرف نظر کر دیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہب نے ادب میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کم ہی کی ہے۔ مذہبی رسوم سے بیزار لوگ کم از کم ادب کی سطح پر مذہب سے بیزار نہیں تھے، یعنی مذہب بیزار ملحد و مشرک نہیں تھا، اس لیے قابل برداشت تھا۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے مذہب (مذہب افیم ہے) اور خدا (God is Dead) کے تصور پر جو چوٹیں کیں اس سے ہم کہاں پہنچے؟ آج معاشرے میں مذہب سے بیزار وہ عام آدمی ہے، جس کے لیے ہم ادب تخلیق کر رہے تھے۔ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جس آدرش عام آدمی کے لیے ہم لکھنے کی غلط فہمی پالے ہوئے تھے، اس کا ادب سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کے لیے لکھ کب رہے تھے۔ہم تو اس کے بارے میں لکھ رہے تھے۔وہ تو ابجد آشنا ہی نہیں تھا۔اس غریب کو تو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ادب کے قاضی اس کے غم میں گھلتے جا رہے ہیں۔ ہماری تنقید بار بار ہماری تخلیق کو ٹوک روک رہی تھی، اسے Dictate کر رہی تھی کہ یوں نہیں لکھو۔ وارث علوی نے تحریروں پر تنسیخ کا خط کھینچا اور قاری کو یہ بتایا کہ ترقی پسند تخلیق (اگر تخلیق رجعت پسند بھی ہوتی ہے تو) ترقی پسند تنقید سے بدرجہا بہتر ہے۔ جدید تنقید کے پھیر میں ان تخلیقات کو نظر انداز کرنا غلطی محض ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انہوں نے ہر ترقی پسند تخلیق کی تعریف کی ہو۔انہوں نے ساحر لدھیانوی کی نظم " تاج محل " کا جس طرح تجزیہ کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔انہوں نے اس نظم کو رد کرتے ہوئے بہت پتہ کی بات کہی ہے کہ " وہی سماجی ادب زیادہ اہم ہے جو سماجی مسئلہ کو محض سماجیاتی طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ اسے انسانی مسئلہ بنا کر انسان کو اس طرح پیش کرتا ہے جو تخلیقی ادب کا طریقہ کار رہا ہے۔ " تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احتجاجی ادب کا مسئلہ: مطبوعہ کچھ بچا لایا ہوں اس کے برعکس مجاز لکھنوی کی نظم " آوارہ " کے دفاع میں جو مضمون لکھا ہے وہ بھی دیکھئے۔اس سے اندازہ ہوگا کہ انہوں نے ان دونوں نظموں کو کس طرح دیکھا ہے اور کیوں مجاز کی نظم ساحر کی نظم سے بہتر ہے۔

وارث علوی خود تنقید نگار ہیں لیکن تنقید، خاص طور سے اردو تنقید کی جیسی قلعی انہوں نے کھولی ہے ویسی کس نے کھولی ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، وہ بار بار تنقید کی تعریف کرتے ہیں۔اس سے اپنی توقعات بتاتے ہیں اور ناقدین کے تعصبات سامنے لاتے ہیں۔ فکشن پر لکھتے ہوئے بھی انہوں نے ایسا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

" نقاد کی بڑی آزمائش تو یہی ہے کہ وہ اپنے اندر رہے ہوئے قاری کو مرنے نہ دے۔اس ذ جذبہ حیرانی اور آرزوئے نشاط کو مرنے نہ دے جو آرٹ کی تخیلی دنیاؤں میں ایک سیاح کی طرح اسے لیے پھرتی ہے۔ قاری کے اعصاب زندہ ہوتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے۔ تنقید جھوٹ بولتی ہے کیوں کہ تنقید نظریاتی اور گروہی پاسداریوں کے تحت یا اپنی عالمانہ نخوت اور بلند جبینی کی نمائش کی خاطر پر فریب بیانات دینے کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوتی ہے۔"

صورت حال کے بعد وہ تنقید کے تفاعل و تحدید کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"تنقید مردہ تنوں میں جان ڈالنے کا کام نہیں کرتی۔تنقید مسیحانفسی اوراعجازنہیں ہے،محض چھان پھٹک، پرکھ اور تحسین ہے۔تنقید صرف اتنا کرتی ہے کہ وہ جو ہمارے لیے پرلطف تھا،اسے مزید پرلطف بناتی ہے،مبہم کوواضح اور نیم روشن کومنور کرتی ہے۔فنی پیچیدگیوں اور معنوی تہہ داریوں کوشعور عطار کرتی ہے۔تنقید نئے تجربات قبول کرنے کے لیے ذہن کو ہموار کرتی ہے اور یہ کام ناکارہ تجربات کوکامیاب تخلیقات ثابت کرنے سے مختلف ہے۔"

وارث علوی کے محولہ بالا اقتباسات "جدید افسانہ اور اس کے مسائل "سے لیے گئے ہیں۔ظاہر ہے یہ باتیں افسانے کی تنقید کے ضمن میں کہی گئی ہیں۔ہم چاہے کتنے ہی سماعی صفات کے قائل ہوں لیکن ہمارے عہد میں افسانہ پڑھنے کی چیز ہے، وہ سنا تو شوقیہ ہی جاتا ہے اور تو اور جدید نانیاں اور دادیاں تک کہانی کہنے کا ہنر بھول چکی ہیں۔ یہ متحدہ معاشرہ یا کنبے کی برکتیں تھیں۔اب ہمارے بچے کہانیاں بھی کامکس میں پڑھتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی مقبولیت نے ان سے تخیل کی طاقت بھی چھین لی ہے۔اب اساطیری کردار کا جو عکس اس کے ذہن پرنقش ہے وہ اس کی ایجاد نہیں، بلکہ ٹی۔وی سیریل کے ہدایت کار کی ایجاد ہے۔یہی حال تاریخی کرداروں کا ہے۔اکبر کا نام سن کر مغل اعظم کے پرتھوی راج اور اشوک شاہ رخ خان نظر آتے ہیں۔ جب میڈیا کی یلغار نہیں تھی تب ہر بچہ کے ذہن میں اس کے اپنے اسطوری،افسانوی اور تاریخی کردار تھے۔ دیوداس ہمارے سامنے کی مثال ہے۔اس کے باوجود افسانہ بچا ہوا ہے تواس لیے کہ ہرافسانے پرفلم یاسیریل بنانا ممکن نہیں۔تو بات یہ ہے کہ افسانہ آج آنکھوں کے لیے ہے۔وہ بصری آرٹ ہے۔اور کہانی جو کبھی وقت بتانے کا وسیلہ تھی،اب وقت بچانے کا آرٹ ہے۔افسانے میں بھی ایجاز واختصار کا وہی مقام ہے جو شاعری میں ہے۔یہی تو ٹوٹتی حد بندیاں ہیں۔وارث علوی اس لیے نقاد کومشورہ دیتے ہیں کہ اپنے قاری کو بچائے رکھو۔ جیسے اختر الایمان نے "لڑکے " کو بچار کھا تھا۔ افسانے کی پہلی چیز افسانویت ہے۔ تنقیدی بیسا کھیاں کسی کہانی کوافسانہ نہیں بنا سکتیں۔اس کی Readability ہی اسے افسانے کا اعزاز عطا کرتی ہے۔تنقید اگر قاری کو مکرر مطالعہ کے لیے متحرک نہ کرے تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔لیکن قاری پہلی بار افسانہ کیوں پڑھتا ہے؟ ظاہر ہے اس کا کوئی حتمی جواب ممکن نہیں۔ ہر قاری کے پاس اس کا الگ جواب ممکن ہے۔لیکن اب افسانہ ہے پڑھنے کی چیز۔شاعری کو سن کر بھی حظ حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن افسانے کو تو خود کے لیے خود ہی کو پڑھنا ہوگا۔ہاں پرانی کتھائیں جن کا تعلق مذہبی رسوم سے ہے،انہیں آج بھی سنا جاسکتا ہے اور سنا جاتا ہے اور اس صورت میں کتھا واچک کا رول بہت اہم ہو جاتا ہے۔سنی جانے والی کہانیوں کی تعداد اور صفات اب مذہبی مجالس تک ہی محدود ہیں۔ ریڈیو کے غائب ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ اب ادبی افسانے کی سماعی صفات کی وہ مقبولیت بھی ختم ہو رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے اکثر افسانہ نویس اپنے ہی افسانوں کو ٹھیک سے نہ سنا پاتے ہوں۔لیکن افسانے کو بنانے والوں یا بنانا چاہنے والوں کے سبب افسانہ کا قاری سے رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔جدید افسانے سے وارث علوی کو یہی شکایت ہے:

"اردو ادب کا یہ قاری آج آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا ہے اور اسے ختم کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ جدید افسانے کا ہے۔دنیائے افسانہ اس قاری کے لیے اجنبی بن گئی ہے۔افسانہ اس کی زندگی کا جز نہیں رہا۔اسکے بک شیلف پر انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے بعد کسی اور افسانہ نگار کے مجموعے نظر نہیں آئیں گے۔ایک اور نام محمد منشایاد کا اضافہ کر لیجیے، پھر خلا ہی خلا ہے۔"

قاری کے گم ہو جانے کا وارث علوی کو افسوس اسی لیے ہے کہ وہ قاری اور کہانی کا رشتہ جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے عہد میں کہانی پڑھنے کی چیز ہے اور اگر پڑھی جانے والی چیز سے آنکھیں روٹھ گئیں تو غضب ہو جائے گا۔اپنے مضمون "افسانہ نگار اور قاری "میں انہوں نے لکھا ہے:

"اب اتنی جرأت تو ایک عام قاری میں کیا، مجھ جیسے جلاّد میں بھی نہیں کہ پچھلے پچیس سال سے نئے افسانے کے نام پر جو نان آرٹ بلکہ بوگس لٹریچر کا انبار جمع ہو رہا ہے اسے سوختنی قرار دوں۔حالانکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اردو ادب کی نجات اسی میں ہے کہ نئے افسانہ کی گردن بے دریغ ماردوی جائے ---۔یہ قتل اس لیے ضروری ہے کہ اردو ادب کو اپنا کھویا ہوا قاری مل جائے۔قاری کے بغیر ادب زندہ نہیں رہتا اور اس قاری کو ہمیں پھر سے پیدا کرنا ہوگا۔"

ضروری نہیں کہ ہم وارث علوی سے متفق ہوں لیکن عدم اتفاق کی صورت میں بھی ہمیں اس سوال کا جواب تو تلاش کرنا ہی ہوگا کہ آخر ہماری کہانی قاری کی عدم توجہی کا شکار کیوں ہو رہی ہے یا ہو گئی ہے۔ان کی اس بات سے تو انکار ممکن ہی نہیں کہ ادب قاری ہی سے زندہ رہتا ہے اور جب قاری ہی نہیں ہے تو ادب کس کے لیے؟اس کی تخلیق کا جواز کیا ہے؟ قاری کو ہمارے ناقدین نااہل وناکارہ کہتے ہیں تو یہ وہی قاری ہے جس نے پریم چند،منٹو، بیدی،قرۃالعین حیدر، عصمت وغیرہ کو زندہ رکھا ہے۔میڈیا کی یلغار کے باوجود قاری نے ادب سے عشق کرنا چھوڑا نہیں ہے۔ وہ بیدی کو بھی پڑھتا ہے اور کلیات راشدن۔م۔راشد اور کلیات میراجی کو بھی پڑھتا ہے۔اگر وہ نہیں پڑھتا تو ناشر اسے ہر گز نہ چھاپتا کیونکہ اشاعت گھروں اور اداروں کی دلچسپی ثقافت کے لیے سرمایہ صرف کرنے میں نہیں، بلکہ پیسے سے پیسہ کمانے میں ہوتی ہے،اس لیے اگر بازار میں اس کی مانگ نہ ہوتی تو وہ ہر گز ان چیزوں پر وقت اور دولت ضائع نہیں کرتا۔تو کیا یہ قارئین نااہل ہیں؟اور صرف اس لیے کہ وہ نئے افسانے کو نہیں پڑھتے۔جدید افسانے سے ان کی شکایت کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ فرد کی فرسودگی کو،تنہائی کو، مجبوری کو یا اس قبیل کی دوسری چیزوں کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان کی شکایت کا سبب یہ ہے کہ وہ حقیقت نگاری سے بچتے ہیں۔اپنے مضمون "ناول پلاٹ اور کہانی "بورژواژی بورژواژی "ملاحظہ کریں میں وہ لکھتے ہیں:

"دراصل جدید افسانہ کا پورا بحران حقیقت نگاری کی ذمہ داری قبول نہ کرنے کا نتیجہ تھا۔"

لیکن حقیقت نگاری اور حقیقت مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ پھر بقول وارث علوی آرٹ تو حقیقت اور تخیل کی آمیزش کا نام ہے۔ اس لیے حقیقت نگاری کا مطلب صحافت بھی نہیں ہے۔ حقیقت کا آرٹ میں جو روپ ملتا ہے وہ منٹو اور بیدی کے افسانوں میں ہے۔ اس کی وضاحت انہیں کے الفاظ میں دیکھیے:

"یہ بات یاد رکھیے کہ واقعات اور وارداتوں کو فن کار زندگی سے نہیں لیتا بلکہ زندگی کے حقائق کی ایک نئی ترتیب کے ذریعہ اپنی تخیلی سطح پر ایجاد کرتا ہے۔ فن کار کا ذہن ڈاگما اور ڈاکٹرائن سے جتنا غیر مشروط ہوگا، زندگی کے حقائق کی تخیلی ترتیب کے ذریعہ فن کارانہ حقیقت کی تخلیق کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوگا۔"

یہی وہ چیز ہے جو تخصیص کو تعمیم کا حسن عطا کرتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا لمس پا کر خدا کا بنایا ہوا فانی انسانی کا لافانی کردار بن جاتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے "گرہن" کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے یہی بات زیادہ وضاحت سے کہی ہے:

"افسانے میں جو حقیقت بیان ہوتی ہے وہ فنکار کے ذہن کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس کا خارجی حقیقت سے مماثل ہونا ضروری نہیں۔ البتہ داخلی اور نفسیاتی طور پر مربوط ہونا لازمی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ہمیں ادب اور زندگی میں فرق کرنا چاہیے۔"

اپنے مطالبے بلکہ مطالبات کے شور میں وارث علوی مابعد جدیدیت سے بھی خوش نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جدیدیت کی زمین بنجر ہو چکی۔ لہٰذا اب مابعد جدیدیت کی کھاد ڈالی جائے تو جو بوئیں گے اور گیہوں کا انتظار کریں گے۔"

وہ فاروقی اور نارنگ دونوں کو اپنا رفیق مانتے ہیں لیکن دونوں سے اختلاف ہے انہیں۔ فکشن کے معاملہ میں تو خاص طور پر لکھتے ہیں:

"شعر شور انگیز ہو یا ساختیات دونوں میں ادب کے روح پرور مطالعہ کی بجائے کلاس روم کی بو بھری ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کا ادب کی طرف رویہ شوقیہ نہیں پیشہ ورانہ اور منصوبہ بند تھا، اس لیے وہ جدید فن کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"فاروقی اور نارنگ واقعی فکشن کے اچھے قاری ہوتے تو علامت پسندی کی خاطر حقیقت نگاری جو فکشن کا جزو لاینفک ہے کی اس بے دردی سے گردن نہ مارتے۔"

اس شکایت کا سرا ان دو اقتباسات سے زیادہ مندرجہ ذیل اقتباس میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جدیدیت تو اظہار بیان کی مکمل آزادی کی داعی تھی۔ موضوع کے انتخاب میں کوئی قدغن نہیں تھا۔ اس آزادی کا فائدہ اگر فن کاروں نے نہیں اٹھایا کیوں کہ ان میں تخلیقی صلاحیت ہی کالعدم تھی تو اس میں فاروقی کا کیا قصور؟ فاروقی قصوروار وہاں ٹھہرتے ہیں اور نارنگ بھی کٹہرے میں ان کے ساتھ ہیں جب وہ بونوں کو بانس پر چڑھاتے رہے اور خاشاک کے تودوں کو دماند ثابت کرتے رہے۔ فاروقی کا سب سے بڑا کارنامہ جو میری نظر میں ان کا ادبی گناہ تھا، یہی تھا کہ انہوں نے تخلیقی تجربات کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔"

کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ بقول وارث علوی:

"جدید ادب کا دلدادہ ہونے کے باوصف میرا ادبی مذاق کافی کنزرویٹو تھا۔"

اور جو یہ مانتا تھا کہ "آزادی فنکارانہ ڈسپلن کا سرچشمہ ہے" شعر شور انگیز اور ساختیات دونوں سے انہیں شکایت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ وہ ادب سے انبساط یا مسرت چاہتے ہیں لیکن تنقید سے مسرت اور بصیرت دونوں کے طلبگار ہیں۔ اگر وہ فاروقی کے تبصروں اور عسکری کی جھلکیاں کو تکیہ کے دائیں بائیں رکھتے ہیں تو بیدی پر لکھے نارنگ کے مضامین کے بھی معترف اور ایسے معترف کہ یہ تک کہتے ہیں "افسانوی تنقید کے بہت سے گر میں نے ان مضامین سے سیکھے" تو فاروقی کے تبصروں کی تعریف اور انہیں عسکری کی "جھلکیاں" کے ہم پلہ ماننے کا مقصد یہ بتاتے ہیں کہ:

"فقیر کی فکر کو زنگ نہ لگے اور صیقل ہوتی رہے۔"

دونوں سے اس کے باوجود ناراضی کا سبب یہ ہے کہ وہ چیزیں جو انہیں مسرت نہیں بخشتیں یا جنہیں وہ اپنے معیار و مذاق کے مطابق نہیں پاتے، یہ حضرات ان کی تعریف کرتے ہیں اور مدلل تعریف کرتے ہیں۔ وارث علوی کہتے ہیں:

"تنقید کا کام خزف ریزوں کو لعل و جواہر سے الگ کرنا نہیں رہا بلکہ خزف ریزوں کو ہی لعل و جواہر ثابت کرنا رہ گیا ہے۔"

وہ نظریات کے مخالف نہیں نظریہ سازی کے مخالف ہیں اس لیے

"اپنے لیے ادبی نقاد کا جو منصب پسند کیا وہ ادب کی تفہیم اور تحسین تک محدود تھا اور اس مقصد کے لیے ادبی نظریات کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی جتنی کہ وسیع اور رنگا رنگ ادبی تجربات اور تصورات کی جو بڑے فلسفوں اور نظریوں پر مبنی اور ان سے ماخوذ ہوتے ہیں"

مجھے لگتا ہے کہ تخلیق ان کی توقعات کی تکمیل نہیں کرتی اور جب ان حالات میں تنقید تخلیق پر حاوی ہوتی ہے تو انہیں برا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بنیادی طور تخلیق کے طرفدار ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تنقید تخلیق کو **Dictate** نہ کرے۔ انہوں نے لکھا بھی ہے کہ "

"رجحان ساز تنقید نہیں تخلیق ہوتی ہے۔ آواں گارد، نقادوں میں نہیں، فن کاروں میں ہوتے ہیں۔ تنقید تو تخلیق کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔"

ان کی یہ شکایت کہ:

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

وارث علوی کا قلم ایک پرزم!

پروین شیر
(کینیڈا)

پرزم ایک ایسا انوکھا اور طاقت ور شیشہ ہے جو بہ ظاہر یک رنگی شعاعوں میں نہاں مختلف رنگوں کو الگ الگ کر کے اجاگر کر دیتا ہے۔ جنہیں ہماری آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں صرف پرزم کی آنکھیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ کرنوں میں چھپے سب رنگوں کو چھانٹ پھٹک کر ان کی اصل ساخت کو پرکھ کر نمایاں کر دیتی ہیں۔

اس عہد کے غیر معمولی قدآور نقاد، ادیب، تخلیق کار اور دانشور جناب وارث علوی صاحب کا قلم بھی ایک پرزم (Prism) ہے جو فکر و نظر اور تخلیقیت کی کرنوں میں نہاں مختلف اور حقیقی رنگوں کو حق گوئی کے ساتھ ظاہر کر دیتا ہے۔ یہ قلم ایک متوازن تجزیہ کار ہے۔ راستی اس کا چلن ہے۔

میری بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے ان سے کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں زمین کے اس گوشے میں مقیم ہوں جو اردو ادب اور ماحول سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ گرچہ برسوں پہلے یہاں بھی ان سرگرمیوں کی کوشش کی گئی تھی لیکن ادب میں بے ادبی اور سیاست کے پتھراؤ نے انہیں زخمی کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ برفیلے شہر میں یہ جذبات جو زندہ ہوئے تھے تنازع کی برف میں دب کر مر گئے۔

میں وارث علوی صاحب کو محض فون پر ان کی آواز اور ان کی علم و بصیرت سے بھرپور تحریروں کے توسط سے جانتی ہوں۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی آواز اور لہجہ شخصیت کی پہچان کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جب تفتیش کے لیے رگوں سے صرف چند قطرے خون جسم کی پوری کیفیت سے باخبر کر دیتے ہیں۔ میرا تجربہ بھی کچھ یوں ہوا کہ فون کے ذریعہ ہواؤں میں تیرتی ان کی خلیق آواز کی لہریں میری سماعت سے ٹکرا کر اس بات کی دلیل کامل بن گئیں کہ وارث علوی صاحب ایک نہایت خوش طبع، انکسار اور خوش خلق شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی بذلہ سنجی کے کیا کہنے! ان کا مشفق لہجہ ہمیشہ خوشیوں سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی بہترین شئے زبان ہے اور بدترین شئے بھی زبان ہی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ

"A tongue has no bones ......but it can break a heart.It can be a pillar for building a broken heart."

تو وارث علوی صاحب کا نرم لہجہ اور پرخلوص الفاظ سرشار کر دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اعلیٰ ادیب و تخلیق کار اعلیٰ انسان بھی ہو۔ وارث علوی صاحب دونوں خوبیوں سے مالا مال ہیں اور اردو ادب ان کے وجود سے مالا مال ہے۔ ان کا منفرد، فکر انگیز اور انوکھا طرز اظہار دعوت فکر عطا کرتا ہے۔ ان کے قلم کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ غیر جانب دار ہے، بے لاگ بولتا ہے، سچ کہتا ہے اور سچ تو سورج ہے جس کے بغیر انسان تاریکی میں راستہ بھٹک جاتا ہے۔ ان کے قلم سے سچ کی کرنوں کی بارش ادبی دنیا کو منور کرتی ہے۔ مشعل راہ بن جاتی ہے۔ ان کی تنقید میں ایمان داری ہے۔ حقیقت نگاری ہے۔ خواہ اس کا ردعمل کچھ بھی ہو۔ خواہ کڑوا سچ پیشانیوں پر برہمی کی شکنیں پیدا کر دے۔ ان کی آواز میں جھوٹا سچ نہیں۔ مصلحت کی نقاب نہیں۔ Crystal کی طرح شفاف ہے۔ یہ کھرا پن آج کل عنقا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر۔ کچھ بھی لگی لپٹی نہیں۔ ان کی حق گوئی و جرأت اظہار فکر و نظر کو مہمیز کرتی ہیں۔ ان کی تحریر کی اساس سچ کی بالادستی ہے۔ یہ فرماتے ہیں۔

" تنقید میرے لیے جوتیاں سیدھی کرنے کا نہیں بلکہ گریباں چاک کرنے کا نام ہے میں جب ڈھائی تولے کے شاعر کو سورما اور تنقید کے بونے کو باون گز کہنے سے انکار کرتا ہوں تو لوگ میری زبان کو غیر مہذب کہتے ہیں۔ کاش وہ یہ بھی دیکھتے کہ فلک سیر تخیل کی معجز نمائیوں کا ذکر میں کس وفور شوق سے کرتا ہوں "(تذکرہ روح کی اڑان کا)(بلاتکلف)

برطانیہ کے معروف شاعر Alexander Pope نے سچ کہا ہے کہ۔

An honest man is the noblest work o f God."

ذاتی طور پر مجھے جھوٹ کے شہد سے زیادہ سچ کا زہر پسند ہے کیونکہ یہ گمراہ نہیں کرتا کہ یہ رہنما ہے جو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ دوسروں کی خوشنودی کیلئے اپنے دل کی آواز کا گلا دبا دینا اور ہر دل عزیز بن جانا کتنا غیر اخلاقی ہے۔ برطانیہ کے مشہور نقاد Cyril Connolly کے مطابق:

"Better to write for yourself and have no public than to write for the public and have no self."

وارث علوی صاحب کا قلم جو واجب سمجھتا ہے وہی کہتا ہے دوسروں کو خوش کرنے کیلئے نہیں۔ اکثر تخلیق کار ایک خوبصورت دھوکے کے بلبلے میں قید رہ کر خوش ہوتے ہیں۔ بلبلے سے باہر نکلنا انہیں پسند نہیں۔ آئینے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اپنی تخلیقت کا ایک ہی رنگ دیکھتے ہیں اور دیکھانا چاہتے ہیں۔ اس کی کرن اگر کسی پرزم تک پہنچ جائے اور دوسرے رنگ بھی ظاہر ہو جائیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ ناراض ہو جاتے ہیں۔ پرزم (Prism) کو توڑ دینے کی حد تک۔ شاید اسی صورت حال پر معروف اطالوی نقاد Umberto ECO نے کہا تھا کہ۔

"Better reality than a dream! If Some thing is

real, then it is real and you are not to blame."

مجھے حیرت انگیز مسرت یہ ہوئی کہ وارث علوی صاحب اردو دنیا کے مافیا گروپ کے لیڈر یا ممبر نہیں ہیں۔ اردو مراکز سے دور رہ کر بھی انہیں ان کی غیر معمولی اہلیت کی بنیاد پر بین الاقوامی شہرت اور شناخت ملی ہے۔

میں نے جب اردو دنیا میں قدم رکھا تو انگشت بدنداں رہ گئی کہ یہ دنیا تو مافیا جیسے گروہ کی دنیا ہے۔ یہاں وہ Gangs ہیں جو ہمہ وقت ایک دوسرے کو زیر کرنے پر تلے ہیں۔ معتبر ادیب وتخلیق کار بھی خودستائی اور خودنمائی کی بیماری کے شکار ہیں۔ احساس برتری اور خود پسندی میں مبتلا۔ قدآوری کے خول میں نہاں کتنے ہی بونے نظر آئے۔ یہ عالم دیکھ کر مجھے یہ کہنا پڑا

کیسے کیسے شعبدے ہوتے رہے
ہم بہت حیراں کھڑے تکتے رہے

اور مجھے مشہور جرمن فلسفی، شاعر اور نقاد Friedrich Nietzsche کی یہ بات یاد آ گئی کہ

"you have made your way from worm to man and much in you is still a worm".

وارث علوی صاحب خودستائی جیسی بیماری کے شکار نہیں ہیں۔ بالکل صحت مند ہیں۔ یہ فرماتے ہیں "بے وقوف انکساری کو کمزوری اور بے نیازی کو احساس کمتری سمجھتا ہے۔" (تذکرہ روح کی اڑان کا) (بلاتکلف)

وارث علوی صاحب اس عہد کے قدآور نقاد، محقق، تخلیق کار اور دانشور تو ہیں لیکن میرے دل میں ان کے لیے بے حد عزت واحترام کی ایک اور وجہ ہے۔ وہ ہے انسان کی سب سے اہم اور بنیادی خوبی اس کا مکمل Family man ہونا جو ان میں بھرپور ہے۔ یہ اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں سے ایک اٹوٹ بندھن سے جڑے ہیں۔ یہ ایک مضبوط ڈور ہیں اور ان کے بچے موتیوں کی طرح اس ڈور میں پروئے ہوئے ہیں۔ جس طرح کسی گھنے شجر کی شاخوں پر پرندے چہچہاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے بچے اور بچوں کے بچے ان کے اردگرد ہوتے ہیں۔ مضبوط تنے سے یہ جڑی شاخیں محبت کی ہواؤں میں جھومتی رہتی ہیں۔ ادب اور فکر کے ہرے پتے سرسراتے ہیں۔ تعلیم وتربیت کے گلابی پھول لہلہاتے ہیں۔ جب بھی میری ان سے فون پر گفتگو ہوئی ان کے الفاظ کے پیمانے سے اپنے نواسے نواسیوں کے لیے محبت کا شہد چھلک چھلک گیا۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو مجھے بے حد متاثر کرتا ہے۔

رسالہ روشنائی (کراچی) میں پروفیسر محی الدین بمبئی والا کے دل چسپ مضمون نے اس حقیقت کی دوبارہ تصدیق کردی جب انہوں نے وارث علوی صاحب کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی۔

"حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف کتابوں اور اپنے بچوں میں جیئے۔ اپنی لڑکیوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے نواسے نواسیوں تک کو انہوں نے اپنی گود میں بڑا کیا۔ چڑیا گھر بچوں کو لے جاتے اور جانوروں اور پرندوں کے سامنے خود بھی بچہ بن جاتے"۔

اس مضمون سے ان کی ہر دل عزیزی، حسن ظرافت اور نرم دلی کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ خاص کر یہ واقعہ پڑھ کر

"مشہور اطالوی فلم بائیسکل تھیف (Bicycle thief) دیکھ کر ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ فلم کا انتہائی دردناک انجام بیان کرتے کرتے آنکھوں میں آنسو آ گئے اور سب دوست بھی اداس ہو گئے"۔

مجھے فخر ہے کہ وارث علوی صاحب نے میری دونوں کتابوں کو ("کرچیاں" اور "نہال دل پر سحاب جیسے") توجہ سے پڑھا۔ میری شاعری کو بہ نظر تحسین دیکھنے کے ساتھ اپنے متوازن گرانقدر تاثرات سے نوازا۔۔ مجھ میں اور حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ تخلیقی قوت کو سراہتے ہیں اور کمزوریوں پر پردہ ڈال کر گمراہ نہیں کرتے۔ ان کے قلم کے پرزم (Prism) سے صرف صداقت کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔ سچ کے ہزاروں سورج یہ تو اپنی اپنی بصیرت پر منحصر ہے کہ کون اس آگ میں تپ کر کندن بننا پسند کرتا ہے اور کون کذب کی شبنم میں صرف پل بھر کے لیے تروتازہ رہنا چاہتا ہے۔ کیونکہ آخر کار سچ کی تمازت جھوٹ کی شبنم کو بخارات میں تبدیل کر کے دھوئیں کی مانند اڑا کر بے نشان کر دیتی ہے۔

یہ جان کر حیرت انگیز مسرت ہوئی کہ وارث علوی صاحب مصوری کے اس قدر دل دادہ ہیں جو اردو دنیا میں کم یاب ہے۔ جس طرح انہوں نے میرے محسوساتی پیکر کے مرقع کو نوازا اور میری مصوری کو سراہا۔ وان گو، گوگن اور ریم براں جیسے فن کاروں کے انمول شاہ کار ان کے گھر کی زینت ہیں۔

وارث علوی صاحب کی کتاب "راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ" اردو ادب کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ بیدی کے فن کی مختلف اور انجانی جہات روشن ہوتی ہیں۔ "ناخن کا قرض"، "کچھ بچالایا ہوں"، "اے پیارے لوگو" اور بہت ساری دیگر تصنیفات نے اردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

میں تو کینڈا کے اس شہر (ونی پیگ) میں رہتی ہوں جہاں اردو کی کتاب حاصل کرنا ممکن نہیں۔ بیدار بخت صاحب کی بے حد ممنون ہوں کہ ان کی انمول لائبریری سے کتابیں مستعار لیتی ہوں پارسل کے ذریعہ ''کچھ بچالایا ہوں''، ''اے پیارے لوگو'' اور ''پیشہ تو سپہ گری کا بھلا'' بھی انہوں نے میری گذارش پر مجھے بھیج دی تھیں۔ معروف نقادوں کے تنقیدی مضامین میری نظر سے گزرے ہیں، زیادہ تر بہت خشک ہوا کرتے ہیں۔ وارث علوی صاحب کا طرز اظہار ایسا ہے جو خود سے باندھ لیتا ہے۔ پڑھنا شروع کیا تو خوبصورت انداز بیان کے سمندر میں بس ڈوبتی چلی گئی- کچھ اقتباس۔۔۔

''تجربہ کیا ہے؟......ٹھنڈی ہوا کا لمس، اُجاڑ دن کی ویرانی،

جاڑے کی چمکدار دھوپ، کار کے پیچھے بھاگتا ہوا بچہ، بیتتے دنوں کے بوجھ تلے دبا ہوا بوڑھا، خالی مکان میں قدموں کی خوف زدہ چھاپ، وقت کا بے کیف تواتر۔

تجربہ کیا ہے؟...... ذات کا غیر ذات سے ملاپ، ذہن کی خارجی دنیا سے مڈبھیڑ، سلگتے احساس سے دہکا ہوا فانوس خیال، جذبہ کی طلاطم بدوش موجوں کا سنگیت۔

تجربہ جس احساس کو جنم دیتا ہے وہ دھند میں لپٹی ہوئی جھیل کے مانند جتنا نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ پھیلا ہوا، کہیں زیادہ گہرا اور پُر اسرار ہوتا ہے۔ جھیل کے پانی کا رنگ کہیں نیلا، کہیں سبز، کہیں زرد اور کہیں خاکستری ہوتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک رنگ دوسرے میں تحلیل ہو جاتا ہے اور گھلتے ملتے رنگوں کے دائرے بنتے بگڑتے، ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔''

(پیشہ تو سپہ گری کا بھلا۔ مضمون محمد علوی کی شاعری)

یہ طرز اظہار یہ تخلیقت سے شرابور تحریریں پوری طرح Intoxicating ہیں میرے لیے، بار بار پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سحر زدہ کر دیتی ہیں۔

زندگی کے قوس وقزح میں جب صرف پیلا رنگ پھیلنے لگتا ہے، یک رنگی فضائیں جھنجھلا کر جھنجھوڑتی ہیں، خشک، ننگی اور نوکیلی شاخیں روح میں چبھنے لگتی ہیں، غبار آلود گلیوں میں چلتے چلتے آنکھیں دھندلا جاتی ہیں تو گھبرایا ہوا دل کتابوں کی طرف دوڑتا ہے، پناہ پانے کو۔ وارث علوی صاحب کی تصانیف بھی ان میں شامل ہیں جو یک رنگی فضاؤں کو ست رنگی بنا دیتی ہیں۔ جھنجھلاتی ہوئی فضا کے لبوں پر مسکراہٹ کی جنبش عود کر آتی ہے۔ گرد سے دھندلی آنکھوں میں تازہ بصارت راستوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ غم دوراں کی مٹی میں دبی تخلیقیت کی لاشیں پھول بن کر مٹی سے باہر آ جاتی ہیں۔

وارث علوی صاحب کے فکر کے وسیع آسمان پر اتنے آفتاب دمک رہے ہیں جن کی روشنی سے میرے قلم کی آنکھیں خیرہ ہو گئی ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کو میرے قلم کا دامن کہاں سمیٹ سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کی فکر کے ہزاروں آفتاب اردو دنیا کو اپنی روشنی عطا کرتے رہیں اسی طرح منور رکھیں۔

☆

- بقیہ -

''حقیقت اور تخیل''

" تنقید میں بھی ہم نقادوں کا ہی حق ادا کرتے ہیں، فن کاروں کا نہیں۔ اس سے تو یہی بات سچ ثابت ہوتی ہے کہ ہمارا دور تنقید کا ہے تخلیق کا نہیں اور یہ کوئی دل خوش کن بات نہیں بلکہ الم ناک صورت حال ہے۔ کیا وجہ ہے کہ جتنے اچھے مضامین ہم نے فاروقی اور نارنگ پر لکھے، اتنے اچھے سردار جعفری، راشد، بیدی یا منٹو پر نہیں لکھ سکے۔"

ان اور ایسی باتوں سے لگتا ہے کہ انہیں فن کار اور نقاد دونوں سے شکایت ہے۔ انہیں فن پاروں سے مسرت اور تنقید سے بصیرت نہیں ملتی کیوں کہ اچھے مضامین تو بجائے فن کاروں کے، ناقدین پر آ رہے ہیں۔ دراصل وارث یہ ماننا نہیں چاہتے کہ یہ دور تخلیق کا نہیں تنقید کا ہے یا شخصیت پرستی کا ہے۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ وہ قاری ہیں تخلیق ادب کے۔ تنقید وہ تخلیق کی تفہیم کے لیے پڑھتے ہیں۔ اور جب وہاں تحفظ وتعصب پاتے ہیں تو مضطرب ہو جاتے ہیں۔ ادب کا مطالعہ عدم اطمینانی کا موجب ہونے لگتا ہے اور شاید یہی عدم اطمینانی مسلسل لکھنے کی تحریک دیتی ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں، راقم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وارث کی تنقید نے کیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی فقرہ بازی، جملہ بازی، پھکڑ پن یا انشائیہ اسلوب میں ایک عدم اطمینانی پوشیدہ ہے جسے ہم ان دیکھا کر جاتے ہیں اور حظ حاصل کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی طرفداری یا دفاع میرا مقصد نہیں، ہو بھی نہیں سکتا، اس کے لیے تو خود وارث ہی کافی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وارث نے کشتوں کے پشتے لگائے ہیں لیکن شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں " سچی بات تو یہ ہے تمہاری تلوار کا قتیل ہونا کس کو اچھا لگے گا۔ " اور اسی اچھے لگنے کی وجہ بھی فاروقی صاحب ہی سے سنیے " اکا دکا مواقع کے علاوہ تم نے زندگی کو اور ادب کی سیاست کو جس بہادری، پا مردی اور متانت، ہمسایہ کے خوف سے ماورا ہو کر برتا ہے، اس کی مثال نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ کوئی کمتر درجے کا آدمی ہوتا تو جگہ جگہ مفاہمت کر چکا ہوتا۔"

○

''ایجازِ بیان کا حُسن''

سرورالہدیٰ
(دہلی، بھارت)

' گنجینۂ باز خیال ' میں چھ مضامین شامل ہیں جن کا تعلق فکشن اور فکشن نگاروں سے ہے۔ کتاب کا نام غالب کے درج ذیل شعر سے ماخوذ ہے:

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم

گنجفہ باز خیال اور غالب کے پورے شعر کی معنوی دنیا کا تعلق وارث علوی کی فکر اور تنقیدی اسلوب سے کتنا اور کس نوعیت کا ہے اس بارے میں گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے۔ کیا گنجفہ باز خیال کا کوئی تعلق ان فکشن نگاروں سے بھی ہے جنہیں وارث علوی نے کتاب میں شامل کیا شعر کے ٹکڑے پر رکھا گیا ہے۔ وارث علوی کا تنقیدی اسلوب ایک مستقل مطالعے کا موضوع ہے۔ میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ وارث علوی کی فکشن تنقید کا ابھی تک ناقدانہ جائزہ نہیں لیا گیا۔ ادھر اُدھر سے ان پر کچھ ضرور لکھا گیا لیکن وارث علوی کی تنقیدی روح تک کا سفر ابھی طے ہونا باقی ہے۔ یہاں میری مشکل یہ ہے کہ وارث علوی کی تازہ ترین کتاب ' گنجفہ باز خیال ' میرا موضوع ہے لیکن وارث علوی کی دیگر کتابیں بعض بنیادی مباحث کے سبب میرے ذہن کو مختلف سمتوں میں بھٹکاتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وارث علوی کی تنقید کا جائزہ لینا میرا مقصود نہیں ہے، میں بڑی مشکل سے کچھ کہنے کی اہمیت کر پایا ہوں، یہ امر واقعہ ہے خاکساری نہیں۔

اس کتاب کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں:

- قاضی عبدالستار کے معاشرتی ناول
- لالی چودھری کے افسانے
- فہمیدہ ریاض کا تانیثی افسانہ
- شفق کا افسانوی مجموعہ 'وراثت'
- شیر شاہ سید کی افسانہ نگاری کے چند پہلو
- اردو افسانے کی ایک منفرد آواز ترنم ریاض

وارث علوی کی فکشن تنقید کا اہم ترین حوالہ ان کی دو کتابیں 'سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ ' اور 'راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ ' ہیں۔ ان کے علاوہ 'جدید افسانہ اور اس کے مسائل ' اور کچھ دوسری تحریریں بھی ہماری فکر اور بصیرت کو روشن کرتی رہی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں جن فکشن نگاروں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے وہ بالکل ایک نئی آگہی اور بصیرت کا پتا دیتی ہے۔ اول تو یہ بات بڑی اہم ہے کہ منٹو اور بیدی پر تاریخ ساز کام کرنے کے باوجود وارث علوی نے اپنے تنقیدی موقف میں کس قسم کے تعصب کو راہ نہیں دی۔ عموماً ہوتا یہی ہے کہ اہم ترین اور بڑے رائٹرس پر لکھنے کے بعد ہمارا نقاد ایک ایسی بلندی پر فائز ہو جاتا ہے جہاں سے اسے ہر لکھنے والا چھوٹا نظر آتا ہے۔ کچھ لوگوں کو حیرت ہو سکتی ہے کہ قاضی عبدالستار، فہمیدہ، شفق وغیرہ کے ساتھ ترنم ریاض پر اتنا تفصیلی مضمون قلم بند کرنے کا کیا جواز ہے۔ ہر نسل اور ہر سطح کے لکھنے والوں کے یہاں کوئی خوبی کوئی بات اگر کسی کو متاثر کرتی ہے تو اسے سچے مطالعے کا نام دینا چاہیے۔ قاضی عبدالستار پر کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اب تو ان پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن وارث علوی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان میں زیادہ حصہ قاضی صاحب کی مداحی کا ہے۔ تنقید مکمل مداحی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب کے فن کا اتنی ذہانت مگر معروضیت کے ساتھ اس سے پہلے جائزہ نہیں لیا گیا۔ کون سا ایسا قاری ہوگا جس پر قاضی صاحب کی زبان کا جادو نہ چلا ہو۔ لیکن اس جادو نے قاضی صاحب کی فنی کمزوریوں کا کس طرح پردہ بنا ہے اس جانب مجھے نہیں معلوم کس نے اس جرات مندی کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ وارث علوی نے قاضی صاحب کے تاریخی ناول کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ مضمون کی ابتدا میں ہی اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہیں کہ "میں تاریخی ناول میں دل چسپی نہیں رکھتا اس لیے ان پر تنقید کے آداب سے میں واقف نہیں۔" بہر حال یہ تو ان کی خاکساری ہے کہ میں تاریخی ناول پر تنقید کے آداب سے واقف نہیں۔ وارث علوی نے " قاضی عبدالستار کے معاشرتی ناول کا عنوان قائم کیا ہے تا کہ کسی کا ذہن 'داراشکوہ ' کی طرف نہ جائے۔ پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ قاضی صاحب کے جن ناولوں کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے انہیں وہ معاشرتی قرار دیتے ہیں اور شاید ان ناولوں کی زندگی کے سیاق میں اس سے بہتر عنوان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

قاضی عبدالستار کے ناولٹ 'شب گزیدہ '، 'مجو بھیا'، 'بادل ' اور 'غبار شب ' کو وارث علوی نے معاشرتی ناول کا نام دیا ہے۔ لیکن ان کی نگاہ ناول کے فنی سروکار پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ ہر ناول میں قصے کے تفصیل بیان کرتے ہوئے کبھی درمیان میں تو کبھی آخر میں فنی کمزوریوں یا فنی مسئلے کی جانب مراجعت کرتے ہیں۔ گویا ناول کی کہانی یا اس کا معاشرتی مسئلہ بالآخر فنی مسئلے کی جانب مراجعت کر جاتا ہے۔ اگر یہ خوبی پیدا نہ ہوتی تو کوئی ناول اپنے تاریخی، معاشرتی سروکار کے باوجود وہ ناول کا فن نہیں بن سکتا۔ وارث علوی ناول کے فن پر موقع موقع سے روشنی ڈالتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاضی عبدالستار کی زبان کا جادو انہیں بہت دیر تک اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ قاضی صاحب کی بیانیہ قوت کا اعتراف کرتے ہیں، وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ قاضی صاحب کو سنسنی کی فضا قائم کرنے کا بڑا ملکہ حاصل ہے لیکن وہ لکھتے ہیں:

"ان ناولٹوں میں ایک منفرد اسلوب کی کارفرمائیاں ہیں، ایجازِ بیان کا حسن ہے، زبان کا بحرِ ذخار ہے، تشبیہوں اور استعاروں کی دھنک کے رنگ ہیں، جزرس حقیقت نگاری، کھلی آنکھ کے شفاف مشاہدات، سماجی شعور اور زندگی کے المیہ احساس کے ساتھ بکھرتے، ٹوٹتے اور تباہ ہوتے خاندانی رشتوں اور انحطاط سے گزرتے ہوئے پورے معاشرے اور زوال اور پستی اور افلاس کا شکار اس معاشرے کے مختلف طبقات فرقوں، جاتیوں کی عورتوں اور مردوں کے رہن سہن، عادتوں اور طریقوں اور معمولی سے معمولی آدمی کی ایسی نقش گری ہے کہ شبیہ ذہن پر نقش ہو جائے۔ ان تمام خوبیوں نے ناولوں کو اتنا دلچسپ بنایا ہے کہ آدمی ان میں کھو جاتا ہے۔ لیکن جب ان کے طلسم سے باہر نکلتا ہے تو اس کے پاس کوئی ایسی بصیرت، ایسا تجربہ، ایسا کردار نہیں ہوتا جو اس کے ذہن میں تادیر زندہ رہے کہ غور وفکر کے ذریعے اس کے نہفتہ گوشے آشکار ہوتے ہیں۔"

وارث علوی نے مندرجہ ذیل بالا اقتباس میں قاضی صاحب کے فن سے متعلق جن باتوں کو نشان زد کیا ہے وہ ان کی ذہانت اور گہری نظر کی دلیل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا نقاد ہوتا تو قاضی صاحب کی اتنی فنی خوبیوں کو گنا کر ان پر ایمان لے آتا لیکن وارث علوی یہ کہنے میں ہچکچاتے نہیں کہ قاضی صاحب کی اتنی بھری پُری دنیا ہمیں جب اپنے یہاں سے لوٹاتی ہے تو ہمارے پاس کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جو ہماری انفرادی یا اجتماعی زندگی میں ہمارا ساتھ دے سکتی۔ وارث علوی نے تین اشیا کا ذکر کیا ہے: بصیرت، تجربہ اور کردار۔ شاید ادبی مطالعے سے انسان کو اگر یہ دولتیں بھی نہ ملیں تو ادب کیوں پڑھا جائے۔ وارث علوی قاضی صاحب کے تعلق سے سنسنی خیزی کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اسی سنسنی خیزی نے ان کے فن کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں اپنی محدود نظر کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وارث علوی نے ہی پہلی مرتبہ قاضی صاحب کی اس سنسنی خیزی کو ان کی کمزوری قرار دیا ہے ورنہ عام طور پر اسے قاضی صاحب کے فن کا ایک امتیاز قرار دیا جاتا رہا ہے۔

وارث علوی کا تنقیدی ذہن بار بار قاضی صاحب کی سنسنی خیزی کی طرف جاتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے ناولوں کی دوسری خوبیاں انہیں اپنے طلسم کے باعث گرفت میں لے لیتی ہے ورنہ وہ یہاں ان کی کمزوریوں کی نشان دہی کے بعد یہ نہ لکھتے:

"قاضی صاحب کی ادبی اہمیت کہانی کی سنسنی خیزی میں نہیں بلکہ ایک خاص دور کی معاشرتی اور تہذیبی آئینہ داری میں ہے۔ گویا استعجاب انگیز، پر تجسس سنسنی خیز کہانی قاری کو اپنی گرفت میں جکڑے رہتی ہے۔"

قاضی صاحب کا فن ایک خاص دور کی معاشرتی اور تہذیبی آئینہ دار ہے۔ یہ وہ رائے ہے جو قاضی صاحب کے سلسلے میں عام رہی ہے۔ وارث علوی کو قاضی عبدالستار کے ناولوں سے جو بنیادی شکایتیں ہیں انہیں بہت واضح انداز میں لکھتے ہیں، انہیں کوئی تذبذب اور مغالطہ نہیں لیکن جب وہ ناول کے مختلف اجزا سے بحث کرتے ہیں تو ایسے ہی انہیں قاضی عبدالستار کی فن کاری بہت اپیل کرتی ہے۔ ایسے موقعے پر محسوس ہوتا ہے کہ وارث علوی قاضی عبدالستار کو مجموعی اعتبار سے کامیاب ناول نگار قرار نہ دے کر جزوی طور پر انہیں سنوارنا چاہتے ہیں۔ 'شب گزیدہ' کا ذکر کرتے ہوئے وہ اسے کامیاب ناول تو کہتے ہیں لیکن اس کا سہرا وہ اس کی کردار نگاری کے نہیں پکچر گیلری کے سر باندھنا چاہتے ہیں۔ 'شب گزیدہ' کے سیاق میں وہ لکھتے ہیں:

"پوری تہذیب، تاریخ کا ایک بیتا ہوا ورق ہمارے ذہن میں زندہ ہوتا ہے اور تصویروں کا یہ نگار خانہ قاضی عبدالستار ہی سجا سکتے تھے۔"

'مجو بھیا' کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر کردار کو زیرِ بحث لاتے ہیں:

"کہانی اب کردار کی نہیں پلاٹ کی بن گئی ہے۔ لیکن قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ مجو بھیا کو ہماری آنکھ سے اوجھل ہونے نہیں دیتے۔"

وارث علوی ایک ذمے دار نقاد کی حیثیت سے قاضی عبدالستار کے فنی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں ایک بات یہ مشہور ہوگئی ہے کہ وہ جب کسی فن پارے کی کمزوریاں بیان کرنے پر آتے ہیں تو پھر دائیں بائیں نہیں دیکھتے۔ ممکن ہے کسی تحریر میں ان کے یہاں یہ انداز در آیا ہو لیکن قاضی عبدالستار پر اتنی سخت تنقید لکھتے وقت انہیں ان کی فنی عظمت کا خیال رہتا ہے۔ بظاہر مندرجہ بالا اقتباس میں ایک چھوٹی سی سامنے کی بات بتائی گئی ہے مگر اس کو تلاش کرنا اور پھر نشان زد کرنا آسان نہیں ہے۔ اس مضمون کے علاوہ کتاب کے دیگر مضامین افسانے سے متعلق ہیں، ظاہر ہے کہ ناولٹ کی تنقید کے تقاضے افسانے سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ لالی چودھری کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک ایسی خوبی کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو انہیں قاضی عبدالستار کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔

"لالی چودھری کہانی کی طرح بیان کرتی ہیں لیکن پتا چلنے نہیں دیتیں کہ جو واضح اور صاف رسومات ہیں ان کے پیچھے کتنے تاریک منصوبوں اور فاسد عزائم کی کارفرمائی ہے۔"

لالی چودھری کو یہ فن اگر حاصل ہے تو عہدِ حاضر میں ان موضوعات اور مسائل پر لکھنے والوں کے بہت سے چہرے اس آئینے میں شرمندہ ہوتے ہیں۔ آج عالم یہ ہے کہ افسانے کے مسائل زندگی سے بہت قریب ہیں اور ہم یہ کہتے نہیں تھکتے کہ افسانہ تجریدیت اور علامت کے گورکھ دھندوں سے نکل کر زیادہ سماجی اور عصری ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر نقاد اور تخلیق کار اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ افسانہ محض سماجی اور عصری ہونے کے سبب اچھا یا بڑا نہیں ہو سکتا۔ آخر کوئی ڈھنگ کوئی بصیرت تو چاہیے۔ لالی چودھری کے افسانے ہمیں بار بار اگر روکتے اور ٹوکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہمارے مسائل کا اظہار تخلیقی سطح پر ہوا ہے۔ افسانے کی تنقید میں آج بھی حیرت اور استعجاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن وارث علوی لالی چودھری کے فن کو اس لیے سراہتے

ہیں کہ اس میں استعجاب کی کیفیت نہیں ہے وہ کسی دھماکے کا اشاریہ نہیں بنتا بلکہ فطری طور پر کہانی سفر کرتی ہے۔ان کی یہ رائے بھی قابل غور ہے کہ لالی چودھری کے افسانے میں ایجاز کلامی ہے۔لیکن یہ ایجاز کلامی تمام تفصیلات اور جزئیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ بظاہر تو اس خوبی کا اطلاق کسی بھی کامیاب افسانہ نگار پر ہوسکتا ہے لیکن اسے برت پانا آسان نہیں ہے۔وارث علوی لالی چودھری کے افسانوں میں کسی فلسفے یا دقیق خیال کو تلاش نہیں کرتے۔ایک خاتون امریکہ میں زندگی کی جن چھوٹی چھوٹی باتوں سے کہانی بناتی ہے وہ زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ظاہر ہے کہ لالی چودھری کو اپنی حدود میں کہانی بنانے کا ہنر آتا ہے۔غریب الوطنی میں اپنی شناخت کا مسئلہ جن نفسیاتی کیفیات سے گزرتا ہے اس کا صحیح اندازہ کوئی غریب الوطن ہی کرسکتا ہے۔خصوصاً ایک مشرقی تہذیب کے ساتھ جب مغربی دنیا کو اپنا مستقر بناتی ہے تو وہ کن ذہنی اذیتوں سے گزرتی ہے، اس کا فنکارانہ اظہار لالی چودھری کے یہاں موجود ہے۔مشرق اور مغرب ندی کے دو کناروں کی طرح نہیں ہیں۔وارث علوی نے لالی چودھری کے موضوعات سے زیادہ توجہ اس حقیقت پر دی ہے کہ ان موضوعات کے تئیں ان کا فنکارانہ رویہ کیا ہے، وہ کس طرح ان کی پیش کش میں اپنے ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہیں اسی لیے وارث علوی لالی چودھری کو ایک آزاد تخلیقی ذہن کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ہماری تنقید تانیثیت کی تلاش اور مداحی میں اکثر یہ بھول جاتی ہے کہ تانیثیت بذات خود کوئی آرٹ نہیں ہے بلکہ آرٹ وہ فنی اور فکری بصیرت ہے جو تانیثیت کو ایک فارمولے کے طور پر استعمال نہیں کرتا۔

وارث علوی آرٹ کو پہلے آرٹ کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں باقی دوسرے مسائل اپنی جگہ اہم ضرور ہیں لیکن انہیں اول و آخر آرٹ کے سانچے میں ڈھلنا چاہیے۔ ایک عورت کا باغیانہ رویہ اپنا ایک جواز رکھتا ہے۔ لالی چودھری کے افسانوں میں ایک عورت کی آواز صرف فتح ہی نہیں بلکہ شکست کے احساس سے بھی مملو ہے۔ مجھے وارث علوی کے اس تجزیے نے بہت متاثر کیا:

"لیکن بغاوت اور علاحدگی میں بھی کھونا تو عورت ہی کو پڑتا ہے۔ یہ گویا تانیثی رویے کی شکست بھی ہے۔لالی چودھری کے افسانوں کا تانا بانا اسی فتح و شکست کی پیدیدہ ڈیزائن سے بنا ہے۔اسی لیے میں نے کہا ہے کہ وہ فیمنسٹ ہیں بھی اور نہیں بھی۔عورت کا مسئلہ تو اصلاحی اور میلا ناتی ادب بھی پیش کرسکتا ہے لیکن جب یہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے المیہ میں بدل جاتا ہے تو وہ آرٹ کا موضوع بنتا ہے اور یہیں سے لالی چودھری اپنا کام شروع کرتی ہیں۔"

لالی چودھری جہاں سے اپنا کام شروع کرتی ہیں اس کا تصور بھی کتنوں کے پاس ہے۔کسی مسئلے کو المیہ میں تبدیل کردینا ہر ایک کا مقدر نہیں ہوتا۔ اس سیاق میں وارث علوی کا مضمون 'فہمیدہ ریاض کا تانیثی افسانہ' کا مطالعہ دل چسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔وہ یہاں بھی لالی چودھری پر اچھی خاصی گفتگو کرتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کے دو افسانے 'پرسنل اکاونٹ' اور 'حاصل' زیر بحث آئے ہیں۔انہوں نے لالی چودھری کے افسانوں میں جن فکری و فنی جہات کی طرف اشارے کیے ہیں انہیں فہمیدہ ریاض کے ہاں تلاش کرنے کی غیر ضروری کوشش نہیں کی ہے۔اس مضمون کی ابتدا میں مشرق اور مغرب کی تہذیبی روایت کے سلسلے میں جو گفتگو ہے وہ بہت ہی منفرد ہے۔ تانیثیت او ر مابعد جدیدیت کے رشتے پر ایسی رائے کہاں ملے گی:

"جب مابعد جدیدیت کے لگ بھگ اردو نقادوں کے اعصاب پر سوار ہوئی تو انہیں عورت یاد آئی، لیکن جو عورت ادب میں ملی وہ تو مشرق کی آزادی نسواں کی تحریک کی عورت تھی، وہ عورت نہیں تھی جو مغرب کی فیمنسٹ تحریک کی پیدا کردہ تھی۔"

فہمیدہ ریاض کے سیاق میں تانیثیت کے اور بھی کئی مسائل زیر بحث آئے ہیں، یہاں فہمیدہ ریاض کی کہانی 'حاصل' کی دو علامات کے سبب اسے اہم کہانی قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ان دو علامات پہیوں والی گاڑی اور ائیر پورٹ سے فکر انگیز بحث کی ہے۔مضمون کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں:"تانیثی افسانہ خوش و خرم ازدواجی زندگی کا نہیں بلکہ ناخوش اور ناہموار جوڑوں کی کہانی ہوتی ہے۔ "ایسے میں کسی تانیثی افسانے سے کسی خوشگوار اختتام یا پہلو کا تقاضا کرنا مناسب نہیں۔ اس کتاب میں ترنم ریاض کی افسانہ نگاری پر ایک تفصیلی مضمون شامل ہے۔ ترنم ریاض نے گزشتہ چند برسوں میں ادب کے سنجیدہ قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے لیکن وارث علوی کے علاوہ کسی اور نے انہیں موضوع نہیں بنایا۔ایسے میں وارث علوی کے اس مضمون سے کچھ لوگوں کو اگر ترنم ریاض کی کہانیوں کو پڑھنے کی تحریک ملے گی تو کچھ لوگ حیرت کا اظہار بھی کرسکتے ہیں۔ مجھے تو یہ بات اچھی لگی۔انہوں نے اپنے مطالعے اور بصیرت کی روشنی میں ترنم ریاض کی کہانیوں کی قدر افزائی کی اور اس معاملے میں کسی کی رائے اور مشورے کا کوئی خیال نہیں کیا۔اکثر اوقات ہماری قرأت دوسروں کی آرا سے تعصب کا شکار ہو جاتی ہے۔وارث علوی نے ترنم ریاض کے افسانوں سے متعلق جو رائے دی ہے وہ اہم بھی ہے اور چونکا دینے والی بھی۔ حیرت ہے کہ اس عہد کے اہم ترین نقادوں نے ترنم ریاض کو کیوں کر نظر انداز کیا۔ وارث علوی، ترنم ریاض کو ایک فطری افسانہ نگار سمجھتے ہیں جس کے یہاں تمام تر فنکاری کسی بناوٹ، بوجھ اور اوڑھی ہوئی صناعی سے بلند تر ہے۔

"ان کے یہاں کاوش اور کاہش کی جگہ برجستگی اور بے ساختگی ہے۔ تہ در تہ معنویت، پیچیدہ ڈیزائن اور معنی خیز اشاروں اور کنایوں کی ایک دوسرے کو کاٹتی لکیروں کے باوصف افسانہ اپنے حسنِ سادہ کو برقرار رکھتا ہے۔"

یہ خوبی کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں بھی ہوسکتی ہے۔اسی لیے میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ کسی فنکار کے ہاں کسی ایسی خوبی کا پایا جانا جو دوسروں میں بھی ہوسکتی ہے یا ہے، تو اس سے حسن مشترک کا پتا چلتا ہے۔لیکن یہ حسن مشترک آسانی سے حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا ترنم ریاض کے اسلوب کی یہ خوبی انہیں

بہرحال ممتاز کرتی ہے۔فن پارے میں شخصیت کا انعکاس اس وقت عیب بن جاتا ہے جب وہ ذات کا استعارہ بن جائے۔شخصیت سے تھوڑا فاصلہ ضروری ہے۔ وارث علوی کو ترنم ریاض کی کہانیوں سے شخصیت سے یہ فاصلہ نظر آتا ہے۔ترنم ریاض اپنی کہانیوں سے اپنی شخصیت کو جس طرح الگ کرتی ہیں اسے وارث علوی نفاست سے علاحدہ ہونا کہتے ہیں۔گویا یہ نفاست ہی ادب کے حسن کو بڑھاتی ہے۔اس مضمون میں وہ ترنم ریاض کی فنی ہنرمندی پر اس لیے اصرار کرتے ہیں کہ ان کا سروکار ذاتی ہوتے ہوئے بھی بالآخر آفاقی اور کائناتی ہوجاتا ہے۔اس پورے عمل کو وارث علوی صاف چھپتے بھی نہیں سامانے آتے بھی نہیں کا نام دیتے ہیں۔اگر اس ڈلر باکھیل پر غور کریں تو اس میں ایک عورت کا حسن اور اس کی تمام تر کیفیت سمٹی ہوئی معلوم ہوگی۔وارث علوی اس دلر باکھیل کو خطرناک کھیل کہتے ہیں۔وارث علوی نے ترنم ریاض کی کہانیوں کے ایک اور اہم وصف کی جانب متوجہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"ترنم ریاض کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انسانی تعلقات کے افسانے کو دوبارہ زندہ کیا۔"

انسانی تعلقات کو افسانے میں زندہ کرنا ایک بڑی دولت ہے۔ وارث علوی نے ان کی مختلف کہانیوں کے تجزیے میں انسانی تعلقات کی اس دھوپ چھاؤں کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔انسانی تعلقات کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔وارث علوی نے ان افسانوں کے تاریخی اسباب پر روشنی ڈالی ہے جن کے موضوعات فسادات اور قتل و غارت گری اور اس قسم کے دوسرے انسان کش واقعات ہیں۔ان مسائل نے انسانی تعلقات کو ثانوی حیثیت دے دی۔وارث علوی بعد کی اردو کہانی کو انسانی تعلقات کی بازیافت کا دور کہتے ہیں جن میں ایک نمایاں نام ترنم ریاض کا ہے۔شفق کا افسانوی مجموعہ 'وراثت' پر وارث علوی کی ابتدائی گفتگو بنیادی طور پر اس نکتے پر مرکوز ہے کہ افسانے کو کیا ہونا چاہیے اور شفق نے اس سے پہلے کے افسانوں میں فنی اعتبار سے جو ٹھوکر کھائی ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔اس حصے میں یہاں وارث علوی کا وہ خاص اسلوب بھی سامنے آتا ہے جن کی کاٹ سے بڑے سے بڑا ادیب بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔یہ بات بہت اہم ہے کہ وارث علوی کسی افسانہ نگار کے بارے میں اپنی پرانی رائے کو اس کی نئی تحقیقات کی روشنی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔یہ تو وارث علوی کی بڑائی ہے کہ ان کی نگاہ سے ہر درجے کے ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں کم یا زیادہ توجہ سے مگر گزرتی ضرور ہیں۔'شفق' کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی کہ شفق اب ایک کامیاب افسانہ نگار کی صورت میں سامنے آتا ہے لیکن وہ 'شفق' کی تمام کہانیوں کو کامیاب نہیں کہتے۔اس مضمون میں وارث علوی نے موضوعات و مسائل سے سروکار رکھا ہے لیکن موقع موقع سے یہ بھی بتاتے جاتے ہیں کہ شفق کی ہنرمندی کہاں اپنے جلوے دکھاتی ہے۔موضوعات و مسائل کی پیش کش میں کہانی کار کی ذہانت بصیرت ہی کہانی کو کہانی بناتی ہے:

"پیروڈی، آئرنی، طنز، مزاح، اسطور، تمثیل، گویا افسانوی اظہار بیان کے جتنے بھی ہتھکنڈے فکشن یعنی دنیائے افسانہ نے ایجاد کیے ہیں، شفق کو ان افسانوں میں ان کا استعمال کرنے کے مواقع میسر آئے ہیں اور انہوں نے ان کا خوب استعمال بھی کیا ہے۔"

شیر شاہ سید کی افسانہ نگاری میں وہ کم و بیش ان ہی رویوں سے بحث کرتے ہیں جو ان کے نزدیک کہانی کیلئے ضروری ہیں۔گرچہ موضوعات کا تنوع بھی ان کی نظر میں اہم ہے۔وہ عہدِ حاضر کے مختلف مسائل جن میں القاعدہ، بن لادن، بش، سیاست داں، پولیس وغیرہ شامل ہیں، کے سیاق میں لکھتے ہیں کہ شیر شاہ سید نے اس پورے انتشار کو جس طرح اپنے افسانے کا حصہ بنایا ہے اس کی کوئی دوسری مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔یہاں انہوں نے انتظار حسین کے اسطوری اور علامتی طریقہ کار کو بھی حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔یہ حوالہ شیر شاہ سید سے ان کے افسانوی اسلوب سے مماثلت کا نہیں بلکہ اختلاف کا ہے:

"شیر شاہ سید کے افسانوں کا زمانہ اس زمانے سے بہت مختلف ہے جو انتظار حسین کے افسانوں کا ہے۔انتظار حسین کا اسطوری اور علامتی طریقہ کار سید صاحب کے حشر ساماں عہد کی ہولناکیوں کو بیان کرنے کے لیے بہت کارگر ثابت نہیں ہوتا۔اس کے لیے حقیقت پسند طریقہ کار کی ہی ضرورت تھی جو واقعات کو چوکسائی سے بیان کرسکے اور کرداروں کے المیوں کو سامنے لاسکے۔"

یہاں وارث علوی نے شیر شاہ سید کے اسلوب کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔گویا حقیقت پسند طریقہ کار کی افسانے میں اپنی ایک اہمیت ہے اور اسے ہمیشہ اسطور اور علامت سازی کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔ہمارے نقادوں کو بھی اسطور اور علامت سازی کے مخلوط عمل اور فضا سے اب باہر آنا چاہیے ورنہ آج کا ایک بڑا افسانوی ادب ہمارے لیے اجنبی ٹھہرے گا اور ہم پرانی ڈفلی بجاتے رہیں گے۔ظاہر ہے کہ ہماری آج کی اردو کہانی پیش رو کہانی کاروں کے اسلوب سے بہت آگے نکل چکی ہے۔کہنے کو تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ وارث علوی نے اپنی افسانوی تنقید میں بڑی گنجائشیں پیدا کرلی ہیں اور بعض ایسے کہانی کار ان کی محفل میں باریاب ہوگئے ہیں جو وارث علوی جیسے صاحب علم اور صاحب فکر نقاد سے روبرو نہیں ہوسکتے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ وارث علوی اپنے فکر و احساس کی تمام تر بلندی کے باوجود ذرا نزدیک آکر بعض نئی اور پرانی آوازوں کو دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں اور اس پورے عمل میں ان کی انا کہیں حائل نہیں ہوتی۔'گنجفہ بازِ خیال' کے مطالعے سے ایک مرتبہ پھر ان فن کاروں کی طرف متوجہ ہونے کو جی چاہتا ہے جنہیں وارث علوی نے اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ظاہر ہے کہ ان کی باتیں بے دلیل نہیں ہیں بعض باتوں سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے لیکن 'گنجفہ بازِ خیال' سے نئی اردو کہانی کا ایک مسرت بخش اور حوصلہ افزا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔

☆

''بادشاہ اوروں کی خاطر''

ترنم ریاض

(دہلی، بھارت)

سن چھیانوے کے موسمِ گرما میں شملہ کے راشٹری پتی بھون میں منٹو پر ایک سیمینار میں پروفیسر وارث علوی کی تقریر سنی، یعنی فن کے پیالے سے آگہی کی درافشانی ہوتی دیکھی کہ علم کا ایک بحرِ بیکراں خورشید ہا کی ضیا سے منعکس ہو کر جہانِ دانش پر نور بکھیر رہا تھا۔

میں نے اس سے کچھ تین چار برس قبل ذرا سنجیدگی سے لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا کہ بچے باقاعدہ سکول جانے لگے تھے اور کئی گھنٹے کا دن میرے اختیار میں ہوا کرتا۔ یہ ایک ہمہ زبان سیمینار تھا جس میں اردو کے بھی بعض اہم دانشوران حضرات نے شرکت کی تھی۔ پہلی بار اردو کی ادبی تقریریں سنی تھیں کہ زیادہ تر امتحانات میں نے سائنس کی طالبہ کی حیثیت سے پاس کئے تھے بلکہ شرکت کی دعوت پا کر، حسبِ عادت خاصی تحقیق کے بعد، منٹو پر ایک مقالہ لکھا تھا جو بے حد سراہا گیا تھا۔

پروفیسر علوی کی تقریر، لہجہ، تلفظ اور دنیا بھر کے لٹریچر پر قدرت، ان کے تنقیدی ذہن کی تخلیقی مہارت اور تجزیاتی خداوندی کا ملکوتی تسلسل دیکھ کر میں اپنی نشست پر منجمد سی ہو گئی۔ میں نے میز کی دوسری طرف بیٹھے اپنے شوہر ڈاکٹر ریاض پنجابی کی جانب دیکھا کہ کہیں میرے چہرے پر ہونقوں والے تاثرات تو نہیں دیکھ لئے اور جلدی سے نگاہیں دوسری طرف موڑ لیں کہ یہ میرے دوست بھی واقع ہوئے ہیں مگر بعد کو تصادم کے وقت ایک طعنے کا اضافہ ہونے کا خدشہ پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر وہ بھی دیگر سامعین کی طرح ہمہ تن گوش تھے۔ اصل میں سبب یہ تھا کہ پروفیسر علوی کی زبان جہاں ایک طرف کشمیری رباب کا صوفیانہ سنگیت منکشف کر رہی تھی وہیں میرے لئے بعض الفاظ ایسے مشکل تھے گویا طبلہ نواز نے 'زیر' پر ہاتھ ساکت کر کے 'بم' پر کچھ زیادہ زور کی تھاپ لگا دی ہو۔ اور ابھی علم کے درویشانہ تکیے پر نیم مجذوبانہ، فنا فی القلم نو وارد کی طرح میں اقتباسات کے حسن اور حسن میں پنہاں علم کو ذہن میں اتارنے کی کوشش کر ہی رہی ہوتی کہ آنے والے کسی اور انجانے لفظ یا نئی ترکیب کے سحر سے محظوظ گاہے حیران تو گاہے پریشان ہو جاتی۔

والدِ محترم نے، کہ خدا غریقِ رحمت فرمائے، مطالعے کی بابت سمجھایا تھا کہ کتاب پڑھتے وقت چیزوں کو یاد رکھنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں ہے، جو باتیں پُر اثر ہوں گی خود ہی یاد رہ جائیں گی۔ سو جو باتیں پروفیسر صاحب کو سنتے ہوئے یاد رہیں ان میں آگہی ہی آگہی تھی اور اس کے ساتھ تشفی بھی بلکہ علم کے اس سمندر سے مزید موتی چننے کی آرزو اور تشنگی بھی کہ ذہن نے انہیں بطورِ استاذی بلند ترین مقام پر فائز کر دیا۔ اور ہاں بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایکسپریشنز کے معاملے میں استادِ محترم کی بیباک صاف گوئی نے ذرا حیران بھی کر دیا کہ آخر کو عورت ذات کا خاتونِ خوش کلام ہونا ضروری ٹھہرا مگر پھر پروفیسر صاحب کے اسلوب کا یہ تندو ترش حصہ تحریر سے کچھ ایسا میل کھاتا ہے کہ نہایت فطری معلوم ہوتا ہے اور کہیں پر بھی ناشائستگی کے ضمرے میں نہیں آ سکتا اور پھر یہ چیزیں اگر 'تجربات وحوادث' کی شکل میں ملی ہوں تو کیا انہیں لوٹایا نہیں جانا چاہئے۔ فنونِ لطیفہ میں تحریر کو ایک عظیم مقام دیا گیا ہے اور اسلوب میں جداگانہ رنگ پیدا کرنا ایک الگ فن ہے جو معنی کو تہہ دار نہ کیا کرتا تو پروفیسر علوی کی تحریریں دورِ حاضر کے جہانِ اردو میں رائج، پھیکے شوربے جیسی یکسانیت کی موجودگی میں ایسے مثالے دار کشمیری روغن جوش کا کام نہ کرتیں جس میں زعفران کی مقدار اچھی خاصی ہو۔

چیڑ اور صنوبر کے بلند درختوں کے درمیان تراشیدہ پتھروں سے بنی پُرشکوہ عمارت کے جس کشادہ کمرے میں سیمینار ہوا تھا، یہ وہی عمارت ہے جس میں ہندوستان کے بٹوارے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کے دو دروازے ہیں، گو کہ یہ کوئی بڑا ہال نہ تھا جسے دو دروازے درکار تھے مگر بعض اوقات انسانی انا اس قدر بڑی ہو جاتی ہے کہ شخصیت سے پہلے نظر آنے لگتی ہے۔ اور اگر یہ روائت کسی حقیقت پر مبنی ہے تو افسوس ناک ہے کہ پنڈت جی اور مسٹر جناح دونوں اس تاریخی فیصلے کے لئے بیک وقت کمرے میں داخل ہونا چاہتے تھے اور اسی لئے دیوار میں دوسرا دروازہ ترشوایا گیا تھا۔ پھر انہیں بھی یہ اندازہ کہاں رہا ہوگا کہ تقسیمِ ہند سے تاریخِ انسانی میں ایک ایسے خونیں باب کا اضافہ ہوگا جس کی مثال تہذیب یافتہ دور کی دنیا میں اور کہیں پائی نہیں جاتی کہ قتل وخون ہنوز کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے، دونوں ہی جانب۔ اور جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو وہ وہاں بھی فیل ہو گئی اور یہاں بھی اور ایک 'دیسی نوآبادیاتی' نظام کی شکل میں نمودار ہو کر مضبوط ہو چکی ہے کہ مفلس کے پاس اب گنوانے یا بچانے کو کچھ نہیں رہا اور دولت مند مزید مالدار ہو گیا اور یہ سلسلہ روز بروز مزید شدید اور ساتھ ہی تشویش ناک ہوتا جا رہا ہے۔ سچ پوچھئے تو جمہوریت کا لفظ کل عالم میں ہی ایک دھوکہ ثابت ہوا ہے۔ اتنی خوبصورت دنیا سے حضرتِ انسان نے کیا کیا بدصورتیاں منسلک کر ڈالی ہیں۔ یہ یک قطبی تصور میں پنہاں حقِ ملکیتِ عالمی کا شوقِ سودائی، یہ نسل پرستی کے رجحان میں نیم عیاں دولت پرستی، اور یہ نج کاری کہ مہلک بیماری جہاں سادہ اور معصوم انسانوں کے سکھ چین کا خاتمہ ہے تو غیر کی ناعاقبت اندیشی کے ساتھ ساتھ اپنوں میں دور اندیشی کے فقدان کا بھی نتیجہ ہے۔ اگر دولت اور سیاست ایک سکے کے ہی دو رخ بن جائیں تو بادشاہت کہلائے گی، طوفان اٹھائے گی۔

ناانصافیوں کے خلاف بلند ہونے والی کسی بھی آواز یا تحریک کو اہل

درد، کہ دنیا کے ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں، ہمہ وقت خوشامدید کہنے کے لئے تیار ہی نہیں بے قرار بھی رہتے ہیں بشرطیکہ ایسے رجحانات میں مساوات، اعتدال اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے کہ جذبہء شدت زوال کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اور اس کی غیر موجودگی پائیداری کی ضمانت۔ اور اس کرچی کرچی دنیا میں ایسا ہی کوئی رجحان امید افزا ہوسکتا ہے کیوں کہ بقیہ تمام راستے مسدود نظر آتے ہیں کہ،

وہ کرّہء ارض زخمی کر رہے ہیں
لہو کے جا بجا دھبے پڑے ہیں
کسی کے ظلم سے زِچ ہیں جواں اور
ردا بارُود کی خود اوڑھتے ہیں
(ت ر)

شملہ کی اس قدر خوبصورت عمارت سے کیسی عجب کہانی جڑی ہے۔ دور دور تک ہریالی سے لدی زمّر دنگاری سی پہاڑیوں کی مالا کے درمیان نیلم کی طرح جڑی، نیلاہٹ مائل سرمئی پتھروں سے بنی عمارت کو انگریز بہادر بلکہ چالاک انگریز کی ہندوستانی سرکار نے سن ۱۸۶۴ میں تعمیر کروایا تھا اور یہ وائس ریگل لاج کہلاتی تھی کہ شملہ کو گرمائی راجدھانی بنایا گیا تھا۔ ۱۹۴۵ اور ۱۹۴۷ کی شملہ کانفرنسیں یہیں ہوئی تھیں۔ اور ہندوستان کے دو حصے اور پاکستان کی ریاستیں مشرقی اور مغربی پاکستا ن کا ٹکڑا (آج کا بنگلہ دیش) اسی کانفرنس ہال میں طے پایا تھا جو آج کل سیمینار ہال کہلاتا ہے کہ بعد کو ۶۰ کے دہے کی شروعات میں فلسفی اور ادیب صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے اہم علمی شخصیات کے لئے علم و دانش کی مزید تشفی کی خاطر، ایک بہترین مقام کے طور پر تجویز کیا۔

بہر حال اس سیمینار کے کوئی دس برس بعد کی بات ہے کہ ساہتیہ اکادمی نے 'اردو کی نئی بستیاں' موضوع پر سیمینار منعقد کیا۔ عاشقین اردو دنیا بھر سے اور شائقین اردو شہرِ دلی کے گوشوں سے نکل کر آ جمع ہوئے۔ ہاں مرے میاں ڈاکٹر ریاض پنجابی بھی بڑے ڈائی ہارڈ قسم کے عاشقِ اردو ہیں کہ ایک وقت اردو میں اچھی اچھی کہانیاں لکھا کرتے تھے جو کتاب (لکھنو) علی گڑھ میگزین، آوازیں (علی گڑھ) گفتگو (بمبئی) اور شب خون (الہ باد) جیسے رسالوں میں چھپا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر پنجابی نے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے پرایویٹ ڈائننگ حال میں ایک شام دعوت کا اہتمام کروایا۔ ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے کہ پروفیسر علوی مداحین میں گھرے نازک سا گلاس ہاتھ میں لئے اپنی منفرد بذلہ سنجی سے اپنے اسلوب ہی کی طرح حاضرین کو بیک وقت حیران اور محظوظ کئے دے رہے تھے کہ باتوں کے دوران ان کی نظر دہنی جانب اٹھی جہاں لندن سے تشریف فرما رضا علی عابدی صاحب ہندو پاک، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ سے، خود، یا اپنے میاں لوگوں کے ساتھ آئی خواتین میں گھرے اپنی آواز اور انداز کا جادو بکھیر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب ایک قدم آگے بڑھے اور مسکراتے ہوئے کچھ یوں گویا ہوئے،

''رضا علی عابدی، تم خواہ کتنی ہی حسین عورتوں کے درمیان کھڑے ہو جاؤ، نظریں تمہاری ہی جانب اٹھتی ہیں۔'' اس جملے سے محفل لالہ زار ہوگئی اور عابدی صاحب اپنی مخصوص بی بی سی اردو سروس والی سحر انگیز آواز میں ہنس پڑے۔ نیوز ریڈر ہونے کے ناطے مجھے علم تھا کہ لوگوں نے ان کے الفاظ کی ادائیگی سے برسوں تحریک حاصل کی ہے اور سرینگر میں بھی ہم شروع سے ہی انہیں سنا کرتے تھے جہاں ان کی زبردست قسم کی فین فالوئنگ آج تک چلی آ رہی ہے۔ میرے خیال میں وائس آف امریکہ ریڈیو کی اردو سروس کے خالد حمید اور بی بی سی ریڈیو کے رضا علی عابدی اردو کے بہترین خبر گو اور براڈ کاسٹرس میں شمار ہوتے ہیں۔

اس سیمینار میں پروفیسر مغنی تبسم بھی تشریف لائے تھے مگر اس دن علیل تھے شام کو آ نہ سکے۔ کچھ برس قبل وہ مجھ پر شعر و حکمت میں گوشہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ کہانیاں اشعار و نظمیں وغیرہ حاضرِ خدمت ہیں مگر میری تحریروں پر کچھ ایسے اہم مضامین نہیں ہیں جو گوشے کی زینت بنیں۔ انہوں نے پھر بھی گوشہ شائع کیا اور اداریے میں میری تخلیقات کے بارے میں ایک اقتباس ایسا تحریر کیا جس سے مجھے اپنے قلم پر کچھ فخر سا محسوس ہوا۔ کسے معلوم تھا کہ وہ ہم سے اس طرح بچھڑ جائیں گے۔ انتقال سے کوئی دو ماہ قبل میں نے فون کیا تھا تو فرمایا کہ اپنی کچھ چیزیں شعر و حکمت کے لیے ارسال کروں اور اگلے لمحے بڑی اداس سی آواز میں کہا کہ ذرا ٹھہر جایئے شہر یار بیمار ہیں۔ اچھے ہو جائیں تو۔ پھر خاموش سے ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ خود اس قدر علیل ہیں۔ انتقال کے بارے میں سن کر میری سمجھ میں ان کی خاموشی اور اداسی آئی تو آنکھیں نم ہوگئیں۔ شہر یار میرے میاں کے محترم علیگ دوست تھے۔ عالمی اردو کانفرنس اسلام آباد میں، ہم لوگوں کے ہمسفر رہے تھے۔ لوگ ان سے اُدھر بھی یکساں محبت کرتے تھے۔ قمر رئیس صاحب بھی ساتھ تھے۔ خلوص اور انسانیت کے پیکر اور ساجد رشید بھی جو کس قدر بے وقت چلے گئے۔ موت و وت کے بارے میں اللہ میاں جانتے ہیں، انسان کے لئے یہ سانحہ ہی ہوتا ہے خواہ دنیا بزرگی کو اس سے جوڑتی رہے مگر جینے والے تو سو سال جی جاتے ہیں۔

مغنی صاحب کی ایک نظم 'آخری شام' لکھ رہی ہوں کہ،

''اب کوئی رات نہیں آئے گی
خواب ٹوٹے ہوئے لفظوں کے بکھر جائیں گے
کوئی آواز نہ آئے گی نظر
کوئی چہرہ نہ سنائی دے گا
دشت قدموں کو نہیں پائیں گے
تو مری یاد سے آہستہ گزر۔''

بہر حال، رہے نام اللہ کا۔

پروفیسر علوی نے غالباً ہماری کوئی کہانی کسی رسالے میں پڑھی تھی کہ

فرمایاان کی خدمت میں اپنی کتابیں ارسال کروں۔ہم نے اپنی پہلی کتاب کچھ ایسے لوگوں کو جن کے بارے میں خیال تھا کہ ناقدین میں شمار ہوتے ہیں،بھیجی تھی۔بعض ایک نے رسیدی فون تک نہیں کیا۔لوگ کہتے ہیں کہ ہماری کوئی کہانی بری نہیں تو پھر کتاب کو ایکنالیج نہ کرنا کیا تنقید کے اصولوں کی نفی نہیں کرتا۔جب ہم خاصے بے وقوف ہوا کرتے تھے(ویسے اب بھی ہیں)اور کچھ باتوں کو ہم نے فار گرانٹڈ لے رکھا تھا۔مثال کے طور پر یہ کہ ہر سینئر اپنے جونیئر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے خواہ غلطی پر سرزنش کر کے ہی کیوں نہ ہو۔اور اگر کسی تحریر میں طاقت ہے تو اس بات کا ذکر نہ کرنا ادبی بددیانتی ہے،وغیرہ قسم کے۔مگر وقت کے ساتھ ساتھ بڑی عجیب باتیں پتہ چلیں جیسے یہ کہ بعض مشہور لوگ بھی کسی نئے لکھنے والے کی اچھی تحریر سے اس درجہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں کہ عناد سینچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں،کمزور ادیب اور نان رائٹرس کی تو بات ہی نہیں کہ وہ کامیاب تحریر دیکھ کر بوکھلا اٹھتے ہیں اور کسی بھی معرکے کے فن پارے پر اپنی غیر درست زبان میں بڑی احمقانہ خوداعتمادی کے ساتھ بیمار قسم کی تحریریں شائع کرواتے ہیں۔

بہرحال ادبی سیاست سے اپنی لاعلمی کے باوجود ہمیں اپنی تحریر کی ایک ایک سطر پر جب بھی اعتماد تھا۔

جب پروفیسر علوی نے ہماری کتابوں پر ایک طویل مضمون ارسال کیا تو ظاہر ہے کہ اس کیلیبر کے نقاد کا اپنی کہانیوں پر لکھا اسی (۸۰) صفحات کا مضمون میرے لئے باعثِ سعادت تھا کہ پروفیسر صاحب محقق ہونے سے پہلے نقاد ہیں جبکہ ہمارے ہاں یہ ہی چلن رائج ہے کہ ہر محقق نقاد کہلانے کے درپے ہوتا ہے بھلے ہی اس نے کسی موضوع پر پچاس بار ہو چکی تحقیق دہرائی ہو۔اُس وقت تک ہمارے تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے تھے۔اور کچھ تنقیدی کتب،تراجم اور ایک ناول بھی چھپا تھا۔آمد اور آورد کی تحریر کے بارے میں ہر فن کار جانتا ہے اور اس کا تجربہ ظاہر ہے کہ قلم کار کو بھی ہوتا ہے۔تخلیق کا پارکھ وہی ہے جو تخلیق کی تحریری صورت کے کسی دوسرے ذہن میں وقوع پزیر ہونے والے محرکات کی نشاندہی کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور وہ بھی تخلیقی قدرت۔پروفیسر صاحب نے میری ہر کہانی کا تجزیہ کچھ ایسے کیا جیسے انہوں نے خود وہ کہانی لکھی ہو یا انہیں میں نے بتایا ہو کہ میرے افسانے کے وجود میں آنے کا سبب فلاں فلاں واقعہ بنا تھا کہ انہوں نے تحریر کے تاریخی،جغرافیائی،دنیاوی،ملکی و ذاتی محرکات کی بھی تفصیل لکھی۔ان کی کتابوں میں مختلف نگارشات کے مطالعے کے بعد قاری ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ پروفیسر علوی فن پارے کے اندر اتنی گہرائی تک اتر جاتے ہیں کہ اس کے محرکات اور اس سے جڑے تخلیقی اسرار و رموز کا سراغ پا لیتے ہیں۔

عرض یہ کرنا تھی کہ میری کہانیوں پر لکھے مضمون میں پروفیسر صاحب نے ایک جملہ لکھا تھا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ترنم ریاض کی ہر کہانی بہت اچھی ہے مگر اچھی کہانیاں اتنی وافر مقدار میں ہیں کہ ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔

ہم نے فون کیا کہ استادِ محترم ہماری کون سی کہانی اچھی نہیں ہے تو فرمایا کہ مشکل تو یہی ہے کہ آپ کی کوئی کہانی بری نہیں ہے مگر میں محض تعریف ہی نہیں کروں گا تا کہ آپ مزید لکھ کر اردو ادب کو مالا مال کرتی رہیں۔ہم نے ڈرتے ڈرتے ایک اور سوال داغ دیا کہ کہانی 'یمبرزل' پر کچھ تفصیلی ذکر نہیں ہے تو فرمایا کہ یہ افسانہ ایک الگ مضمون طلب کرتا ہے۔جو غالباً وہ مستقبل میں لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔اس کے بعد میرا چوتھا مجموعہ 'میرا رختِ سفر' شائع ہوا تو محترم استاذی نے مجھے ایک ایک کہانی پر مبارک باد دی۔اور ملک وغیر ملک سے کچھ اچھے ریویوز آئے بھی مگر ایک زیادتی یہ ہوئی کہ ناول 'برف آشنا پرندے' جو میں چار پانچ برس سے لکھ رہی تھی،۲۰۰۹ میں شائع ہوا اور ایک دم مشہور ہو گیا۔کئی ایڈیشن نکلے۔لوگوں کی توجہ ناول کی طرف مبذول ہو گئی اور افسانوی مجموعے کو تا دمِ حال اس کا حق نہیں ملا۔

میرا ایک یقین ہے کہ اچھا انسان ہی شفاف فن کی تخلیق کر سکتا ہے۔میرا دوسرا یقین اس بات پر بھی ہے کہ فن کی دیانت دارانہ پرکھ کے لئے نقاد کے یہاں کہیں نہ کہیں تخلیقیت کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

کچھ وقت قبل گنتر گراس نے اسرائیل کی سیاسی پالیسی کے خلاف ایک نظم کہی اور اپنے بڑوں کے نازی ہونے کی کھل کر بات کی۔قلم کار کو ایسا ہی دیانت دار ہونا چاہئے،تخلیق میں،خواہ تنقید لکھتے وقت۔اور ہمارے ذی وقار پروفیسر صاحب اس بات میں بھی کھرے اترے کہ نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پرواہ ہے۔انہوں نے بس اپنا کام کیا۔علم کا ایک سمندر ان کے ذہن میں ہمہ وقت موجزن رہتا ہے۔ادب کے ساتوں برِ عظم ان کے تخیل کے پردوں پر چوبیسوں گھنٹے تاباں و رقصاں ہوا کرتے ہیں۔ماتھے پر آڑی شکنیں ڈال کر اور آنکھیں سکیڑ کر لٹریچر کے بحرِ بے کراں کی تہہ سے بڑی آسانی سے جب وہ تاریخ وتنقید کا کوئی موتی نکال کر اپنے سامع یا قاری کی طرف اچھال دیتے ہیں تو اسے پہلی کوشش میں سمجھ لینا اتنا ہی دشوار ہوتا ہے جتنا کہ دوسری کوشش میں۔تیسری کوشش میں جہانِ معنی کی گرہ ذرا نرم ہوئی معلوم ہوتی ہے اور چوتھی کوشش میں علم کی اوپری سطح سے انسان متعارف ہوتا ہے۔پانچویں کوشش میں دبیز دبیز پرتوں کے مہین مہین پردے سرکتے محسوس ہوتے ہیں اور چھٹی کوشش میں دانش و آگہی کے نور سے،متجسس ذہن کے طُور پر انکشافات کی ایسی تجلی شعائیں بکھیرتی ہے کہ اس کے آگے کسی اور منطق،کسی اور علم کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پروفیسر علوی کی زبان شیکسپئر کی تنقیدی زبان کی طرح تخلیقیت سے اس قدر بھرپور ہوتی ہے کہ تخلیق کا دلدادہ مزاج مکمل تشفی حاصل کرتا ہے۔

مثال کے طور پر ان کی نئی کتاب 'بت خانۂ چین' کے ایک مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں کہ،

'ناول اور افسانے میں زبان کی مختلف سطحیں دیکھی جا سکتی ہے۔کبھی زبان حد درجہ شاعرانہ ہوتی ہے کبھی نثری،کبھی کھردری بنتی ہے کبھی نازک اور لطیف۔کبھی زمین کے قریب رہتی ہے کبھی تخیل کے پر لگا کر اڑتی ہے۔کبھی

اس کا رنگ طنزیہ یا مزاحیہ ہوتا ہے کبھی غنائی اور کیف آور۔ افسانوی بیانیہ میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ تاریخی، دستاویزی اور صحافتی سطح سے لے کر فلسفیانہ، غنائی اور تجریدی سطح کی بلندیوں کو چھو سکے۔'

پروفیسر علوی کے یہاں جو ایک منفرد سا اپروچ اور ایک الگ سا اپنا لیٹیکل پاور نظر آتا ہے، وہ کوئی آسان معاملہ نہیں ہے۔ اس کے لئے فنونِ لطیفہ سے وابستہ، دنیا بھر کے علم کو پی لینے کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن اور اطالوی زبان کے شعر ادب کو اپنی نسوں میں اتار کر روانیِ خوں میں شامل کرنے کے علاوہ شعور اور تحت الشعور کی کئی سطحوں پر ہوش سنبھالنے کے بعد سے مسلسل بسائی ہوئی جستہ جستہ انفارمیشن، قریہ قریہ سیکھی ہوئی تاریخ اور جغرافیہ، لمحہ لمحہ ملک غیر ملک میں دیکھی ہوئی ادبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورت حال، نئی چیزوں کو قبول کرنے کی جدت طبعی، ملکہ ایلزبیتھ اور شیکسپیئر کے زمانے کے ریناساں اور فنونِ لطیفہ کی دیگر اصناف کا مشاہدہ، اور اُس نشاطِ ثانیہ کا اثر قبول کرنا کہ ریناساں سے کوئی بھی ذی عقل متاثر نہ ہونا ایفورڈ نہیں کر سکتا۔ وہ کالج کے دنوں میں بھی بنگال کے اہم ادیب ایم این رائے کی تحریروں میں ایسے کھو جاتے تھے کہ کچھ پا کر ہی ہوش میں آتے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے مراٹھا حکومت کے زوال کے بعد گجراتی ادب کا وہ انقلاب بھی دیکھا جب ممبئی میں کالج کے قیام میں آنے پر کہا گیا تھا کہ اب سورج نکلا ہے۔ گویا بنگال کا ریناساں، گجرات کا ریناساں۔ اردو کا ریناساں یا عناصرِ خمسہ کا دور۔ ان کے ذہن کی تربیت میں جن طاقتوں نے کام کیا وہ طاقتیں آج بھی زندہ ہیں اور پروفیسر علوی کا ذہن آج بھی دہائیوں پہلے کی مانند تر و تازہ ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ،

'' آرٹ کے سنجیدہ عمل کے لئے موضوع سخن کا عظیم، خوبصورت اور حیرت ناک ہونے کا تصور ٹھیٹ آرنلڈ تک زندہ رہا اور بے چارہ ناول تو پیدا ہی ہوا بورژوا طبقے کی آغوش میں جس کے حوالے سے عظیم خوبصورت اور حیرت ناک الفاظ کے معنیٰ تک نہیں سمجھے جا سکتے۔ بورژوازی کے پاس نہ تو اشرافیہ کے عوائدِ رسمیہ اور آدابِ محفل تھے اور نہ کسانوں کا اسطور ساز اور داستانی طرزِ تخیل۔ اور ستم ظریفی دیکھئے کہ یہی طبقہ ناول کا موضوع بنا۔ فلابیر نے یہ جوا کھیلا اور بازی جیتا۔ ایک معمولی اور عامیانہ موضوع کو نازک نکیلی اور کانپتی ہوئی سٹائل کے ذریعے ایک خوبصورت فن پارہ میں مبدّل کر دیا۔ حسن عسکری نے ٹھیک ہی کہا کہ فلابیر زندگی بھر یہی سمجھتا رہا کہ اسے مناسب موضوع کی تلاش ہے حالانکہ فی الحقیقت جس چیز کی اسے تلاش تھی وہ ہیَت تھی۔ فلابیر نے ایک طرف تو آرٹ میں عامیانہ موضوع برتنے کے MOCK- HEROIC کے رسمیہ طریقے کو از کار رفتہ بنایا اور دوسری طرف شاعرانہ اور غیر شاعرانہ موضوع کی مصنوعی تقسیم کا خاتمہ کیا۔ اب ہر وہ واقعہ ناول کا موضوع بن سکتا ہے جو تھوڑی بہت بھی انسانی دلچسپی کا حامل ہو۔ ناول کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ سامنے کی عامیانہ چیزوں پر بھی عظیم الشان آرٹ کی بنیاد رکھے۔''

علم و فہم کی ایسی درافشانی کے علاوہ ان کے زندگی کی طرف درویشانہ انداز کا بھی ہاتھ ہے کہ ادب کے تئیں یہ دیوانگی کسی ایجنڈے کے تحت نہیں، بلکہ ایک صوفیانہ تشنگی، ایک قلندرانہ سرشاری، ایک فنا فی ال مرشد قسم کی ریاضت کے جنون کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا ساتھ استادِ محترم کے لئے ایک ایسا میڈیٹیشن ہے گویا مرید اپنے پیر کی صحبت میں مراقبے میں ہو۔

مردِ دانا ہے اسے کب حرص کر پائی اسیر
بادشاہ اوروں کی خاطر، واسطے اپنے فقیر

(ت ر)

اصل میں تنقید کی روایت کسی بھی دور میں، کسی بھی زبان میں اس حال کو پہنچتی دکھائی نہیں دی کہ تعمیری انداز تو غائب ہوا اور تخریبی انداز گروہ بندیوں پر انرجی صرف کرنے پر اکساتا رہے۔ اور پھر بہت سے اردو والے بھی شخص پرستی کے کچھ ایسے قائل نکلے کہ اپنے اپنے بت کو پوجنا شروع کر دیا اور اس میں قاری کے سکوں آیند مطالعے کی کئی کئی دہائیاں ضائع ہو گئیں۔ کبھی بُت شکن حائل ہوتے نظر آتے کبھی بُت گر اور ایک کنفیوژن میں وقت گزرتا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا، اگر مشہور لوگوں نے باہم اپنی طاقت اردو کی بقا کے لئے استعمال کی ہوتی تو یقیناً ہندوستان میں آج اردو کی صورت بہتر ہوتی کہ اس زبان کی اہمیت ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیوں کہ اس کی مضبوط تاریخ اور لٹریچر، جنگِ آزادی کی کامیابی کے ضامن پر جوش، معنی خیز اور طاقت ور نغمے، قائدین اور عمائدین کی زبان اور تقریروں کے تراشے اور آوازوں کے ریکارڈ، زبانِ اردو کو پہلے کی طرح مستقبل کی زبان سمجھنے میں کوئی صورتِ حال مانع نہ ہونے دیتے۔ پروفیسر علوی ایسے تمام تضادات سے مبرا ہیں۔ فن کی بنیاد پر فن پارے کی پزیرائی کیسے ہوتی ہے، یہ بات ان کی ہر تحریر میں عیاں ہے۔ ملاحظہ ہو پروفیسر صاحب کی کتاب 'بت خانہء چین' سے ایک مضمون میں اواں گارد پر طویل بحث کا یہ حصہ،

''۔۔۔اواں گارد نوجوانوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے کہ اپنی اندرونی آگ سے شہاب ثاقب کی مانند آن کی آن میں جل بجھنے کا طریقہء دلبری انہیں ہی زیب دیتا ہے۔ اس لئے مجاز ہمارے یہاں ایک myth بن گیا ہے۔ پھونک دیا اپنے وجود کو۔ جتنی روشنی تھی لُٹا دی اور ختم ہو گیا کہ ستارے میں چمک جب ختم ہو جائے تو وہ محض ایک بھاری پتھر ہوتا ہے جس کی میڈیا پرتش کراتا ہے لیکن لوگ چوم کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اواں گارد پر سب سے خوبصورت نظم سردار جعفری نے ہی لکھی ہے۔ مزید حیرانی کی بات یہ ہے کہ نظم اواں گارد اور خصوصاً اس کی انفرادیت پسندی کے خلاف طنز ہے لیکن نظم میں ٹوٹتے ستارے کا استعارہ سردار جعفری کی ذہنی مزاحمت کے باوجود اپنی قیمت وصول کرتا ہے اور اپنی قدر منواتا ہے۔ یہ نظم سردار کی ابتدائی نظموں میں سے ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ عنوان ہے، 'ٹوٹا ستارہ'۔''

باقی صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ فرمائیں

''سخن گسترانہ بات''

شاہ فیصل (سوپور، بھارت)

وارث علوی ایک سچے، کھرے اور غیر جانبدار نقاد ہیں۔ شعر و ادب کے حوالے سے ان کی تحریریں کسی بھی طرح کی مصلحت پسندی، گروہ بندی، ادبی سیاست اور مفاد پرستی سے بالاتر ہوتی ہیں۔ وارث علوی پوری ایمانداری کے ساتھ اب تک وہی لکھتے رہے ہیں جو اُن کی نظروں میں چڑھ کر کھری اُترتی رہی ہیں۔ انھیں اس کی فکر قطعی نہیں ہوتی ہے کہ ان کی تحریروں سے کون خوش ہوتا ہے اور کون ناراض۔ اس کی عمدہ مثالیں گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید سے متعلق وارث علوی کی تحریریں ہیں۔ وارث علوی نے گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی امتیازات کی جہاں تعریف کی ہے وہیں ان دونوں بڑے ناقدین کے تسامحات پر گرفت بھی کی ہے۔ چونکہ وارث علوی کا مطالعہ لامحدود، نظر فراخ اور ادبی بصیرت غیر معمولی ہے۔ لہٰذا وہ کسی بھی فن پارے یا فنکار کے مقام و تجربہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کسی بھی طرح کی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیتے اور وہ دوسرے ناقدین سے بھی یہی توقع کرتے ہیں کہ وہ تنقید کے نام پر سیاست، گروہ بندی اور مصلحت پسندی سے کام نہ لیں۔ لیکن اردو تنقید میں وہ اعلیٰ ظرفی ابھی تک پیدا نہ ہوسکی یہی وجہ ہے کہ وارث علوی نے اپنی تمام تحریروں میں اردو تنقید اور نقادوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال وارث علوی کی پوری تنقید میں ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' ہے۔ جس میں وارث علوی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی تمام تر افسانوی نظریات اور شعریات کو ردّ کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ۱۹۸۶ء میں ''افسانے کی حمایت میں'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تو پورے اردو ادب پر سناٹا چھا گیا کیونکہ یہ کتاب افسانے کی حمایت میں نہیں تھی بلکہ اس کے خلاف تھی اور اس میں افسانے کی صنف کے متعلق ایسی حوصلہ شکن باتیں لکھی ہوئی تھیں کہ بڑے سے بڑے افسانہ نگار کا اعتماد افسانے پر سے بطور ایک معتبر صنف سخن اٹھ جاتا اور بڑی حد تک اٹھ بھی گیا۔ انھوں نے صاف لفظوں میں لکھا تھا کہ افسانہ ایک 3rd class صنف سخن ہے اور بہت سارے دلائل کے ذریعے سے اسے 3rd class ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد ایک عجیب خاموشی اردو ادب پر چھا گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی اہم صنف کا قتل ہوا ہے اور اس کی حمایت میں بولنے کے لیے کوئی نقاد یا افسانہ نگار سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ بھی محسوس کی جارہی تھی بلکہ فاروقی کا رعب داب اور خوف اردو والوں پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ کسی میں ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اگر اعتراض نہیں تو کم از کم احتجاج کے لیے صرف دو لفظ کہتا۔ اس صورت حال میں وارث علوی کی کتاب ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' سب سے پہلے سید عارف کے رسالے ''جواز'' ملیگاؤں میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی گویا اردو ادب میں ایک بھونچال آ گیا۔ پہلی بات تو یہ کہ ایک خدائے سخن کے سامنے اعتراض کی جرأت کی ہے دوسری بات یہ کہ پوری کتاب ایک ایسے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں لکھی گئی کہ فاروقی صاحب کی تمام دبدبے والی شخصیت پاش پاش ہوگئی۔ کسی نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ فاروقی صاحب کے خلاف ایسے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں ان کی افسانے کے خلاف ہر دلیل کا جواب دیا جائے گا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی بطور نقاد کے وارث علوی کی شخصیت، ان کی جرأت مندی ان کی نقطہ رسی اور بزلہ سنجی اور ان کے بڑے سے بڑے نقاد کو Debunk کرنے کے طریقۂ کار کا اعتراف چاروں طرف ہونے لگا۔ اس کے بعد لوگوں کے حوصلے کھل گئے اور فاروقی کی کتاب ''افسانے کی حمایت میں'' تو نہیں لیکن وارث علوی کی کتاب ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' کی حمایت میں بہت سی آوازیں سنی جانے لگیں۔ بقول سلام بن رزاق:

> ''وارث علوی نے اپنی کتاب میں فاروقی کی ایک ایک سطر کو اس طرح رگیدا تھا جس طرح فاروقی نے ''افسانے کی حمایت میں'' افسانے کو رگیدا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فاروقی کی کتاب کا غبار بیٹھنے لگا اور ادبی حلقوں میں وارث علوی کی کتاب کے چرچے ہونے لگے۔ اس کتاب نے فاروقی کو زبردست صدمہ پہنچایا۔ کہنے والے یہاں تک کہتے ہیں فاروقی آج تک اس صدمے سے باہر نہیں نکل پائے۔۔ واللہ اعلم''۔

وارث علوی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ انھوں نے یہ کتاب خود شمس الرحمٰن فاروقی کے نام معنون کی اور انتساب کے نیچے غالبؔ کا یہ مصرعہ لکھا۔

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات

ملاحظہ فرمائیں شمس الرحمٰن کی کتاب ''افسانہ کی حمایت میں'' کے چند اقتباسات جن کے ذریعے انھوں نے صنف افسانہ، اردو میں افسانے کی روایت اور جدید افسانے میں موضوع، مقصد، پلاٹ اور افسانے پن جیسے موضوعات پر مخالفت زیادہ کی اور افسانہ کو شاعری سے کم تر اور تیسری درجے کی صنف قرار دیا ہے۔

''کوئی ادیب ایسا نہیں ہے، جو محض افسانہ نگاری کے بل بوتے پر زندہ ہو۔ افسانہ پہلے بھی کوئی بہت اہم صنف نہیں تھا اور آج تو ناول کا دوبارہ احیا ہو رہا ہے۔ اس لیے آج افسانے کی وقعت پہلے سے بھی کم ہے۔۔۔۔۔ یہ بات تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ افسانہ ایک فروعی صنف ادب رہا ہے اور ادب کے خاندان میں اس کی حیثیت چھوٹے بیٹے کی سی رہی ہے جو اگرچہ گھر کا فرد اور کارآمد فرد ہوتا ہے لیکن ولی عہدی سے محروم رہتا۔۔۔۔ پوری ادبی میراث اور ادب کے مختلف اصناف کی اضافی اہمیتوں کا اندازہ لگاتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ افسانہ ایک معمولی صنف سخن ہے اور علی الخصوص شاعری کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا''۔

فاروقی کے رسالے ''شب خون'' میں شائع ہونے والے افسانہ

نگاروں اوراد یبوں کی ایک پوری جماعت فاروقی کے ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ خصوصاًفاروقی کے بیان کی تائید میں محمود ہاشمی نے فوراًوضاحت پیش کردی کہ:

''افسانہ مختصر ہو یا طویل یہ خالص ادب کے دائرے میں نہیں آتا۔ ادب یالٹریچر یا آرٹ نام ہے شاعری، مصوری، موسیقی کا۔لیکن یہ افسانہ بے چارہ خواہ مخواہ گیہوں کے ساتھ گھن کی طرف ادب کے چکر میں پڑاپس رہاہے''

یہ پورا منظر نامہ اردو افسانہ کے لیے انتہائی ہلاکت خیز تھا۔ اردو افسانے کوفاروقی نے داؤپر لگادیا تھا۔ چنانچہ وارث علوی نے اسی سنگین صورتحال کے پیش نظر یہ طویل مقالہ قلمبند کیا جس میں افسانے کی تنقید کے نام پرشمس الرحمٰن فاروقی نے اردوافسانے کی تخریب کی تھی۔اس ضمن میں وارث علوی نے نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں فاروقی کو اینٹ کا جواب پتھر سے دے کرانھیں باطل ٹھہرایااوراُن کی فکشن کی تنقید کوایک ڈراما قرار دیتے ہوئے لکھا:

''فاروقی کی تنقید سے جو ڈراما ابھرتا ہے اور جس کا ایک حصّہ باقاعدہ مکالمات میں لکھا ہوا ہے۔ وہ بیکیٹ کے ڈرامے کی مانند آقا اور غلام Bully and Victim کا عبرتناک منظر پیش کرتا ہے۔اس میں فاروقی ہزار دلائل کے ذریعے افسانہ کوتھرڈ کلاس صنفِ سخت ثابت کرتے ہیں۔ ان کے دلائل کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری آرٹ تو ہے ہی نہیں۔ سانڈے کا تیل بیچنے کی ایک قسم کی کوئی چیز ہے۔۔۔۔فاروقی نے افسانہ نگاروں کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے۔ان کے پاس سے فکشن کی روایت کا احترام چھین لیا۔اس خوداعتمادی اورافتخارکوختم کردیا جو ہرفن کارکو اپنی صنفِ سخن پر ہوتا ہے۔ جب افسانہ نگار لنجے، لنگڑے، یتیم وپسیر اور ذلیل وخوار ہوگئے تو پھر فاروقی ان کے سرپرست اور محافظ بن بیٹھے۔ گویا بزرگانہ انداز میں کہتے ہیں ''چلواٹھو، آنسو پونچھواوراپنے کام پر لگ جاؤاور افسانہ نگار دھول میں رگیدے ہوئے بچے کی طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، کپڑے جھٹکتے ہیں اور فاروقی کے پیچھے چل دیتے ہیں''

وارث علوی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''افسانے کی حمایت'' کے مختلف اقتباسات کونقل کر کے سب سے فرداًفرداً بحث کی ہے اوراپنے مخصوص ناقدانہ اسلوب سے جو وارث علوی کا مخصوص اسلوب ہے اسی انداز میں جواب دیا ہے۔مثلاًشمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ:

''دیکھئے ناول کے مقابلے میں افسانے کی وہی اہمیت ہے جو ہمارے یہاں غزل کے مقابلے میں رباعی کی ہے'' انھوں نے رباعی کو انگریزی سانیٹ کا ہم پلہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے ''شیکسپیئر اور ملٹن صرف سانیٹ نگار ہوکر نہ رہ سکتے تھے''۔[۲]

وارث علوی نے فاروقی پر الزام لگاتے ہوئے لکھا ہے کہ فاروقی نے بحیثیت نقاد کے رباعی کے بارے میں امجد حیدرآبادی کا تذکرہ تو کیا ہے مگر عمرخیاؔم کا اُن کے ہاں تو کوئی ذکر ہی نہیں ملتا، جس کی شاعرانہ عظمت کا دارومدار ہی رباعی پر ہے۔

فاروقی نے اردو افسانے کی اہمیت کوکم تر ثابت کرنے کے لیے ترقی پسندوں پرحملہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ترقی پسندوں نے افسانہ کواس لیےفروغ دیا کہ ادب سے جس قسم کا وہ کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیےافسانہ موزون ترین صنف ہے''۔

اس کے جواب میں وارث علوی نے لکھا ہے کہ:

''شاعری میں طب اور کھیتی باڑی کی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ مذہب اور اخلاق کی تلقینات بھی کی گئیں، بادشاہوں کے قصیدے بھی اور کینہ وعناد سے بھری ہوئی ہجویں لکھی گئی ہیں۔شعری بعد میں نثر کی اصناف کا استعمال غیرفنی اور پروپیگنڈائی مقصد کے لیے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔۔۔۔افسانہ اور ناول سے زیادہ شاعری انقلابی پروپیگنڈے کے لیے کارگر ہی ہے کہ تک بند سے تک بند شاعر بھی بڑھے چلو کہہ کراپنا کام بڑھا سکتا ہے''۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وارث علوی نے شمس الرحمٰن فاروقی سے نظریں ملا کر دو اور دو چار کی طرح گفتگو کی ہے اور پوری کتاب میں وہ لہجہ اور ٹون برقرار رکھا ہے جس کی مثال اردو تنقید میں کم ہی نظر آتی ہے۔اس کتاب میں وارث علوی کا دانشورانہ پھکڑ پن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔اس کتاب میں وارث علوی کے اندر رہا ہوا طنز نگار اور ڈراما نگار نقاد نے خوب کھیل کھیلا لیکن اپنی تمام فقرہ بازی اور ہاسو پن کو کام میں لاتے ہوئے بھی فکشن کے معاملات میں ایسی جزرس اور فکرانگیز باتیں کہی ہیں جو ہمارے یہاں فکشن کے سنجیدہ تنقیدی مقالات میں بھی نظر نہیں آتے۔ وارث علوی اگر ایسا نہیں کرتے تو یقیناً بہت سے افسانہ نگار احساسِ کمتری کا شکار ہو کر افسانے کو دوسرے درجے کی صنف سوچنے پر مجبور ہوتے۔ پروفیسر فضیل جعفری ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وارث علوی نے ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' میں فاروقی کے ذریعے اٹھائے جانے والے ہرسوال اور ہر اعتراض کا جواب اپنے طور پر اور اپنے انداز میں دیا ہے۔انھوں نے گن گن کر فاروقی کی ہر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے۔اس طرح فکشن کی تنقید کا المیہ مناظراتی کتاب تو ہوگئی ہے لیکن دلچسپی سے خالی نہیں۔ اگر وارث علوی ایسا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ بہت سے قارئین ہی نہیں خود افسانہ نگار بھی احساس کمتری کا شکار ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے کہ افسانہ واقعی ایک ناقابلِ توجہ صنف ہے''۔

تقی حسین خسرو ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"This book has 24 chapters and focuses on Farooqui's book, Afsanay ki himayat mein, in which Farooqui not only seems

to have defend the modern short story, but has also specially commanded some short story writers. He views their writings as an improvement on the earlier form which was realistic. But Alvi is irked by his form of writing which appears to him to be a meaningless exercise loaded with ignorance and self pity. He concedes that this may be a sort of reaction to the overemphasis on the external aspects of life and the chaos which surrounds us. A crack has now developed between human relationship and literature with the latter becoming more and more loud and propagandist in form and content".

وارث علوی نے اپنی تصنیف ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' میں شمس الرحمٰن فاروقی کے لب ولہجہ، اندازِ بیان اور افسانے کے بارے میں رائے اور خود پرستی کے حوالے سے فاروقی کے تعصّبات اور غیر تنقیدی تصورات ومفروضات کی نشاندہی تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ جنھیں اجمالاً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانہ اور افسانہ نگاروں پر ناقدانہ رائے کے بجائے افسرانہ نگاہ ڈالی ہے۔

۲۔ فاروقی نے اپنی تنقید میں رواداری نہیں برتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی بے جا تعریف کر کے ان کی دوستی حاصل کی ہے۔ بے جا تعریف اور مداحی کی مثال محمود ہاشمی کے بارے میں فاروقی کی وہ تحریر ہے جس میں فاروقی نے محمود ہاشمی کو ''جدید اردو تنقید کا نمائندہ نقاد کہا تھا حالانکہ ان کی کوئی اردو تنقید میں اہمیت ہی نہیں ہے۔ ص:۲۳

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی احباب کی تعریف کے ہی نہیں خود کی تعریف کے مواقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ص:۲۳

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی مشرقی اور مغربی ناقدین سے کھل کر استفادہ کرتے ہیں لیکن بڑی ڈھٹائی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھوں نے جو بات کہی ہے وہ مشرق ومغرب میں کسی نقاد نے نہیں کہی ہے۔ ص:۲۳

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی اپنی تنقید میں مثالیں بہت دیتے ہیں۔ مثالوں کا انھیں خبط ہے۔ لیکن ان کی مثالیں بھی عذاب ہوتی ہے۔ مثلاً فاروقی کے مطابق افسانہ گلی ڈنڈا ہے اور ناول کرکٹ یا ٹینس۔ ص:۳۱

۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی یہ مانتے ہیں کہ اردو میں چیخوف، موپاساں اور ٹامس مان کے ہم پلّہ افسانہ نگار نہیں ہیں۔ ص:۳۴

۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی یہ مانتے ہیں کہ افسانہ اتنی گہرائی اور باریکی کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا جو شاعری کا وصف ہے۔ ص:۳۴

۸۔ فاروقی نے فرض کرلیا ہے کہ اگر حالؔی کے دَور میں افسانے کا وجود ہوتا تو وہ شاعری کو یک قلم مسترد کر کے افسانہ نگاری کی تلقین کرتے۔ ص: ۳۴

۹۔ فاروقی کے مطابق اردو میں بمشکل درجن بھر واقعی زوردار افسانے لکھے گئے ہیں اور وہ بھی مختلف مجموعوں میں دفن ہیں۔ ص:۳۹

۱۰۔ فاروقی کہتے ہیں افسانے بھی انھیں لوگوں نے لکھے جو اصلاً ناول نگار تھے۔۔۔ کوئی ایسا نہیں ہے جسے ہم محض افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ص:۴۱

وارث علوی نے اپنی تصنیف ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' میں فاروقی کی افسانے کی تنقید سے متعلق مذکورہ بالا خیالات یا تعصّبات سے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور دلائل کے ساتھ فاروقی کی ایک ایک رائے، ایک ایک مفروضے کو غلط اور غیر دانشمندانہ قرار دیتے ہوئے مسترد کیا ہے۔ گویا یہ ثابت کردیا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی شاعری کے تعلق سے چاہے جتنے بھی بڑے نقاد کیوں نہ ہوں، لیکن فکشن کی تنقید کا فریضہ انجام دینے سے وہ قاصر رہے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''فاروقی کی زیرِ تبصرہ کتاب بھی بتاتی ہے کہ فکشن ان کے بس کا روگ نہیں۔ دراصل فکشن میں وہ ڈوبتے نظر آتے ہی نہیں تو تیریں گے کیا؟ ڈوبے اور وہ بھی افسانے کے چلّو بھر پانی میں''۔

وارث علوی نے دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی تحریروں سے اردو افسانے کے صنفی وقار، اردو افسانہ کی محترم روایت اور افسانہ کی خود اعتمادی کو ٹھیس ہی پہنچی ہے۔ وارث علوی نے فاروقی کی تنقید کو ''تجریدی تنقید'' کا نام دیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن فاروقی نے ان شاعروں کے یہاں مختلف اصناف پر طبع آزمائی کے حوالے سے جس طرح بعض اصناف کو بڑی اور بعض کو چھوٹی قرار دیا ہے۔ وارث علوی نے اس پر شدید نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ اصناف کے چھوٹے بڑے ہونے کا مطالعہ ان اصناف میں شاعروں کے انفرادی کارناموں کے ذریعے نہیں کیا جاتا بلکہ اصناف میں شاعری کا جو کچھ سرمایہ ہے اس کے مطالعہ کے ذریعے یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اصناف میں اعلیٰ شاعری کی مقدار کتنی ہے اور اعلیٰ شاعری کے امکانات کتنے ہیں۔

وارث علوی نے ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' میں جس طرح شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری کی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے اس سے یہی

ثابت ہوتا ہے کہ اردو فکشن کی تنقید کا سب سے بڑا المیہ فاروقی کی فکشن کی تنقید ہے جس سے اردو میں فکشن اور فکشن نگاروں کو کوئی روشنی تو نہیں ملی البتہ اردو میں فکشن کی تنقید کی غلط، منفی اور مصلحت پسندانہ تنقید کی روایت ضرور مستحکم ہوئی۔ اسی لیے وارث علوی نے اپنی اس تصنیف میں فاروقی اور ان کی فکشن کی تنقید کے لیے کئی مقامات پر بہت ہی سخت فقرے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً

۱۔ فاروقی کی تنقید، تنقید نہیں گلی ڈنڈا ہے۔ ص:۵۲

۲۔ فاروقی لفظوں کی گرفت کرنے والے زبان کے استادوں کا مزاج رکھتے ہیں۔ ص:۶۴

۳۔ فاروقی کی تنقید میں کٹھ ملّاؤں کی طرح ضد ہے۔ ص:۹۴

۴۔ فاروقی افسانوں کی مثال سامنے نہیں رکھتے۔۔۔ انھیں اپنی مثال آپ تخلیق کرنے کا لپکا ہے۔ ص:۱۰۸

۵۔ فاروقی کے یہاں اکثر بیان حماقت کا ہمالیہ دستار فضیلت باندھے کھڑا ہوتا ہے۔ ص:۵۸

وارث علوی نے ’’فکشن کی تنقید کا المیہ‘‘ میں فاروقی کی اتنی خامیوں اور غلط بیانیوں کی نشاندہی کی ہے کہ اس کے بعد فکشن کی تنقید کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی پر کوئی قاری بھروسہ نہیں کرسکتا اور یہ وارث علوی نے فاروقی کے ساتھ کسی ذاتی بُغض کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اردو میں تنقید خصوصاً فکشن کی تنقید کو ایک صحیح اور تعمیری سمت عطا کرنے کی غرض سے کیا ہے۔ ’’فکشن کی تنقید کا المیہ‘‘ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس تصنیف کے آغاز میں وارث علوی نے اپنے افکار و خیالات کا اظہار افسانوی انداز میں کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وارث علوی خود افسانہ نگاری کی جانب متوجہ ہوتے تو خاصے کامیاب رہتے۔ مثلاً پہلے ہی باب میں وارث علوی نے نہایت ڈرامائی سین لکھا ہے اگرچہ مضمون کا یہ حصہ تنقیدی زبان کا نہیں ہے لیکن بے حد دلچسپ اور پُرلطف ہے۔

گھر سے وارث علوی تانگہ لے کر نکلتے ہیں راستے میں پہلے ان کی ملاقات حاؔلی اور پھر پریم چند سے ہوتی ہے۔ ان کی باتوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اردو کے پہلے نقاد ہیں اور دوسرا پہلا فکشن نگار، دونوں خود کو جدید نقادوں اور جدید افسانہ نگاروں کے سامنے غیر محفوظ محسوس کررہے ہیں۔ وارث علوی دونوں کو اپنے تانگے میں پناہ دیتے ہیں۔ اتنے میں افسانہ نگاروں کا ایک جمِ غفیر ٹوٹے پھوٹے چلا آرہا ہے جن میں منٹو، کرشن چندر، بیدؔی، عصمت اور غلام عباس وغیرہ فریاد کرتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ میں نے (وارث علوی) پوچھا ’’اے داستاں سرایانِ باغ اردو‘‘ کیا بپتا پڑی ہے؟ اردو کے ان ممتاز اور مستند افسانہ نگاروں کی طرف سے آواز آئی کہ ’’جدید افسانہ نگاروں نے‘‘ ہمارے صحیفے منسوخ کردیئے ہیں۔ مجھے ان پر بہت ترس آیا اور اُن سے کہا کہ آپ فکر نہ کیجیے فدوی کا تانگا حاضر ہے میں سبھی کو بخیر و خوبی ٹھکانے لگادوں گا‘‘۔

اسی باب کا ایک اور ڈرامائی سین ملاحظہ فرمائیں جس میں وارث علوی نے اس زمانے کی نہایت خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔

’’دور سے ہارمونیم اور قوالی کی آواز آئی۔ میں نے کہا شاید راج بلراج کا جلوس آرہا ہے۔ سب لوگ چوکنے ہوکر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا بینڈ باجے کے ساتھ نکلی ہے نئے افسانے کی برات، دنیا کا یہی دستور ہے۔ بھائیو! ایک طرف پرانے افسانے کا جنازہ ہے۔ دوسری طرف نئے افسانے کا جلوس۔ لیکن یہ کیا؟ میں حیرت زدہ اسی طرح اُچھل پڑا گویا بجلی کا کرنٹ چھولیا ہو۔ چست پاجامہ اور شیروانی پہنے شمس الرحمٰن فاروقی آگے آگے تھے۔ ان کے گلے میں ہامونیم بندھا ہوا تھا اور ان کے پیچھے افسانہ نگاروں کا طائفہ۔۔ کوئی کُبڑا، کوئی بونا، کسی کی ٹانگ لنگڑی، کسی کا ہاتھ لُنجا، میلے کچیلے کپڑے، ہڈیوں کے ڈھانچ، دکھ اور دلدّر کی چلتی پھرتی تصویریں فاروقی ہارمونیم بجاتے پھر کان پر ہاتھ رکھ کر بلند خوانی کرتے۔

در زندگی مطالعہ دل غنیمت است

اور دوسرا مصرع تمام افسانہ نگار چیخ چیخ کر گانے لگتے:

خواہی بخواں، خواہ مخواہ، مانوشتہ ایم

پورا ٹولہ اسی طرح گاتے گاتے ہمارے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے کہا فاروقی، یہ کیا فاروقی صاحب یہ کیا؟ یہ پیٹی ماسٹر کا رول آپ کو زیب نہیں دیتا۔ اور یہ لوگ کون ہیں اور آپ لوگ کیا گارہے ہیں؟ کہنے لگے ’’یہ لوگ جدید افسانہ نگار ہیں جن کے نام میں نے اپنی کتاب ’’افسانے کی حمایت میں‘‘ منسوب کی ہے‘‘

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وارث علوی نے نہ صرف فاروقی کے خیالات کو ردّ کیا ہے بلکہ اپنی تنقید کو بودی تنقید کا نمونہ بننے سے بھی بچایا اور ساتھ ہی ایک ایسے دلچسپ انداز سے کتاب کو تحریر کیا ہے۔ جسے پڑھ کر افسانوی شعریات کا علم تو ہوتا ہی ہے اور پوری کتاب میں قاری کو ایک افسانوی ذلت کا احساس بھی ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی وارث علوی کی فکشن کی تنقید سے متعلق دیگر تصنیفات کی طرح ’’فکشن کی تنقید کا المیہ‘‘ بھی ان کی تنقیدی بصیرت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ بقول تقی حسین خسرو:

"The book is informative and Waris Alvi has successfully defended the short story as a genre. He delves into a mass of literature and writings of literacy critics to prove his point".

’’چھٹتی نہیں ہے منہ سے‘‘

ابہام رشید
(احمد آباد، بھارت)

پچھلے چند برسوں میں اردو تنقید نے ترقی کے کافی مراحل طے کئے ہیں۔اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے باذوق، باہنر اور سلیقہ مند نقاد بھی دستیاب ہوئے ہیں۔کسی زندہ زبان میں موجود مختلف نقادوں کے ذریعہ کی جانے والی تنقید،ان کا طرزِ تحریر اور ان کا اسلوب بھی ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتا ہے۔تکنیک کے لحاظ سے اور تنقید کی مخصوص اصطلاحات کے استعمال کی وجہ سے تنقید کی زبان ویسے بھی بوجھل اور خشک محسوس ہوتی ہے۔اس کے باوجود اس میدان کے بعض سرکردہ نقادوں نے اپنی تنقید کو دلچسپ اور رواں بنانے کے لیے سلیس اور دل کو موہ لینے والے اسلوب کو اپنایا ہے۔اردو تنقید کی دنیا میں اپنا منفرد اسلوب اور انوکھا لب ولہجہ اپنانے والے نقادوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔لوگوں کی توجہ اور ان کی دلچسپی کو قائم رکھتے ہوئے تنقید نگاری کا فرض بدرجہ اتم ادا کرنے والے مخصوص، منفرد اور معتبر نقادوں میں وارث حسین علوی کا نام سر فہرست آتا ہے۔

میں ان کی تنقید کے بارے میں کسی طرح کا اظہار خیال نہیں کرونگا کیونکہ نہ یہ میرا منصب ہے اور نہ ہی مجھ میں اس کی اہلیت ہے۔میں تو ان کے بے مثال اسلوب اور اس میں شامل طنز و مزاح کی چاشنی کے بارے میں ہی گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور اس سے متعلق اپنی چند گزارشات آپ جیسے اہلِ علم حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

وارث علوی بنیادی طور پر خوش باش، خوش دل اور شگفتہ مزاج آدمی ہیں۔ان کی اس خوش مزاجی کا براہ راست اور نہایت خوشگوار اثر ان کی تنقید پر بھی پڑا ہے۔ان کی زبان کے چٹخارے اور ان کے اسلوب کی ناقابلِ تقلید شیرینی کی وجہ سے ان کا قاری نہایت آسانی اور سبک روی کے ساتھ ان کے طول طویل مقالات کو پڑھ لیتا ہے اور ذرا بھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتا۔وارث علوی اپنی تنقید میں جس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ اس میں مستعمل دلچسپ محاوروں اور نادر ضرب الامثال کی وجہ سے نہایت پرلطف اور دلچسپ مکالمہ بن جاتی ہے۔اپنی تنقید میں وہ ظرافت اور طنز کا ایسا ہنرمندانہ استعمال کرتے ہیں کہ ان کے من کی موج، یا ان کے ذہن کی ترنگ قاری کو اپنی طرف اس طرح مائل کر لیتی ہے کہ قاری اور نقاد دونوں مل کر تنقید کے گلزار میں خوش خرامی کرنے لگتے ہیں۔وارث علوی کسی نکتہ پر روشنی ڈالتے ہیں تب وہ روشنی آنکھوں میں چکاچوندھ پیدا کر دینے والی، یک رنگی اور یک رخی نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس صبح صادق کے وقت ماحول پر چھائے ہوئے ہلکے اور مدھم اُجالے کی طرح ہوتی ہے جو فنکار کے مذکورہ نکتے کو واضح اور روشن بناتی ہے۔اسی نیم روشن ماحول میں قاری کو فن پارے کے بارے میں پورا عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اس فن پارے کے تمام رنگوں کو اپنے میں جذب کر لینے کا اہل ہو جاتا ہے۔قاری علم و آگہی کے تمام مراحل اسی مدہوشی کے عالم میں طے کر لیتا ہے۔فن کار کے فن کے تمام پہلوؤں کا ذکر یہ اپنی افتادِ طبع اور خداداد شگفتہ کاری کے ذریعہ کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ قاری اس کی رنگین اور پرتاثیر فضاؤں میں کھو جاتا ہے۔ان کے اس انوکھے اسلوب کی جھلک میں ان دو اقتباسات کے ذریعہ آپ لوگوں تک پہنچا رہا ہوں۔جو ان کے مضمون ’تذکرہ روح کی اڑان کا۔۔‘ سے لیے گئے ہیں۔

quote ’’میں ڈرتا ہوں ان مدرّسوں سے جنھوں نے ادب کو بھوگنے کی بجائے بھگتنے، کارِ شیریں کی بجائے کارِ خیر، روح کی پرواز کی بجائے ذہن کی ورزش بنا کر رکھ دیا۔جو چاک گریباں اور چاک داماں تھا، رسوا سر بازار اور بے ننگ و نام تھا، ناصح سے گریزاں اور محتسب سے پریشان تھا، وہ جسے ایک بے نام خلش، ایک بے چین تجسس، ایک مسلسل اضطراب گلی گلی غبار ناتواں کی صورت لیے پھرتا تھا، ریاست اور سرکار کا صید زبوں، بزرگوں کی خوشنودی کا تمنائی اور قبولیت عامہ کا طلبگار بنا، اپنی ذات، اپنے فن اور اپنے زمانے سے سچائی سے پیش آنے کی بجائے سنابری اور فیشن پرستی کو راہ دی، اور عقائد کو سرمایۂ افتخار اور تمغۂ دلاوری سمجھا۔بچہ کی حیرانی، درویش کی سادگی، جادوگر کی طلسم آفرینی، پیکن کی رنگینی، پیغمبر کا القاء، تخیل کی نزاکت اور فکر کی صلابت، اور جذبہ کی برجستگی کی قیمت پر اس نے معلم اخلاق کی خشک بیانی، رہبر قوم کی اشتعال انگیزی اور سوشیل انجینئر کی منصوبہ بندی کو اپنایا unquote۔۔۔۔۔دوسرا اقتباس quote ’’ادب کا زندگی سے وہ تعلق نہیں جو سیاست کا ہے۔خراب نظم زیادہ سے زیادہ ذہنی کدورت پیدا کرتی ہے لیکن خراب سیاست تو گیس چیمبر کے دھوئیں سے تاریخ انسانیت کو سیاہ کار بناتی ہے۔اسی لیے میں سیاسی پیمانوں سے ادب کو پرکھنے کی بدعت کو اپنے وقت کی سب سے بڑی لعنت سمجھتا ہوں‘‘ unquote۔

’محمد علوی کی شاعری‘ نامی مضمون سے ایک دلچسپ اور توجہ طلب اقتباس سماعت فرمایئے۔

quote ’’شاعر کے لیے دھند میں لپٹی ہوئی جھیل کے سفر پر روانہ ہونے کا مطلب ہے ایک انجانی، موہوم اور پراسرار دنیا کے سفر پر روانہ ہونا۔کائی میں کھلے ہوئے لال کنول کو دیکھ کر مسرت سے چونک اٹھنا اور شفاف پانی میں لہراتے سانپ کی سرسراہٹ سے کانپ اٹھنا، آشوب آگہی کا خوف اسے عافیت کوشی کی طرف مائل کرتا ہے، اور رسمیہ اسالیب حیات کی محفوظ پناہ گاہیں اسے

ساحل کی سبک ساری کی ترغیب دیتی ہیں لیکن شاعر تو اپنے احساس کی آنچ میں جلنا چاہتا ہے، ذات کے اندھے کنویں سے آتی ہوئی آوازوں کو سننا چاہتا ہے، جو ساحل ادراک سے دور، پیدا ہوتے اور تحلیل ہو جاتے ہیں۔لفظوں کے بادبان کھولے جب وہ روانہ ہوتا ہے تو لفظ محض لغت کا سفیر نہیں بلکہ احساس کے پانیوں کا سیاح بھی بنتا ہے۔لفظ کی جیوت جلتی ہے تو دھند میں لپٹے ہوئے مناظر آشکار ہوتے ہیں اور احساس کی انجانی تہیں، نامعلوم پرتیں، مبہم نقوش اور موہوم گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔وہ جو تاریک تھا منور ہوتا ہے، جو نرا کار تھا آکار پاتا ہے، جو آگہی کی دسترس سے باہر تھا علم کے تسلط میں آتا ہے''۔unquote

وارث علوی اپنی تنقید میں اپنے خیالات کو ٹھیک اسی طرح پیش کرتے ہیں جس طرح کوئی شاعر مشاعروں کو لوٹ لینے والی اپنی مرصع غزل کے ہر نئے شعر میں بیان و معنی کے جہان تازہ کو آشکار کرتا ہے۔اور اس کے ذہن میں موجود فن کی دیوی کے حسن دلارا سے متعلق سربستہ رازوں سے اسرار کے پردوں کو ہولے ہولے سرکاتا ہے۔وارث علوی فنکار کے فن سے متعلق کارآمد نکات کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ وہ قاری کے قلب و ذہن میں افہام و تفہیم کی نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔

تذکرہ روح کی اڑان کا سے ہی ایک اور اقتباس پیش خدمت ہے۔

quote ''ادب کا مطالعہ مارکسزم، مودودیات اور سماجیات کا مطالعہ نہیں ہے۔یہ کوئی کار خیر، کار ثواب، خدمت علم اور خدمت انسان نہیں ہے۔یہ روح کی اڑان ہے ان آسمانوں میں جہاں تخیل کی چاندنی چھٹکتی ہے اور احساس جگمگاتے لفظوں کی کہکشاں میں ڈھلتا ہے۔زندگی اگر محض ذوق پرواز ہے، قوت حیات کا بروز ہے، فشار رنگ و نور ہے۔نت نئے فینومینا کا اٹوٹ سلسلہ ہے، تو پھر ادب بھی محض ذوق پرواز، کارواں کا بے منزل سفر، تخیل کی آوارہ اڑان اور الفاظ کی نازک انگلیوں سے احساس کے موہوم دھندلے لینڈ اسکیپ کی بے نقابی کیوں نہیں ہو سکتا۔جو دنیا، ادب تخلیق کرتا ہے اگر اس وادی کی طرح حسین ہے جہاں قافلۂ نور بہار ٹھہرا ہے، جو تجربہ ادب ہمیں بخشتا ہے، اگر تاروں بھری رات کی مانند دل آویز اور پر اسرار ہے، جو شعور ادب ہمیں عطا کرتا ہے اگر پرخطر پہاڑی راستہ کی مانند ہولناک و دلفریب ہے تو وارفتہ نگاہوں اور کیف و سرور و تحیر میں ڈوبی نظروں سے ان طلسماتی مناظر کا مشاہدہ کرنے کی بجائے، ہم سٹابازوں کی نفع و نقصان اور پرہیزگاروں کی صالح اور غیر صالح اور اطبا کی مفید اور غیر مفید جارگون والی زبان کیوں بولنے لگ جاتے ہیں؟

'قافیہ تنگ اور زمین سنگلاخ ہے' نامی مضمون سے ایک بے حد انوکھے اسلوب والا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

quote ''ادب کے مفتیوں کی چراغ پائی سمجھ میں آنے والی بات ہے، کیوں کہ فنکاروں میں کچھ تو مجذوب ہیں، جن کی باتیں انہیں سمجھ میں نہیں آتیں۔کچھ سرمد کی طرح ننگے ہیں اور صرف آدھا کلمہ پڑھتے ہیں۔اور کچھ تو یہ بھی نہیں جانتے، کہ وہ سلوک کے کون سے مقام میں ہیں۔ہاں البتہ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں، جو صوفی ہونے کے باوجود باوضو بھی ہیں۔ادب کے فقیہوں کو بس انہیں شاعروں سے دلچسپی ہے کیوں کہ یہ شاعر، ان کی شریعت کے ذرا قریب ہیں۔فقیہہ انہیں ہم سفر کہتا ہے، اور ان آوارہ درویشوں کو صلواتیں سناتا ہے، جو انہیں بہکا کر اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں۔آخر شمس تبریز کو لوگ اسی لیے تو قتل کرنے گئے تھے، کہ وہ رومی جیسے باوقار، پرہیزگار اور عالم دین مولوی کو بہکاتا تھا۔ unquote

ظرافت وارث علوی کے اسلوب کا غالب عنصر ہے۔ان کی ظرافت بالغ نظر اور پختہ ذہن کے فرد کی ظرافت ہے جو نہایت شائستہ اور صاف ستھری ہوتی ہے۔اس میں کسی طرح کا سوقیانہ انداز یا بھانڈ پن نہیں ہوتا۔اپنی تحریروں کے ذریعہ وہ قاری کے جذبات کی تطہیر کرتے ہیں۔وارث علوی نے مشرق اور مغرب دونوں جہانوں کے علم و ادب کی خاطر خواہ سیر کی ہے۔انہوں نے دونوں جہانوں کے علم و ادب کی روح کو اپنے لہو میں مکمل طور پر جذب کر لیا ہے اسی لیے کسی تخلیق کے بارے میں لکھتے وقت وہ قلم کار کی فکر، اس کے فن کی عظمت اور کوتاہی، ان تمام کا محاسبہ نہایت آسانی سے کرتے ہیں۔وارث علوی کو ان پر برسائے جانے والے اعزازات و اکرامات یا انکے خلاف کی جانے والی دشنام طرازیوں کی، یا ان پر لگائے جانے والے بے بنیاد الزامات کی ذرا بھی فکر نہیں ہوتی۔اپنی جان اور عزت و آبرو کو جوکھم میں ڈال کر بھی وہ فن کی بقا کی خاطر قلم کار کی ہر چھوٹی بڑی لغزش کی طرف اپنے ہی رنگ میں نشان دہی کرتے ہیں۔اسی طرح وہ قلم کار کی ہر خوبی اور مثبت فکر کی بھی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں اور اسے اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ وہ قاری کے دل میں جاگزیں ہو جائے۔ان کے مضمون 'تذکرہ روح کی اڑان کا' کے اس اقتباس کو ملاحظہ فرمایئے۔

quote ''طفل الغو کے پالنے پوسنے والوں کے ٹھن کیسے ہوتے ہیں وہ دیکھنا ہو تو ان لوگوں کی طرف نظر کرو جنہوں نے ادب کو ترقی کوشی کے بہتر سیڑھیوں والے ادارے میں بدل دیا ہے۔ان لوگوں کو زیب دیتا ہے کہ وہ ادب کی نفیس نفیس باتیں کریں اور فوائدالفوٴاد والی زبان بولیں۔ادب ان کے لیے ترقی ہے، شخصیت کی زینت اور دانشوری کی آرائش ہے، تہذیب و شائستگی اور شریفانہ مشغلہ ہے۔مجھ جیسے کٹے پھٹے لوگوں کے لیے ادب زینت و زیبائش نہیں بلکہ ایک جذباتی ضرورت اور ایک روحانی طلب ہے۔مردہ خیالات کا کباڑ خانہ نہیں بلکہ زندہ تجربات کی وادیٔ پر بہار ہے۔خلعت دانشوری کی زرکاری نہیں بلکہ برہنہ کھال پر گزرتے وقت کے ان لمحات کی جنہیں تخلیقی تخیل نے توانا تجربات کے شراروں میں بدل دیا ہے، حدت اور شدت کو محسوس کرنے کا نام ہے۔unquote

اسی کے ساتھ اب ایک اقتباس 'پیشہ تو سپاہ گری کا بھلا' سے بھی ملاحظہ فرمایئے۔اس میں موجود طنز کا لطف اٹھایئے۔

quote ''ترقی پسند شاعروں کے مطالبات لگ بھگ وہی ہوتے

ہیں جو ٹریڈ یونین لیڈر کے ہوتے ہیں۔اسی لیے ہڑتال ختم ہونے کے بعد شاعری بھی ختم ہو جاتی ہے،یا انقلاب آنے کے بعد شاعری بھی ٹریڈ یونین تحریک کی مانند تعمیری کام میں لگ جاتی ہے۔ادھر کارخانوں میں دو لاکھ جوتے پیدا ہوتے ہیں،ادھر شاعر اربابِ حل و اقتدار کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔اگر نہیں کرتے تو جوتے کھاتے ہیں‘‘ unquote

وارث علوی اپنے تنقیدی افکار کو آہستہ آہستہ اسی طرح پیش کرتے ہیں جس طرح فطرت میں پھول کھلتا ہے اور اس کے کھلنے کے ساتھ ہی اس پھول کی ذات میں موجود خوشبو اپنے چہار جانب کی ہواؤں کو معطر بناتی ہے۔جس طرح پھول کی پنکھڑیاں اپنے بے مثال نکھار اور اپنے نادر و نایاب رنگ اور نزاکت اور لاجواب تر و تازگی کے ذریعہ دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔اسی نزاکت اور رنگینی کے ساتھ وارث علوی اپنے نظریات کو اپنے قاری کے ذہن و دل تک کامیابی سے پہنچا دیتے ہیں۔تذکرہ روح کی اڑان کا کے اس روح پرور اقتباس پر غور فرمائیے۔

quote ’’شاعر اور پیغمبر دونوں تجرید میں نہیں تجربہ میں جیتے ہیں۔ان آوازوں کو سنتے ہیں جو کسی کو سنائی نہیں دیتیں۔دونوں کو پیغامات اور مضامین غیب سے آتے ہیں۔نوائے سروش دونوں کا سرچشمۂ فیض ہے۔انسان،فطرت اور کائنات کا علم وہ کتابوں سے نہیں بلکہ چشم بینا سے حاصل کرتے ہیں اور یہ آنکھ صاحب بصیرت کی آنکھ ہوتی ہے۔مشاہدۂ فطرت ان کے تخیل کی حنابندی کرتی ہے اور ان کا تخیل حواس سے ماورا تجربات کا ادراک کرتا ہے۔مکتب میں مذہب علم الکلام اور شاعری علم البیان بن جاتی ہے اور جب دونوں باہر نکلتے ہیں تو دونوں کی جبیں تند،لب بھنچے ہوئے اور آنکھوں میں معلّم اخلاق کے عتاب کی سرخی ہوتی ہے۔‘‘ unquote

’قافیہ تنگ اور زمیں سنگلاخ ہے‘ نامی مضمون سے ایک نہایت ہی پرلطف اور طنزیہ اقتباس سنیئے۔

quote ’’سمجھدار نقاد جب فن کار کو تخلیقی سفر کی آزادی دیتا ہے،تو اسے اپنی شبھ کامناؤں کے ساتھ روانہ کرتا ہے لیکن پولونیس جیسے نقاد تو بزرگانہ احتیاطوں،یہ کرنا اور وہ کرنا،چناں اور چنیں کے وہ دفاتر برپا کرتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔۔۔نفسیات کے بھنور اور انسانی فطرت کے اسرار اور رموز کے ظلمات سے بچتے رہنا۔۔۔لنگر تو ان اُجلے پانیوں ہی میں ڈالنا،جہاں افادیت ،مقصدیت،عصری آگہی اور صحت مندی کی رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔سماجی حقیقت نگاری کے دریا میں غوطہ لگاؤ گے تو تجربات کے وہ موتی ہاتھ آئیں گے،جن کے کشتے کھا کر میرے بوڑھے جسم میں بھی وہ حرارت پیدا ہوگی ،کہ انسان زندہ باد کا نعرہ ذرا زور سے ہی لگا سکوں گا‘‘ unquote

انسان ہی ایک ایسا واحد حیوان ہے جو نہ صرف خود ہنس سکتا ہے بلکہ اوروں کو ہنسا بھی سکتا ہے۔ہنسنا اور ہنسانا اس کی جبلت میں شامل ہے۔خواتین و حضرات تنقید جیسے سنجیدہ یا ایک لحاظ سے خشک مضمون میں ہنسنے اور ہنسانے کے مواقع پیدا کرنے میں اور اس کے باطن سے معنی کی پھلجھڑیاں برآمد کرنے میں وارث علوی کو غضب کا ملکہ حاصل ہے کیوں کہ زندہ دلی ان کا مسلک و مذہب ہی نہیں ان کی فطرت ہے،خوش فکری ان کی حیات کا قرینہ ہے اور شگفتہ بیانی ان کی سرشت میں داخل ہے۔

وارث علوی اپنی تحریر کے درمیان نکتۂ عروج پر یا سم پر پہنچتے ہیں تب خود بھی بہکنے لگتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی بہکنے کے تمام مواقع فراہم کرتے ہیں۔وہ بخوبی جانتے ہیں کہ تنقید کی خشک باتیں زیادہ دیر تک نہ لکھی جا سکتی ہیں نہ ہی پڑھی جا سکتی ہیں۔تذکرہ روح کی اڑان کا۔۔۔سے اس اقتباس کو ملاحظہ فرمایئے۔آج کی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے موجودہ تعلیمی نظام اور ماحول پر کیے گئے گہرے طنز پر غور فرمایئے۔

quote ’’خشک،بے رنگ،صفر درجۂ حرارت والی ٹھپ تنقیدوں کی راکھ کے نیچے تخلیقی ادب اس طرح بجھا پڑا ہے کہ ادیب کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے ان استادوں کے چہرے گھوم جاتے ہیں جن کی زیر نگرانی درجن بھر طلباء تحقیقی مقالے لکھتے ہیں،جو کتابیں پڑھاتے ہیں،کتابیں ایڈٹ کرتے ہیں، نصابی کتابیں مدون کرتے ہیں،کتابوں پر کتابیں لکھتے ہیں اور اپنی کتابوں پر اپنے ہی جیسے دوسرے اساتذہ سے تبصرے لکھواتے ہیں،اور کتاب کے لیے انعام اور اپنے لیے وظیفہ مقرر کرانے کے لیے ادب کا ایک قومی اہمیت کا ایک نیا چکر شروع کر تے ہیں،کیونکہ حکومت اسی ادب کو سمجھتی ہے جو بینڈ باجے کی طرح بجتا ہے۔ستم ظریفی دیکھئے کہ ان اساتذہ کی پوری زندگی کتاب کے گرد و پیش،ادب کے محور پر گھومتی ہے لیکن ایک چیز جو وہ نہیں پڑھ پاتے وہ کتاب اور ادب ہی ہے۔ان کی تنقیدوں سے کبھی پتا نہیں چلتا کہ انہوں نے زندہ ادب کے ساتھ زندہ رشتہ قائم کیا ہے۔‘‘ unquote

ایسی دوسری،بہت سی مثالیں وارث علوی کے دیگر مضامین سے بھی دی جا سکتی ہیں۔وارث علوی کی تخلیقی نثر تو کسی بحرِ اعظم کی طرح ناپیدا کنار ہے اور حدِ نظر سے بھی پرے تک پھیلی ہوئی ہے۔یہ تنقیدیں ان کی کتابوں کے ذریعہ اور ان کے مضامین کے ذریعہ قاری تک پہنچ سکتی ہیں کوئی بھی قاری اپنی دانش،فہم،لگن اور ضرورت کے مطابق وارث علوی سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔وارث علوی ابرِ باراں کی طرح سب پر اپنے علم و ہنر کی بارش برساتے ہیں لیکن ہر قاری اپنے ظرف و استطاعت کے مطابق،اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق اسے اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔

وارث علوی کی تنقید کا بطور خاص اور گہرائی سے مطالعہ کرنے کا صرف ایک ہی نقصان ہے۔۔۔۔۔چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ادب کا ذہین قاری کبھی بھی کم تر درجہ کے ادب کو پسند نہیں کر سکتا۔اس لیے وارث علوی ان کے قاریوں کے لیے ایک عادت،ایک نشہ بن جاتے ہیں۔

پیرویِ مغربی

وارث علوی

وہ لوگ جو مغرب سے استفادہ کے نام پر چراغ پا ہوتے ہیں وہ فن اور علم کے فرق کو سامنے رکھ کر بات نہیں کرتے۔ فنکار اپنی ہی تہذیبی زمین میں کنواں کھودتا ہے اور پانی نکالتا ہے۔ فن کا شجرِ پُر بہار اپنے ہی ملک اور اپنی ہی قومی تہذیب کی فضاؤں سے قوتِ نمو حاصل کرتا ہے۔ ہر فن چونکہ تخلیقی عمل ہے اس لیے نقّالی اس کے لیے پیغام موت ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب کی نقّالی کی بات الگ رکھیے، شاعر اگر اپنی ہی زبان کے کسی قدر آور شاعر کی نقل کرنے لگتے ہیں تو اپنی آواز اور اپنا رنگِ سخن تک پیدا نہیں کرسکتا۔ تازگی، ندرت اور انفرادیت تخلیق کے لوازمات اور تقلید کے دشمن ہیں۔ شاعر کی اپیل بین الاقوامی، اس کی قدریں آفاقی اور اس کے سروکار روحانی اور مابعد الطبیعاتی ہوسکتے ہیں، اور عموماً ہوتے ہیں، لیکن اس کی شاعری کا مزاج، منظر نامہ، اور فضائیں قومی، ملکی، نسلی اور ملّی ہی ہوں گی۔ ایک تندرست اور توانا تہذیب دوسری تہذیبوں کے اثرات قبول کرتی ہے لیکن تقلید اور نقّالی میں عجمی تہذیب کی سرحدیں کہاں اور کب اور کس طرح آمیز ہوتے ہیں۔ فراق پر بیک وقت خیّام، حافظ، کالی داس اور بہاری میر اور غالب، ورڈز ورتھ اور شیلی، کے اثرات کام کرتے نظر آتے ہیں اور ایک ہی نظم میں ان سب کا ایسا فیوزن ہوتا ہے کہ کسی کی الگ سے نشان دہی ممکن نہیں رہتی۔

سائنس اور سماجی علوم کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ان کا تعلق خارجی حقائق کی تحقیق اور تدوین سے ہے اور یہ کام دنیا کے کسی بھی گوشہ میں ہوتا ہو اس کے اثرات عالم گیر ہوتے ہیں، لندن، ماسکو، یا جاپان میں بیٹھا ہوا ایک شاعر جو اجتہادات کرتا ہے اس میں دوسرے ملکوں کے لوگوں کو کم ہی دل چسپی ہوتی ہے اور ان اجتہادات کا دائرہ عموماً اس کی زبان تک ہی محدود رہتا ہے۔ لیکن لندن، ماسکو یا جاپان میں بیٹھا ہوا ایک سائنس داں اگر پلاسٹک کی کوئی نئ قسم ایجاد کرتا ہے تو سائنس کی دنیا تو کیا آپ کے اور ہمارے باورچی خانہ کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ شئے جتنی آسانی سے آدمی کی زندگی میں داخل ہوتی ہے خیال یا تہذیبی قدر نہیں ہوتی۔ اسی لیے تہذیبی اثرات کے انجذاب کا عمل طویل عرصہ پر پھیلا ہوتا ہے۔ سائنسی اور سماجی علوم کے قوانین عالمگیر ہوتے ہیں، اسی لیے سائنس اور سماجی علوم قومی اور ملکی نہیں ہوتے۔ انگریزی ادب، فرانسیسی ادب، فارسی ادب کی طرح انگریزی، کیمسٹری، فرانسیسی نفسیات اور فارسی اقتصادیات جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کیمسٹری، نفسیات، اقتصادیات ملکوں اور قوموں سے بلند ایک مشترکہ ذخیرۂ علم ہے اور کسی بھی ملک و قوم کا شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس میں اضافہ کرسکتا ہے۔ کیمسٹری، نفسیات اور اقتصادیات کے مختلف ملکوں کے پروفیسر ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوتے اور برسوں تک ایک ہی تجربہ گاہ میں ایک ہی موضوع پر ساتھ ساتھ تحقیقی کام کرسکتے ہیں۔ مختلف ممالک اور زبانوں کے فنکار مشکل ہی سے ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔ ان کا تخلیقی کام اس قدر شخصی، داخلی اور منفرد ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اشتراکِ عمل کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ دنیا کے ترقی پسند فنکاروں میں جو ایک برادری کا احساس پیدا ہوا تھا، اس کا تعلق فنکاری سے کم اور سیاسی آدرشوں سے زیادہ تھا۔ ورنہ عموماً تو ایک فنکار کو اس بات میں دل چسپی بھی نہیں ہوتی کہ دوسرا فنکار کیا کر رہا ہے۔ اسی لیے تو سائنس دانوں اور سماجی علوم کے پروفیسروں کی کانفرنسیں جتنی کامیاب، ثمر آور اور معنی خیز ثابت ہوتی ہیں ادیبوں اور فنکاروں کی نہیں ہوتیں۔ ایک جگہ جمع ہونے کے بعد فنکاروں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سے موضوع پر بحث کریں، یا کون سی سطح پر بات چیت کریں۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اتنی نظمیں اور ناولیں لکھیں، اور اب فلاں نظم یا ناول پر کام کر رہے ہیں۔ بات کلامِ بلاغت نظام سنانے یا ناول کا باب پڑھنے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ انہیں سنانے کا مرض اس لیے لاحق ہوتا ہے کہ سنانے کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے۔ تخلیق کا فن ایسا نہیں ہے کہ اس کے طریقۂ کار صنعت گری، یا منفرد تخلیقی نفسیات میں دوسروں کو دل چسپی ہو۔ جب ایک میکینک بتاتا ہے کہ اس نے فلاں موٹر کار کو کیسے درست کیا، یا جب ایک ٹکنوکریٹ بتاتا ہے کہ اس نے فلاں مشین میں چند تبدیلیاں کر کے پولیوشن کو کیسے کم کیا، یا جب ایک سرجن کسی پیچیدہ آپریشن کا بیان کرتا ہے، یا ڈاکٹر کسی دل چسپ بیماری کا ذکر کرتا ہے تو ہم پیشہ لوگوں کو اس کی باتوں میں جو دل چسپی ہوسکتی ہے۔ ایسی دل چسپی ایک فنکار کی باتوں میں دوسرے فنکار کو نہیں ہوسکتی۔ فنکاروں کے سیمینار اور ادیبوں کی کانفرنسیں عموماً غیر دلچسپ، لاحاصل اور مناقشات سے بھری ہوتی ہیں۔ ان کا بہترین اجتماع مشاعرہ ہی ہوتا ہے جس میں وہ سناتے ہیں اور دوسرے سنتے ہیں۔ مشاعرہ اہل ذوق کی محفلِ سخن کی ارتقائی شکل تھا۔ ادبی کانفرنس اور سیمینار میں ایسا کوئی ارتقائی عمل نظر نہیں آتا۔ وہ نقل ہے دوسرے علوم کی کانفرنسوں اور سیمینار کی۔ اہم ادبی رجحانات اور بڑی ادبی تحریکیں کافی ہاؤس اور شراب خانوں کی محفلِ احباب سے نکلی ہیں، کانفرنسوں سے نہیں۔ کالرج وڈز ورتھ سے ملتا ہے تو پوری انگریزی شاعری کی فضائیں بدل جاتی ہیں۔ اور لیریکل بیلڈز کا دیباچہ نہ صرف رومانی تحریک کا مینی فسٹو ثابت ہوتا ہے بلکہ رومانی طرزِ احساس کی آیت مقدّس اور کلاسیکی شاعری کے خلاف ایک پیکن بغاوت بن جاتا ہے۔ یہ دو آدمی جو کام کرتے ہیں وہ ٹوکیو کی پی ای این اور تاشقند کی رائٹرس کانفرنس سے بھی نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ کمیساروں کی تقریریں سنتے ہیں تالیاں پیٹتے ہیں، اور حق نمک ادا

کرنے کی خاطر اپنے اپنے ملکوں میں جا کر پروپیگنڈا آرٹ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ایسی کانفرنسیں مولویوں کا اجتماع نظر آتی ہیں جہاں حبلِ متین اور صراط مستقیم اور عقائدِ راسخہ اور تبلیغِ دین کے مسائل پر رگیں تنتی ہیں۔انعام و اکرام، دستارِ فضیلت، اور عباؤں اور قباؤں میں دھنسا ہوا جلال الدین بھی نہیں جانتا کہ تخلیق و عرفان کا شعلہ اندھیری گپھاؤں کے تخلیہ میں بھڑکتا ہے۔ایک آوارہ درویش اپنی خونبار آنکھوں سے اسے دیکھتا ہے اور عباؤں اور قباؤں کے جال سے پھڑ پھڑاتا ہوا روح کا پرندہ آزاد ہو جاتا ہے۔پھر کیا ہے؟۔۔۔اندھیرے غار کا تخلیہ، مرغ خوش نوا کی غزل خوانیاں، رقص میں لہراتے قدم، اور شمس تبریز کے نغموں کا سوز و ساز اور درد و داغ۔ایسا ہی ایک مجذوب پیرس میں تھا جو قرض خواہوں سے بچنے کے لیے ہوٹلوں میں چھپتا پھرتا تھا۔یورپ کی شاعری کا اس نے دھارا بدل دیا۔ ایسا ہی ایک دیوانہ لاہور کی سڑکوں پر پچیس پچیس روپے میں اپنی کہانیاں بیچا کرتا تھا۔اردو افسانہ کا اس نے رُخ موڑ دیا۔رومی، بودلیئر، منٹو۔۔۔سب کے سب علامت ہیں اس دلِ وحشی کی جو آوارگی پر عافیت کوشی کو قربان کرتے رہے ہیں۔ کانفرنس ان ببولوں کی ہوتی ہے جو صف بستہ ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں۔ ان آوارہ خرام بگولوں کی نہیں جو صحرا میں خاک بسر گھومتے ہیں۔

پھر فنکار جیسا جھگڑالو آدمی علم کے کسی اور شعبہ میں آپ کو دیکھنے کو نہیں ملے گا۔الجھاؤ ہے زمین سے، جھگڑا ہے آسماں سے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ" کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی" اس کا جھگڑا اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے"I AM AT WAR WITH MYSELF" آندرے ژید نے کہا تھا۔گریبان تو چاک ہوتا ہی ہے۔اندر سے ذات بھی کٹی پھٹی ہوتی ہے۔ دھندا ہی ایسا اختیار کیا ہے کہ جگر خون کرنا پڑتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ دیوان مرتب ہو رہا ہے۔میر صاحب ہی جانتے ہیں کہ کیسے کیسے درد و غم کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے۔پتہ نہیں ہتک اور فو بھا بائی لکھتے وقت منٹو پر کیا گزری تھی اسے کہتے ہیں کہ دشنۂ غم کو آر پار کرنا۔کیا ہندوستان کی دہی معیشت اور تعلیمی نفسیات پر بھی اسی طرح کتابیں لکھی جاتی ہیں؟ جس کے اعصاب بجلی کے تار کی مانند CHARGED رہتے ہوں اس سے نارمل BEHAVIOUR کی توقع ہی فضول ہے۔پھر کمال تو یہ ہے کہ فنکار اس فن سے جھگڑتا ہے جسے اس نے اپنی زندگی بنایا ہے۔ہر تیسرے روز گڑ کی دکان کھولنے اور کوئلوں کی دلّالی کرنے کی بات کرتا ہے۔اُدھر عزّتِ سادات بھی گئی اور اِدھر ہو کے سیّد بنے چمار سلیم۔ فنکار کو جھگڑا ہوتا ہے اپنے ادب سے، اپنی ادبی روایت سے، اُن شاعروں سے جن کے زیرِ اثر وہ لکھتا ہے لیکن زیر اثر رہنا نہیں چاہتا۔سائنس اور سماجی علوم میں ہر شخص اپنی بساط کے مطابق کام کرتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔نہ بت شکنی ہے نہ روایت شکنی، نہ نئے پرانوں کا جھگڑا ہے نہ نسلوں کا۔کوئی یہ نہیں کہتا کہ نیوٹن، ڈارون اور فرائڈ جھک مارتے رہے اور کام تو وہ ہے جو وہ کر رہا ہے۔ادب میں تو جو بھی نئی نسل آتی ہے پرانی نسل کو مٹّی دیتی آتی ہے۔جدھر دیکھو اُدھر "ہم چوما دیگرے نیست" کا طوطی بولتا ہے۔اُدھر برنارڈ شا شیکسپیئر کو پچھاڑتا ہے، ادھر یاس یگانہ غالب کو۔لوگ اقبالؔ کا عرس مناتے ہیں تو باقر مہدی انہیں علامہ سیال کوٹی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔کسی سائنسداں، مورّخ، ماہر اقتصادیات کو سرکار کی طرف سے انعام و اکرام ملتا ہے تو سوائے اس کے بیوی بچوں اور شاگردوں کے شاید ہی کوئی اور خوش ہوتا ہو، وجہ یہ ہے کہ شاعری کی قیمت عیاں نہیں ہوتی۔ یہاں ہاتھ کنگن کو آرسی والا معاملہ نہیں ہے اندھا ریوڑیاں بانٹتا ہے۔جو شاعر ہی نہیں اس کے مجموعہ کو تین ہزار، جو شاعرِ وقت ہے اس کے نام پر تین حرف ایسے مواقع پر مبارکبادیوں کے خط عموماً وہی لکھتے ہیں جن کے پاس لکھنے کو کچھ نہیں ہوتا۔رشک، حسد، رقابت، چھینا جھپٹی، پتھراؤ ادب کا بالکل نارمل موسم ہے۔اس دھرتی پر بھونچال نہ آئیں تو کھیتی ہی نہ ہو۔اسی لیے تو معمولی سے معمولی شاعر بھی نظم لکھتے وقت محسوس کرتا ہے کہ وہ دستی بم بنا رہا ہے۔مشاعرہ میں اس طمطراق سے جاتا ہے گویا بساط کو الٹ دے گا، یہ چنگیزی اور نادری آن بان سماجیات کے پروفیسروں کی قسمت میں کہاں۔وجہ یہ ہے کہ دوسرے علوم کا تعلق ذات سے نہیں بلکہ خارجی حقیقت کی تحقیق سے ہے اور وہ بڑی حد تک معروضی ہوتی ہے۔فنونِ لطیفہ داخلی اور شخصی سرگرمیاں ہیں اور اُن کا تعلق مذاقِ سلیم سے ہے جو شخصی چیز ہے۔مجھے ایک خاص قسم کی شاعری پسند ہے آپ کو دوسری قسم کی۔جھگڑا لازمی ہے۔تاریخ میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں صاحب نے تاریخ لکھی ہی نہیں، محض سنین کی کھتونی تیار کی ہے۔چلیے یہی سہی، کھتونی تو تیار ہوتی ہے۔عرق ریزی رائیگاں تو نہیں گئی۔کسی نہ کسی کے کام لگے گی۔ادب میں اگر ناول، ناول نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔یعنی اگر وہ بطور ناول کے کام نہیں آئے گا تو کسی اور کار رہتا بھی نہیں۔شاعری اگر بطور شاعری زندہ نہیں ہے تو بطور سیاست اور تاریخ کے بھی زندہ نہیں رہے گی۔ادب اپنی ساخت میں ہی زندہ رہتا ہے جب کہ دوسرے علوم اگر اپنی ساخت میں مرتے ہیں تو پرداخت میں جیتے ہیں۔سوانح اگر بطور سوانح کے ناکام ہو تب بھی بطور تاریخ کے تھوڑا بہت جی جاتی ہے۔

پھر سائنس میں ہر نئی تحقیق یا تو پرانی تحقیق کو باطل کرتی ہے یا فرسودہ۔سائنس بہت جلد پرانا ہو جاتا ہے۔علوم کے شعبہ میں لوگ ہمیشہ تازہ ترین تصانیف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔سائنس، طب، قانون، اقتصادیات اور دوسرے سماجی علوم کی کتابیں SUPERSEDE ہوتی رہتی ہیں۔سائنس میں آنے والی نسلیں اپنے پیش رؤں کے کام کو آگے بڑھاتی ہیں۔اور ان کی شکر گزار ہوتی ہیں کہ انھوں نے اپنی تحقیقات سے راستہ ہموار کیا۔وہ اپنے کام کو وہاں سے شروع کرتی ہیں۔جہاں سے ان کے پیش رؤں نے اسے چھوڑا تھا۔ ادب میں روایت کا تصور ملتا ہے لیکن کام کو آگے بڑھانے کا کوئی سلسلہ نظر نہیں آتا۔اجتہاد، انحراف، بغاوت کام کو آگے بڑھانے کے لیے نہیں بلکہ نیا کام شروع کرنے کے طریقے ہیں۔روایت کبھی قدغن ثابت نہیں ہوتی ہے، کبھی مہمیز

شوق کا تازیانہ۔کبھی فنکار روایت کے حصار میں قید رہتا ہے،کبھی باہر نکل جاتا ہے،کبھی بازیافت کرتا ہے،کبھی از سرِ نو زندہ کرتا ہے۔ نیا ادب پرانے ادب کو SUPERSEDE نہیں کرتا، بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو جیتا ہے۔آپ نیا ناول لکھتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب لوگ پرانے ناول نہیں پڑھیں،نئی شاعری کرتے ہیں تو میر و مرزا اکاٹ مال کی دکانوں پر جا کر نہیں بیٹھ جاتے۔ نیا تجربہ کلاسک کو پارینہ نہیں بناتا۔ پرانی نسل کی طرف فنکار بہت احسان مند نظروں سے بھی نہیں دیکھتا۔کبھی اس کا رویہ کھلی بغاوت کا۔کبھی تمسخر اور استہزاء کا کبھی رواداری اور رضامندی کا کبھی مکمل استرداد اور انقطاع کا، اور کبھی شریف النفس مفاہمت کا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر نسل کے تجربات،طرزِ احساس اور طرزِ فکر الگ ہوتی ہے۔وہ اپنے پیش رووں سے مختلف دنیا میں رہتی ہے۔ پرانی نسل بھی ہر نسل کی مانند تجربات کرتی ہے اور تجربات کبھی روایت کو آگے بڑھاتے ہیں اور کبھی IMPASSES پیدا کرتے ہیں۔نئی نسل محسوس کرتی ہے کہ پرانوں نے اس کی تخلیق کی راہیں مسدود کر دی ہیں۔ بند گلی میں سر پھوڑنے کی بجائے وہ انحراف سے کام لیتی ہے،اور نئی راہ تلاش کرتی ہے۔کبھی جس راہ پر وہ نکل کھڑی ہوتی ہے دور تک چلنے کے باوجود منزل سجھائی نہیں دیتی تو U(یو) ٹرن لیتی ہے اور پرانے اور کبھی کبھی ARCHAIC اسالیب کی بازیافت کرتی ہے۔ ہر نئی تخلیق ایک نئی راویت کی داغ بیل ڈالتی ہے اور نئے امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہر فن پارہ اپنی دنیا آپ ہوتا ہے اور سائنس اور علمی کتابوں کی طرح کل کا جزو نہیں ہوتا۔اور یہ سب اس لیے ہے کہ ادب ایک شخصی تجربہ،اور ایک انفرادی تخلیقی عمل ہے۔ادب کے لیے نہ لیبارٹری چاہیے نہ اکادمی۔ادب تخلیق کرنے کے کوئی گُر نہیں،کوئی ایسے طریقۂ کار نہیں جن کی تعلیم دانش گاہوں میں دی جا سکے۔ ادب کوئی SKILL نہیں جسے سکھایا جائے۔تخلیق ادب ایک ذاتی، انفرادی اور شخصی کارنامہ ہے،جس میں خارجی شواہد اور معروضی حقیقت کی بجائے حقائق کا شخصی مشاہدہ اور تفہیم پیش کی جاتی ہے اور تحقیق، تدقیق، تجزیہ اور تحلیل کی بجائے تخلیقی اثر آفرینی سے کام لیا جاتا ہے اور عقل و خرد کی بجائے وجدان و تخیل کا استعمال کیا جاتا ہے۔ادب عبارت ہے اُن تخلیقی کارناموں کے مجموعہ سے جو منفرد شخصیات کی تخیلی معجز نمائیوں کا نتیجہ ہے۔ادب کی یگانگت اور آہنگ فطری نہیں ہوتا بلکہ متضاد اور بعض اوقات متناقص عناصر کی موجودگی کے باوجود چند ایسی قدروں کے کیمیاوی عمل سے پیدا ہوتا ہے جنہیں ہم حسن و مسرت کی جمالیاتی قدریں کہتے ہیں۔

سائنس اور سماجی علوم کے محققوں کے لیے ورک شاپ، تجربہ گاہ، لائبریری، آلات تحقیق کی میتھوڈولوجی، تحقیق کا مواد سب کچھ چاہیے۔ محقق اپنے کام میں دوسرے ماہرین کی مدد لے سکتا ہے، برلن، نیویارک، یا لندن جا کر وہاں کی تجربہ گاہوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے،اگر کام اہم ہو اور سرکار سے فربہ وظیفہ ملا ہو تو معاون محققوں کا پورا عملہ رکھ سکتا ہے اگر دوسرے علوم کے ماہروں کی مدد کی ضرورت ہو تو اپنے پروجیکٹ میں انہیں بھی شامل کر سکتا ہے۔ یہ سب باتیں نہ ادب میں ممکن ہیں نہ ادب کو ان کی ضرورت ہے۔کیا کوئی ناول نگار تاریخی ناول کی تاریخ مورّخ سے لکھواتا ہے، یا نفسیاتی ناول کی نفسیات کے لیے ماہر نفسیات سے رجوع کرتا ہے، یا پرولتارین ناول کے لیے ٹریڈ یونین لیڈر سے مشورہ کرتا ہے۔کیا کسی نظم کی تخلیق کے لیے دوسرے شاعروں کا عملہ رکھا جا سکتا ہے۔کیا ناول اور افسانے کے لیے مختلف ترقی یافتہ ممالک میں ایسی درس گاہیں موجود ہیں جہاں جا کر تعلیم لینے سے آدمی زیادہ نستعلیق ناول لکھ سکے۔آپ دیکھیں گے کہ تخلیق فن کے لیے فنکار کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میز پر کاغذ ہوتا ہے، کاغذ پر قلم، قلم پر جھکا ہوا ایک سر، سر پر پھونس کی چھت، اور چھت کے سوراخوں سے جھانکتے ہوئے روح القدس۔

غالب کی بات سچ ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

چونکہ ادبی تنقید مختلف علوم کے اثرات تلے پھلتی پھولتی ہے اور زیادہ سے زیادہ سائنسی بننے کی کوشش کرتی ہے، اس لیے تنقید نے انہی ممالک میں زیادہ نشو نما پائی ہے جہاں سائنس، فلسفہ اور دوسرے سماجی علوم ترقی کی معراج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ پھر چونکہ مغرب کا معاشرتی نظام زیادہ آزمائشی مرحلوں سے گزرا ہے اور فرد کی پیچیدہ زندگی کے تجربات کے بیان کے لیے ادب اور آرٹ کے زیادہ پیچیدہ اور تہہ در تہہ طریقوں کو کام میں لاتا رہا ہے، اس لیے وہاں کے ادب میں جو تنوع، گہرائی اور فکر و نظر کی رنگا رنگی ملتی ہے اس سے ہمارا خط مستقیم پر سفر کرنے والا ادب عموماً محروم ہے۔ صاف بات ہے کہ مغرب کی ادبی تنقید چونکہ ایک رفیع الشان ادبی روایت سے منسلک ہے، اس لیے نہایت توانا اور بصیرت افروز ہے۔ اس سے استفادہ اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا کہ سائنس اور دوسرے سماجی علوم سے استفادہ۔ اور انہی علوم کی مانند اس تنقید کے گہرے اثرات ہماری تنقید پر پڑے ہیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آج سائنس اور سماجی علوم میں مغرب کی بلا شرکت غیرے اجارہ داری ہے۔ ہم تو اس بات کا تصور تک نہیں کر سکتے کہ ان علوم میں مغرب کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے۔ ارے ہندوستان میں آپ کسی بھی سائنسی تجربہ گاہ، سماجی علوم کے تحقیقی ادارے یا زرعی یا ٹکنولوجیکل دانش گاہ میں پہنچ جایئے اور دیکھئے کہ وہاں کی لائبریری میں بایولوجی، اقتصادیات گیہوں کی قسمیں، یا نفسیاتی بیماریوں پر کتابوں کا جو بیش بہا ذخیرہ ملتا ہے وہ سب کا سب انگریزی زبان میں ہے۔ آپ اقتصادیات کے پروفیسر سے جا کر پوچھئے کہ انگریزی سے بے نیاز رہ کر محض اردو، ہندی اور گجراتی زبان کے بل بوتے پر کوئی طالب علم اقتصادیات کا کتنا علم حاصل کر سکتا ہے۔ ارے ہم سکنڈری اسکول کے لونڈوں کے لیے مناسب کتابیں لکھ نہیں سکتے تو اعلیٰ تعلیم کا تو ذکر ہی کیا

ہے۔نفسیات کے پروفیسر اتنی نفسیات بگھارنے کے باوجود اردو میں فرائیڈ یا ینگ کے نظریات پر ایک جامع کتاب تو کیا مقالہ تک تحریر نہیں کر سکے۔مختلف موضوعات پر مغرب میں جو بیش بہا علمی سرمایہ جمع ہوا ہے اسے ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں منتقل کرتے کرتے صدیاں بیت جائیں گی۔ وہاں تک مغرب کہیں سے کہیں نکل چکا ہوگا۔علم کی جولانگاہ میں ہماری حیثیت باربرداری کے خچر سے زیادہ نہیں۔سائنس اور علوم کے معاملہ میں ہم محض لقمہ چیں اور پیوند دوز ہیں۔کاسۂ گدائی لیے چھوٹے سکے جمع کرتے ہیں لیکن طنطنہ شاہوں کا رکھتے ہیں۔

یونیورسٹی میں آپ نفسیات اقتصادیات اور سائنس کے شعبے کھولتے ہیں اور پھر اُن سرچشموں کو بند کرنے کی بات کرتے ہیں جو ان شعبوں کو سیراب کرتے ہیں۔یا تو آپ سائنس کا شعبہ بند کیجیے، یا ایسے فوق البشر پیدا کیجیے جو مغرب سے استفادہ کیے بغیر سائنس کی تحقیقات کرسکیں، اور اگر یہ دونوں کام نہیں کرسکتے تو عالموں کے انکسار سے جو فیض آپ کو مغربی علوم سے پہنچا ہے اس کا شکریہ ادا کیجیے۔

علوم کی بات چھوڑیے۔کیا آپ اقبالؔ، ٹیگور اور فراقؔ کی شاعری تک کو مغربی علوم اور تہذیب کے حوالوں کے بغیر پڑھ سکتے ہیں۔مغرب کے سب سے زیادہ چرچے تو انہیں تنقیدوں میں ملتے ہیں جو اقبالؔ پر لکھی گئی ہیں۔مغرب سے اقبالؔ کو جھگڑا تھا لیکن انہیں جھگڑا تو مشرق سے بھی تھا۔مغرب سے بھی اقبالؔ نے اتنا ہی فیض حاصل کیا ہے جتنا مشرق سے۔

تنقید کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ مکمل طور پر سائنس کی قطعیت کو پہنچے۔تنقید سائنس نہیں ہے لیکن وہ سائنس بننا چاہتی ہے۔اگر ایسا ہے تو تنقید بھی مغرب سے اسی قدر متاثر اور فیض یاب ہوگی جتنے کہ دوسرے علوم ہوتے ہیں اور مغربی تنقید کے سامنے ہم صرف طفلِ مکتب ہیں۔حالیؔ، کلیم الدین کلیم، احتشام حسین، آل احمد سُرور، حسن عسکری، شمس الرحمان فاروقی سب کے سب مغرب کے خوشہ چیں رہے ہیں۔ہم ایک بھی ایسے نقاد کا نام نہیں لے سکتے۔جو مغرب سے بے نیاز رہ کر خالص دیسی علوم کے بل بوتہ پر بڑا نقاد بنا ہو۔ہماری تنقید میں جو کچھ بھی دبازت ہے وہ مغرب کی چکّی کے پسے ہوئے آٹے کی دین ہے۔محقق خدابخش لائبریری پر قناعت کرسکتے ہیں، نقاد کو تو ان کتب خانوں کے بغیر چارہ نہیں جہاں مغربی تنقید کا گنج گراں مایہ میسر ہے۔ان کتب خانوں کی سیر بھی سمندِ شوق کا تازیانہ بننے کی بجائے حوصلے توڑ دیتی ہے۔نقاد خود میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ وہ کسی موضوع کی ببلوگرافی کا بار بھی اٹھا سکے۔مغربی نقاد جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے EXHAUST کر دیتے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب اور آرٹ کے موضوعات پر لکھتے وقت نقاد ان بیش بہا تنقیدی کارناموں سے محض اس وجہ سے صرفِ نظر کرے کہ وہ لوگ جو انگریزی سے واقف نہیں یا جنھوں نے مغربی ادب کا ڈھنگ سے مطالعہ نہیں کیا، تنقید میں مغربی نقادوں کے حوالے دیکھتے ہیں تو اپنی خفّت اور احساسِ کمتری کی پردہ پوشی کے لیے دیش بھگتی اور مشرقیت اور غریب عوام کی جذباتی ہمدردی پر مبنی ٹریڈ یونین سیاست کی کلی شیز کا استعمال کرتے ہیں۔۔۔پھر آپ اس بات پر بھی غور کیجیے کہ مغرب سے آئی ہوئی مارکسی آئیڈیالوجی کا تو ترقی پسند نقادوں پر محض اثر ہی نہیں بلکہ ایسا گہرا تسلط تھا کہ نقاد کسی بھی چیز کو اپنی نظر سے دیکھ ہی نہیں سکا۔سچ بات یہ ہے کہ علم کی دوڑ میں مغرب ہم سے بازی لے گیا ہے۔اور ہم گرد کارواں پھانکتے رہ گئے ہیں جسے دیکھو اس کے کاسۂ گدائی میں چبائے ہوئے نوالوں کا ملغوبہ ہے۔لیکن ٹھسّہ ایسا ہے گویا آسمان سے من وسلویٰ کی بارش ہو رہی ہے۔

پنڈت نہرو کے زمانے ہی میں ہندوستان نے گاندھیائی نظامِ معیشت کی بجائے صنعتی نظام کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔وہ لوگ جو اس فیصلہ کو پسند کرتے ہیں انہیں زراعتی آدمی کی بجائے صنعتی آدمی کے طور پر مسائل کو حل کرنا چاہیے۔صنعتی تمدن کا سب سے بڑا وار تو جغرافیائی فاصلوں پر پڑا ہے، لیکن ہم آج بھی ذہنوں کے بیچ مشرق و مغرب کی دیواریں قائم کیے ہوئے ہیں۔یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کوئی بھی ملک جو صنعتی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو، مغربی سائنس اور ٹکنولوجی کے دھارے سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔سائنس اور ٹکنولوجی کا اثر کلچر پر بھی ہوتا ہے۔ریڈیو صرف قوالیاں نہیں سناتا بلکہ ہر قوالی کے بعد بآواز بلند پورے خاندان کے بیچ نرودھ کا اشتہار بھی دیتا ہے۔سائنسی ایجادات سے رہن سہن کے طریقے ہی نہیں بدلتے، اخلاقی اور تہذیبی قدریں بھی بدلتی ہیں۔اگر آپ سائنس، مغربی علوم اور صنعتی دور کے پیدا کردہ تہذیبی رجحانات سے بیزار ہیں تو مجھے بتائیے کہ خالص دیسی علوم کی بنیاد پر آپ صنعتی معاشرہ کی تعمیر کیسے کریں گے۔دیش بھگت لوگ انگریزی کو نکال باہر کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی صنعتی ترقی بھی چاہتے ہیں حالانکہ صنعتی ترقی صنعتی علوم کے بغیر ممکن نہیں جو انگریزی زبان میں ہیں۔ان علوم کو ہندوستان کی سولہ زبانوں میں اس وقت تک منتقل نہیں کیا جاسکتا جب تک معاشرہ ٹکنولوجی کی اس منزل میں نہ پہنچ گیا ہو جہاں ترجمہ کا کام بھی کمپیوٹر کرتا ہو، لہٰذا سب سے بڑا دیش بھگت بھی وہی ہے جو دیسی زبانوں کو مختلف علوم سے مالا مال کرنے کے لیے کمپیوٹر کے دور میں پہنچنا چاہتا ہو اور اس مقصد کے لیے جاں فشانی سے مغربی علوم اور زبانوں کا مطالعہ کرے۔تہذیبی تصورات کو پھلتے پھولتے ایک زمانہ لگتا ہے مختلف تہذیبوں کے بیچ مختلف زمینوں پر جا گرتے ہیں، لیکن وہی بیج پھوٹتے اور بارآور ہوتے ہیں جنہیں زمین راس آتی ہے۔ باقی سڑ گل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اردو میں سانیٹ، اور نہ جانے دوسری کیسی کیسی اصنافِ سخن کے تجربات کیے گئے، لیکن ان میں سے کسی میں بھی تخلیقات کا گراں قدر خزانہ پیدا نہ ہو سکا۔اس کے برعکس ناول اور افسانہ مغرب سے آیا اور اپنی جڑیں استوار کر لیں۔کیا وجہ ہے کہ ڈرامے کی سنسکرت روایت کے باوجود، مغربی ڈرامے کا اثر ہندوستان پر وہ نہیں ہوا جو مغربی ناول کا ہوا۔کہنے کا مطلب یہ کہ تہذیبی رجحانات کو جڑ پکڑتے اور نشو ونما

پاتے وقت لگتا ہے اور اُن کے پھلنے پھولنے کے پیچھے بے شمار تاریخی اور معاشرتی اور تہذیبی قوتیں سرگرم کار رہتی ہیں۔ کوئی تہذیب دوسری تہذیبوں کے اثرات سے محفوظ نہیں رہتی، محفوظ رکھنے کے لیے تہذیب کے گرد آہنی حصار تعمیر کرنے پڑتے ہیں۔ ایسا تحفظ اُن نواب زادوں کی مانند جنھیں محلّہ کے چھوکروں کی صحبت سے بچانے کی خاطر حویلی کی چار دیواری میں قید رکھا جاتا ہے، تہذیب کو کمزور، زرد، مرگھنا اور بیمار بنا دیتا ہے۔ اشترا کی روس کا اشترا کی حقیقت نگاری والا، آدرش وادی صحت مند ادب بیوروکریٹ کی اولاد کی مانند اتنا ثواب ادب، تقدس مآب نیک چلن اور خود آگاہ ہے کہ اسے پڑھتے وقت خانقاہ، آشرم، یا پہاڑی اسکول کی سیر کا لطف آتا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن وحشی کے ڈھول کی دھمک اور جنگل کے پھول کی مہک نہیں ہے گجراتی میں سریش جوشی نے ایک کہانی لکھی ہے۔ عنوان ہے، لوہے کا شہر، حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے پورے شہر پر لوہے کی ایک چھت تان دی جاتی ہے۔ سورج کی روشنی میں چھت تپتی ہے، لوگوں کو سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، لیکن سلامتی کی خاطر زندگی کو عذاب بنا لیتے ہیں اور سب کچھ برداشت کرتے رہتے ہیں۔ غزل کی شاعری سلامتی کی شاعری نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کی شاعری نہیں ہے جنہیں جان و دل، اور ایمان و آبرو عزیز ہے۔ یہ ان لوگوں کی شاعری جو گھروں کو لٹاتے ہیں، اور عزت و ناموس کا نیلام کرتے ہیں۔ کردار کی پرکھ سلامتی کی دیواروں میں نہیں، خوف و خطر کے بھنور میں ہوتی ہے۔ تخیل انجان اجنبی فضاؤں کو کھنگالتا ہے۔ تلاش گمنام جزیروں کی طرف کشتیوں کا رُخ موڑ دیتی ہے۔ تجربہ اپنی برہنہ کھال پر نامعلوم اور نامانوس کا گھاؤ جھیلتا ہے۔ تخلیق مہم جو، مہم کش، اور مہم ساز ہوتی ہے۔ اثرات کا ایسا خوف کہ موجِ ہوا میں خفیف سی خنکی بڑھ جانے پر ٹانگیں لرزنے لگیں، نفسیاتی بیماری نہیں تو اور کیا ہے۔ سوسان لینگر نے بتایا ہے کہ اثرات سے ادبی تحریکیں پیدا نہیں ہوتیں۔ اثرات تو صرف اس بیج کی نشو نما کرتے ہیں جو پہلے سے زمین میں موجود ہوتا ہے۔

یہ ایک بہت ہی نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے کہ آیا تنقید اُن رجحانات کا تجزیہ ہوتی ہے جو ادب میں جاری و ساری ہوتے ہیں، یا ادب اُن رجحانات کو اپناتا ہے جو بساطِ نقد پر سرگرم کار رہتے ہیں۔ کیا تنقید کو چاہیے کہ فلسفہ، مذہب، سائنس اور کلچر کے عظیم خیالات کو موضوع بحث بنائے تاکہ یہ خیالات سماج کی دانشورانہ فضا کے عناصرِ ترکیبی بنیں، اور اس طرح فنکارانہ تخیل کے لیے تخلیقی مواد کا سرمایہ بہم پہنچائیں۔ یہ ہے وہ سوال جو آرنلڈ کی تنقیدیں پڑھ کر پیدا ہوتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس خیال میں جزوی صداقت ہے۔ ادبی تنقید تخلیق کا سرچشمہ نہیں، البتہ فنکارانہ تخیل کی تربیت میں وہ اپنا تھوڑا بہت عطیہ پیش کرتی ہے۔ فنکار کی تخلیقی صلاحیت کو ڈھالنے اور اسے تب و تاب اور توانائی عطا کرنے میں، اس کی شخصیت، اس کا گرد و پیش، سماجی اور سیاسی حالات، اس کی ادبی روایت اور قومی تہذیب کا ورثہ، دوسرے علوم اور دوسری زبانوں کے ادب سے اس کی واقفیت، اور اپنی پسند کردہ اصنافِ سخن کے صنّاعانہ مسائل میں اس کی حرکی دل چسپی، اور ملک کی عام دانشورانہ فضا اپنا عطیہ پیش کرتے ہیں۔ کسی ایک پر ضرورت سے زیادہ زور دینا مناسب نہیں۔ ہمارے پاس ایسے شواہد بہت کم ہیں جن سے ثابت کیا جا سکے کہ تنقید واقعی کلی اور حتمی طور پر فنکار کے تخلیقی روّیوں کا تعین کرتی ہے۔ ترقی پسند تنقید کی ناک کے نیچے میراجی، راشد، اختر الایمان، مجید امجد، مختار صدیقی، منٹو، غلام عباس، بیدی اور دوسرے بے شمار لکھنے والے ایسا ادب پیدا کرتے رہے جس پر ترقی پسند خیالات کی پرچھائیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہر فنکار اپنی ذات سے ایک اکائی ہوتا ہے اور اپنی تخلیقی ضرورتوں کے مطابق اپنا راستہ آپ متعین کرتا ہے۔ چونکہ وہ ایک کھلی دانشورانہ فضا میں جیتا ہے اس لیے ادب اور تنقید کے مختلف اثرات اس پر پڑتے ہیں لیکن وہی اثرات بارآور ثابت ہوتے ہیں جو اس کے تخلیقی مزاج کے مطابق ہوتے ہیں۔ نقاد، تنقید میں ہر مسئلہ کا محققانہ، عالمانہ اور معروضی فحص کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تنقید پختہ ذہن اور بالغ نظر لوگوں کے لیے لکھ رہا ہے۔ اسی لیے اسے یہ خوف نہیں ہوتا کہ اس کی تنقید کو پڑھ کر لوگ گمراہ ہو جائیں گے یا اس کے نظریات اور تصورات فنکاروں کو ورغلا کر غلط راستہ پر لگا دیں گے۔ وہ جانتا ہے کہ بالغ نظر فنکار اپنا تخلیقی روّیہ آپ متعین کرتا ہے۔ چنانچہ ایسی طفلانہ باتیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں کہ جدیدیت کے نظریہ سازوں نے نئے فنکاروں کو سماج اور سیاست سے دور کر دیا۔

تنقیدی ذہن کی قدر و قیمت، غیر تنقیدی ذہن سے اسی لیے زیادہ ہے کہ وہ جذبات کو بھڑکانے، سہانے خواب دکھانے اور تعصّبات کو پالنے پوسنے والے دل خوش کن خیالات کا آسانی سے شکار نہیں ہوتا۔ تنقیدی ذہن ہر قوم کی آئیڈیالوجی اور ہر قسم کے فلسفہ کا مطالعہ کرتا ہے اور اسے یہ خوف نہیں ہوتا کہ کوئی آئیڈیالوجی اسے بھی اس طرح مغلوب کرے گی جس طرح جاہل عوام کو کرتی ہے۔ فنکار کے لیے تنقیدی نگارشات کا مطالعہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اپنی تمام تخلیقی قوت کے باوصف اگر اس کا ذہن غیر تنقیدی ہے تو اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ بہت سے معاملات میں وہ سادہ لوحی کا شکار ہو جائے گا۔ نظر کی درّاکی اور ذہن کی سوفسطائیت اسے پیچیدہ مسائل کے آسان حل تلاش کرنے، اور عامیانہ خیالات، ناپختہ احساسات اور سادہ انگاری اور صوبائیت سے محفوظ رکھتی ہے۔ تنقید کا کام عقائد کا ٹھونسنا، قائل کرنا، یا ذہن کی دھلائی کرنا نہیں ہے بلکہ ذہن کو روشن کرنا ہے تاکہ افکار و تصورات کی اصل ماہیت واضح ہوتی رہے۔ نقّاد فنکار کا مرشد، سالکِ راہ، استاد یا معلم نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک عام قاری کی ترقی یافتہ شکل ہے جو ادب کے تجربات کا بیان کرتا ہے اور اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ فنکار ادب ہی کا نہیں بلکہ خود اپنی تخلیقات کا بھی ایک عام قاری ہوتا ہے۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ فنکار کا ادب کا مطالعہ کیسا ہونا چاہیے، اور ادبی مطالعہ سے بے نیازی کے اثرات اس کے تخلیقی کام پر کیسے پڑتے ہیں۔

جس طرح فنکار ایک بنی بنائی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے اور اپنا تخلیقی مواد اپنے گردوپیش سے حاصل کرتا ہے، اسی طرح وہ اظہار کے وسائل بھی اس فنی اور تہذیبی روایت میں پاتا ہے جو اسے ورثہ میں ملی ہے۔ ان وسائل کو وہ قبول کرتا ہے، ان میں اجتہادی تبدیلیاں کرتا ہے، اور ضرورت پڑنے پر ان سے مکمل انحراف بھی کرتا ہے۔ فنکاری ہنرمندی اور صنعت گری ہے۔ اپنے اوزاروں کو ٹھیک سے استعمال کرنے کی سلیقہ مندی بھی ہے۔ ہر نیا تخلیقی تجربہ ایک نئ مشقِ سخن ہے۔ قادرالکلامی کا ایسا تصور کہ فنکار کو زبان اور اسلوب پر قدرت حاصل ہوگئ ہے، اب وہ ان کی طرف بے نیازی برت سکتا ہے، اور موضوع پر دھیان مرکوز کر سکتا ہے، فن میں MANNERISM کی بدعت کو راہ دیتا ہے۔ اعلیٰ فنکاری کبھی میکانکی نہیں ہوتی۔ قادرالکلامی مشین کی کھٹا کھٹ نہیں ہے کہ شعر ڈھلتے چلے جائیں۔ ہر نظم ایک نئ تخلیق ہوتی ہے۔ اور ایک نئ جانکاہی اور جگرکاوی کی دعوت دیتی ہے۔ اس نکتہ سے واقف نہ ہو تو بڑے سے بڑا فنکار خود کو دہرانے لگتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے اس نے نیا کہنے کی کوشش کی بھی یا نہیں۔ فن میں تازگی نہ رہے تو پختگی تک اپنی قدر کھو دیتی ہے۔ فنکار کی سب سے کڑی آزمائش اپنے احساس کے شعلہ کو بھڑکتے رکھنے میں ہے، ورنہ تخلیقی لگن تھکن میں بدل جائے گی، اور اعجازِ تخیل صرف شعبدہ بازی کرے گا۔ فنکار کے لیے مشقِ سخن تعلیم اور تربیت کا کوئی ایک مخصوص زمانہ نہیں ہوتا۔ فکرِ سخن کا ہر لمحہ مشق سخن کا لمحہ ہے، اور تعلیم و تربیت کا دور پوری زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔ تخلیق کے شعلہ کو جلتا رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ فنکار اپنی ہوش مندی کو مختلف منزلوں اور مقامات سے گزارے، خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا رہے، جذبۂ تجسس اور تحیّر کو کبھی ٹھنڈا پڑنے نہ دے کسی جواب کو آخری جواب نہ سمجھے اور تادمِ آخر سوالات کے سلسلہ کو ٹوٹنے نہ دے۔ تعلیم کا مطلب ڈگری لینے اور تربیت کا مطلب استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے سے نہیں ہے حالانکہ دونوں کاموں میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ سوائے فنکاری کے کسی اور چیز سے سروکار نہ رکھنے کا نتیجہ خود فنکار کے لیے افسوناک ثابت ہوسکتا ہے۔ انسان کی علمی اور ادبی، تہذیبی اور تمدنی، فلسفیانہ اور دانشورانہ سرگرمیوں کے جھرنے اگر فنکار کے ذہن کو سیراب اور احساس کو شاداب نہ کرتے رہیں تو تخلیقِ فن کا سوتہ بھی خشک ہو جاتا ہے۔ فنکارانہ بانجھپن کی وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں۔ ان میں دانشورانہ کم مائیگی نوجوان فنکاروں کی جواناں مرگی کا بہت ہی واضح سبب رہی ہے۔ ایک پختہ تربیت یافتہ تازہ کار تخلیقی ذہن کی پیدائش کے مواقع مطالعہ کے کمرے میں بہ نسبت ٹریڈ یونین آفس کے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ مطالعہ زندگی کے دلکش اور دل فروز ہنگاموں کی ضد اور انکار نہیں بلکہ توسیع ہے۔ یہ کرم کتابی ہی ہوتا ہے جو زندگی کے لیے زیادہ تیار ہوتا ہے کیونکہ شعر و ادب کے ذریعہ وہ بے شمار تخیلی تجربات سے گزرتا ہے، اپنی ایک زندگی میں ہزار زندگیاں جیتا ہے، اور اسی لیے زندگی پہنائیوں اور ہنگامہ آرائیوں کی بہتر آگہی رکھتا ہے، جب شاعر کتب بینی کو گھوڑے پر گھاس لادنے کے مترادف سمجھتا ہے اور مطالعہ کا کام نقاد کے حوالے کر دیتا ہے، تو وہ علمی فکری اور تخیلی سرگرمیوں کے اُن سرچشموں ہی کو بند کر دیتا ہے اور ادب کے دوسرے فنکاروں کے فن ہی سے سیکھ لیتا ہے۔ فنکار زندگی کے مطالعہ سے ادب کا مواد حاصل کرتا ہے اور ادب کے مطالعہ سے اس مواد کو برتنے کے آداب سیکھتا ہے۔ فارم کا پورا مسئلہ ادبی روایت سے منسلک ہے اور روایت کی روشنی ہی میں اسے سمجھا جا سکتا ہے وہ فنکار جو اپنے پیشہ ور اور ہم عصر فنکاروں کے اسالیب سے واقف نہیں وہ اپنا منفرد اسلوب بھی کیسے ایجاد کر سکتا ہے۔ انحراف کے لیے بھی راویت کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی لیے ہر اہم اور معنی خیز انحراف روایت کے سلسلہ ہی کی ایک کڑی بن جاتا ہے۔ ایلیٹ نے بتایا ہے کہ روایت محض ورثہ میں نہیں ملتی بلکہ محنت اور شعوری کوشش سے اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ فنکار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جدید اور قدیم زبانوں کے ادب کے مطالعہ کے ذریعہ اصنافِ سخن، اسالیب اور اظہار کے رنگارنگ طریقوں سے واقف ہوتا رہے۔ یہ دوسرے فنکاروں کا مطالعہ ہے جو فنکار کو بتاتا ہے کہ انھوں نے اپنی جذباتی وارداتوں، اور اندرونی کش مکشوں کے بیان کے لیے کون سی راہ اپنائی۔ وہ جانے گا کہ اسلوب کی کون سے خرابیاں فنکارانہ شخصیت کی کون سی کمزوریوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر اسلوب میں جھول اور وضاحت ہے تو شاعر کے پاس تخلیقی مواد کا سرمایہ محدود ہے۔ لجلجا پن ہے تو شاعر جذبات میں نظم و ضبط پیدا نہیں کر سکا۔ رقّت ہے تو کہیں نرگسیت کی وجہ سے تو نہیں۔ خطابت کہیں اس وجہ سے تو نہیں کہ تخیّل کا استعمال انکشافِ حقیقت کی بجائے تبلیغِ حقیقت کے لیے ہو رہا ہے۔ وہ جانے گا کہ بڑے فنکاروں نے اپنے جذبات کو کیسے سنبھالا اور اپنی تخلیقی شخصیت میں رچاؤ اور پختگی کس طرح پیدا کی۔ اسے معلوم ہوگا کہ جذبہ کے اظہار اور جذباتی بننے میں کیا فرق ہے، سوگواری اور خود ترحمی کے کیا معنی ہیں، اور دردمندی کی قیمت پر صلابت فکر خریدی جا سکتی ہے یا نہیں۔ تکنک اور اسلوب کا مطالعہ اس طرح فنکار کے جذبات کی تادیب بھی کرے گا۔ عام زندگی میں فنکار بھلے اعصاب زدہ اور جذباتی، جھگڑالو اور جھکّی ہو لیکن جب وہ کاغذ پر قلم رکھتا ہے تو آدابِ فن اسے آدابِ زندگی بھی سکھاتے ہیں۔ جذبات اُمنڈ اُمنڈ کر آتے ہیں لیکن اب وہ انہیں قابو میں رکھتا ہے، پہلے چھوٹی چھوٹی باتوں پر چراغ پا ہو جاتا تھا اب ٹھنڈے کلیجہ سے حقیقت سے آنکھیں چار کرتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی سماج اور عصری سیاست کے جن مسائل پر وہ کف دردہاں ہو جاتا تھا، وہ اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں، اور اب تخلیق کے لمحہ میں وہ خیالات اور جذبات اُمڈے آ رہے ہیں، جن کا اُن واقعات سے کوئی تعلق نہیں جو دن بھر اسے الجھاتے رہے ہیں۔ ایسے واقعات در آئے ہیں تو وہ سوچتا ہے وہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اگر اُن پر طنز کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ طنز بودا تو نہیں۔ اگر اُن کے ہونے میں یا اُن کے بیان میں کوئی حسن کاری نہیں تو روحِ عصر اور عصری آگہی کی پروا کیے بغیر وہ انہیں نکال باہر کرتا ہے۔ اس طرح تکنک اسلوب اور ڈکشن

کے معاملات (یعنی اس کا جمالیاتی شعور) اس کی فنکارانہ شخصیت کی تہذیب کرتے ہیں اور یہ شعور اسے حاصل ہوتا ہے اُن چھوٹے بڑے فنکاروں کے مطالعہ سے جو مِل جُل کر ادبی روایت کی تعمیر کرتے ہیں۔ ادب اور آرٹ سے اس گہرے شوق وشغف کے بغیر اعلیٰ فنکاری ممکن نہیں۔ جہاں آپ نے آرٹ کو اپنی زندگی کی ثانوی سرگرمی بنایا آرٹ بھی آپ سے انتقام لیتا ہے اور آپ کو دوسرے درجہ کا فنکار بنا کر رکھ دیتا ہے۔ میں بات فنکار کے عالمِ فاضل ہونے کی نہیں کر رہا، اور نام کے آگے ایم اے تو لوگ ''بیسویں صدی'' کے اوراق ہی میں لکھتے ہیں۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ باتیں جو فنکار کے کام کی باتیں ہیں، اور جو ردیف قافیہ کی ہنر مندی سے لے کر زندگی کرنے کے فن تک پھیلی ہوئی ہیں، انہیں سیاسی پمفلٹوں اور نقّادوں کی تنقیدوں کے ساتھ ساتھ اُن فن پاروں سے بھی سیکھنا چاہیے جو بتاتے ہیں کہ دنیا کے عظیم فنکاروں کا انسان اور زندگی کا کیا تجربہ رہا ہے، انھوں نے آدمی کے روحانی اخلاقی وجودی اور سماجی مسائل پر کس طرح سوچا ہے، اپنی ذات کو خیر وشر کی رزم گاہ بنانے، جذبہ کے دھارے پر بہنے اور احساس کی آگ میں جلنے کے کیا معنی ہیں، اندرونی کش مکش کو چاقو کی دھار کیسے بنایا جاتا ہے اور مصلوب مسیح کی دردمندی کا گوہر کون سی موجوں کے طمانچے کھانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ذہن کی تربیت، جذبات کی تہذیب اور شخصیت کی تادیب کی بہترین درسگاہ ادب ہے، کیونکہ اس کا تعلق جن انسانی مسائل سے رہا ہے، اگر انہیں آدمی پہچان لے تو بہت سے سماجی اور سیاسی بکھیڑے پیدا ہی نہ ہوں۔ سیاسی تعصّبات کی بنا پر ہمارے بہت سے لکھنے والوں نے اعلیٰ ادب کے ایک بڑے ذخیرے کو خود کی ذات پر حرام کر لیا۔ انسانی زندگی کی وسیع پہنائیوں کو چند آدرشوں اور عقیدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ بودلیئر یا ایلیٹ کو پڑھنے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اُن کے جیسی شاعری کرے، یا ان کے اسلوب، طرز اور ٹکنک کو اپنائے، یا اُن کی ہوش مندی کو اپنی ہوش مند بنائے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ وہ جانے کہ ان کا درد کیا ہے، وہ کس اندرونی کرب کا شکار ہیں، اور اُن کی دل گرفتگی اور دردمندی کی نوعیت کیا ہے، دوسروں کے احساس کی نزاکتوں کو سمجھنے کا مطلب ہے اپنے احساس کی آگہی۔ یہ فنکار ہی تو ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارا احساس کتنا سخت اور تنگ ہو گیا ہے، انسانی ہمدردیوں کا دائرہ کتنا محدود ہے، اور اپنی اخلاقی پاکیزگی، راست روشی، اور مقدّس عقائد اور آدرشوں کی پرستش کے باوجود ہم ایک سخت گیر تند جبیں اور چڑ چڑے کٹھ ملّا سے مختلف نہیں بن پائے۔ فنکار سیاسی آگہی تو ناشتہ کی میز پر حاصل کر لیتا ہے۔ البتہ زندگی اور فن کی آگہی کے لیے اسے فنکاری کو رگِ جاں سے قریب کرنا پڑتا ہے۔ اس نے اتنا کر لیا تو چونّی کا اخبار، فلمی گانے، تنگ نظر مولوی، اور کافی ہاؤس کی خوش گپیاں اور گالیاں اس کی زندگی کے پیٹرن میں اپنا اپنا مقام بنا لیتے ہیں۔ اتنا نہ کیا تو جس چیز کو اس کا مناسب مقام نہیں ملتا وہ فنکار کا فن ہوتا ہے۔

☆

- بقیہ -

''بادشاہ اوروں کی خاطر''

'آ رہا ہے اک ستارہ ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامان ظلمت کے شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئینِ فطرت کو نثار
کس قدر بے باک کتنا تیز کتنا گرم رو
جس سے سیّاروں کی آسودہ خرامی شرمسار
موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہیں کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لئے
بڑھ رہا ہے کرّۂ گیتی کا شوقِ انتظار
لیکن ایسے انجمن روشن جبین وتابناک
آپ ہو جاتے ہیں اپنی تابنا کی کا شکار۔''

میں اپنے اس مضمون کو سردار جعفری کی ہی ایک اہم نظم 'کربلا' کے ایک بند پر ختم کرتی ہوں کہ عہدِ حاضر میں انہوں نے کربلا کو بطور استعارہ لیا ہے۔ برسوں پہلے جب میں سرینگر کے مولانا آزاد روڈ وومینز کالج کی طالبہ تھی، ان دنوں سردار جعفری ہمارے کالج میں مدعو کئے گئے تھے۔ انہوں نے یہی نظم سنائی تھی۔ مگر یہ نظم آج بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے جتنی کہ اس وقت تھی بلکہ بالکل حسبِ حال ہے۔

''۔۔۔۔۔ یہ مدرسے دانش کدے علم وہنر کے مے کدے
ان میں کہاں سے آ گئے یہ کرگسوں کے گھونسلے
یہ جہل کی پرچھائیاں لیتی ہوئی انگڑائیاں
دانش ورانِ بے یقیں، غیروں کے دفتر کے امیں
ان کے تصرف میں نہیں خونِ بہارِ زندگی
ان کے تصرف میں نہیں خونِ حیاتِ جاوداں
برہم ہے ان سے رنگِ گل، آزردہ ہے بادِ صبا
اے کربلا اے کربلا۔''

○

''گنبدِ خضرا''

نعت

دل کا نگر سلگ اٹھا غم کی گھٹاؤں میں
ٹھنڈک ملے گی گنبدِ خضرا کی چھاؤں میں

کیجیے دعا! مدینے میں رہنا نصیب ہو!
دم گھٹ چلا ہے کیا رہیں اجڑے سے گاؤں میں

قدموں میں اب تو انؐ کے گزاریں گے زندگی
آقاؐ سے دور ہم بھی گھرے ہیں خطاؤں میں

غیروں کو بھی بنایا ہے اپنا حضورؐ نے
شیخِ حرم ہے اور ہی اپنی ہواؤں میں

یلغار ہر طرف سے ہے آقاؐ بچائیے!
مشکل ہے سانس لینا بھی ایسی فضاؤں میں

ایماں یہی ہے زندہ حقیقت ہیں آپؐ ہی
رکھئے حضورؐ یاد ہمیں بھی دعاؤں میں

اب تک وہی ہے نعت نگاروں کا اعتبار
آقاؐ کمی نہ آئے گی اِن کی وفاؤں میں

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

نعت

ہمارے نبیؐ کا مدینہ تو دیکھو
کرو چشمِ دل کو جو بِینا تو دیکھو
نبیؐ کی محبت سے سرشار ہے جو
وہ دِل کا مدینہ، وہ سینہ تو دیکھو
وہ جس نے بھی دیکھا ہے شہرِ مدینہ
یہی کہہ رہا ہے ، مدینہ تو دیکھو
وہ بطحا کے باسی، وہ سُکّانِ طیبہ
زہے زندگانی، وہ جینا تو دیکھو
وہ پیاروں کے مدفن ہیں قدموں کی جانب
وہ ہیرے، جواہر، دفینہ تو دیکھو
دوشنبہ ولادت، دوشنبہ ہی رحلت
نبیؐ کا مبارک مہینہ تو دیکھو
وہ گنبد، وہ روضہ، وہ روضے کی جالی
وہ ساغر ، وہ بادہ، وہ مِینا تو دیکھو
فضائیں یہاں آج تک مشکبُو ہیں
نبیؐ کا معتبر پسینہ تو دیکھو
حسینؓ و حسنؓ، فاطمہؓ روشنی ہیں
محمدؐ کا نُوری سفینہ تو دیکھو
نہ سونا، نہ چاندی، بچھونا زمیں پر
یہ شاہِ اُممؐ کا خزینہ تو دیکھو
مؤدّب ہوں الفاظ سب ایستادہ
ذرا نعت کا تُم قرینہ تو دیکھو
شفیقؔ اس کا ثانی نہیں ہے جہاں میں
وہ یکتا ، یگانہ مدینہ تو دیکھو

شفیق احمد فاروقی
(مدینہ منورہ)

نعتِ رسولؐ

مصدر علم و ادب ہیں آپؐ ایقانِ کلام
آپؐ سے روشن ہے ہر شمعِ دبستانِ کلام
آپؐ کی ہے حکمرانی لہجہ و گفتار پر
آپؐ ہیں شاہِ تکلّم آپؐ سلطانِ کلام
آپؐ آئے تو کھلے لفظ و معانی کے گلاب
آپؐ کے دم سے ہے عنبر بیز گلدانِ کلام
بات کرنے کا سلیقہ ہم کو کب تھا کہاں
آپؐ ہی کی ذات نے بخشا ہے عرفانِ کلام
ان کے سب اقوال زرّیں ہیں متاعِ بے بہا
ان کا ہر طرزِ بیاں ہے میرا سامانِ کلام
آپؐ کے حرفِ تکلّم کو مٹا سکتا ہے کون
آپؐ ہیں شانِ تکلّم آپؐ ہیں جانِ کلام
کھل گئی جس دن سے اس شمع فیروزاں کی زبان
ہوگئی روشن اسی دن سے شبستانِ کلام
کیوں نہ آئے پختگی ہر نعت کی تخلیق میں
سرورؐ دیں ہیں ستونِ قصر و ایوانِ کلام
میں یہ سمجھوں گا مری محنت ٹھکانے لگ گئی
نعت سے بھر جائے گا جب میرا دیوانِ کلام
گفتگو کرنے کا فن مجھ کو سکھا دیجے حضورؐ
طرزِ شریں سے ہے خالی میرا دامانِ کلام
آپؐ ہی کر لیجیے روئے سخن میری طرف
ہے بہت محدود میرا ذوقِ وجدانِ کلام
ہے انہیں کی گفتگو سننے کو صابرؔ بے قرار
خوشبوؤں سے ہے معطّر جن کا بستانِ کلام

صابر عظیم آبادی
(کراچی)

سلام

لہو میں ڈوبی ہوئی پیاس کی کہانی ہے
ترے فرات کا پانی بھی پانی پانی ہے

جہانِ فانی ہے دنیا یہ آنی جانی ہے
مرے حسینؑ ترا ذکر لا مکانی ہے

ترے جمال میں حق کا جمال روشن ہے
ترے خیال میں پوشیدہ کامرانی ہے

کسی کا اب بھی کوئی انتظار باقی ہے
کہیں سے لاش نئی کیا کوئی اٹھانی ہے

حسینؑ ایک تھا اور ایک ہی رہے گا سدا
یہ کون جیت گیا ہار کس نے مانی ہے؟

سمیع نوید
(میانوالی)

رات گئے قتل

کرتار سنگھ دُگل

(گورمکھی سے ترجمہ)

حنیف باوا (جھنگ)

تائی گنیشی مرگئی۔تائی گنیشی کوکسی نے ماردیا۔تائی گنیشی کا کسی نے گلا دبا دیا تائی گنیشی کوسوتے میں کسی نے قتل کردیا۔تائی گنیشی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے گئے۔تائی گنیشی یخ بستہ خون میں پڑی ہے بے چاری تائی گنیشی اور پھر یہ خبر تھانے پہنچ گئی۔

لوگ حیران پریشان، گھر والے ہکّا بکّا تھے۔یہ ہوکیا گیا تھا۔بھلی چنگی سوئی تھی ہرطرح خیریت سے تھی۔کوئی کہتا گزشتہ روز مجھے وہاں ملی تھی۔کوئی کہتا کل مجھے یہ کہہ رہی تھی۔شام کے وقت مویشیوں کے لیے اُس نے گتاوا کیا۔پھر بھینس اور گائے کا دودھ دوہا۔پھر مندر گئی بعدازاں اُس نے کھانا کھایا۔پہلے تمام کنبے کوکھانا کھلاتی رہی تھی۔پھر اُس نے باروچی خانہ سنبھالا۔سردیوں کی راتیں اِدھر دِن ڈھلا اُدھر رات آ گئی۔وہ اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔گھر کے کاموں سے تھکی ماندی لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

گھر والے، باہر والے بار بار پریتو سے پوچھتے۔یہ ہوکیا گیا ہے۔پریتو کے کمرے میں ہی تو گنیشی سویا کرتی تھی۔ایک طرف پریتو کا پلنگ، اُس کی میز، کتابوں کاپیوں کا المانی، سامنے والے کونے میں تائی گنیشی کی چارپائی ہوتی تھی۔پڑھنے لکھنے میں بھی پریتو کے کیا کہنے۔آدھی آدھی رات تک مطالعہ میں مصروف رہتی۔اُس کا استاد اُسے پڑھانے کے لیے آتا تو تائی گنیشی جوان لڑکی کونظر میں رکھنے کے لیے اُس کے کمرے میں لیٹ جاتی۔

جب بار بار پریتو سے پوچھا جاتا تو پریتو گھبرائی ہوئی آنکھ سے ہر کسی کودیکھتی اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک تو پریتو کے کمرے میں وہ جان بحق ہوئی دوسرے تائی گنیشی نے اُس کی اس طرح پرورش کی جیسے وہ اُس کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہو۔تائی گنیشی بانجھ تھی۔دس برس کی تھی جب اُس کی شادی ہوگئی تھی۔گیارہ برس کی ہونے پر اُس کا خاوند فوت ہوگیا اور تائی گنیشی صبر شکر کر کے بیٹھ گئی۔تمام عمر وہ اپنی دیورانی کے بچوں کو پالتی رہی ساری زندگی وہ گھر کے ڈھور ڈنگروں کوسنبھالنے میں انتہائی مصروف رہتی۔پھر وہ خاموشی سے اگلے جہان کوسدھار گئی۔بوڑھی تھی۔اتنی بھی بوڑھی نہیں تھی کہ بنا سر درد اور بغیر بخار کے اس طرح چلی جائے۔

ہر شخص حیران تھا۔گھر گھر باتیں ہورہی تھیں۔کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔غرضیکہ جتنے منہ اُتنی باتیں۔تائی گنیشی کے ماننے والے بھی تو ہرجگہ موجود تھے۔ہر گھر میں اُس نے دوستیاں پال رکھی تھیں۔کسی کوکچھ دیتی، کسی کے ہاں کچھ بھیج رہی ہوتی۔دودھ اور دہی میں اشتراک خوشی اور غمی میں شراکت ہر کسی کے کام آتی اور خوش ہوتی۔اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی گنیشی لیکن خدا نے اُسے کچھ بھی عطا نہ کیا۔اُس نے تو اپنی تمام عمر پرستش میں گزار دی۔صبح شام مندر جاتی۔بھگوان کی آرتی اُتارتی۔وہ گھنٹوں آنکھیں بند کر کے گیان دھیان میں لگی رہتی۔اُس نے کبھی کسی کا بُرا نہیں سوچا تھا اور نہ کسی کی برائی کی تھی۔اُس کے من میں کبھی بُری سوچ آئی ہی نہیں تھی۔تائی گنیشی آنکھوں میں کچھ ڈالتی تو آشوبِ چشم لحہ بھر میں دُور ہو جاتا اور آنکھیں بھلی چنگی ہو جاتیں۔تائی گنیشی جب ٹُونا کرتی تو روگیوں کے روگ دُور ہو جاتے، پریتو کو تو اُس نے اپنی جند جان سمجھ رکھا تھا۔

ادھر وہ پیدا ہوئی اُدھر اُس نے سنبھال لیا۔وہ ماں کے پاس صرف دودھ پینے کے لیے ہی جاتی تھی۔وہ سوتی ہی تائی گنیشی کے پاس ہی تھی۔گنیشی ہی اُس کا گند صاف کرتی پھر جب پریتو بڑی ہوئی تو اس کے تمام کام گنیشی ہی سر انجام دیتی۔پریتو جب جوان ہوئی تو اس کی ہر ضرورت تائی گنیشی ہی پورا کرتی۔تائی گنیشی اُسے بیٹا کہتے ہوئے نہ تھکتی تھی۔لاکھ پریتو کی آؤ بھگت ہوئی۔لاکھ اس کی حفاظتیں ہوئی لیکن اس کے باوجود بھی اگر اُسے ذرا سی بھی آنچ آتی تو تائی گنیشی اُس کی فکر میں پاگل ہو جاتی۔ہمیشہ پریتو کو اچھی نصیحتیں کرتی رہتی۔رب کریم سے ڈر کر رہنا چاہیے۔اچھے بول بندے کوخدا کے نزدیک رکھتے ہیں۔

اور وہ اچھی تائی گنیشی نیند میں ہی چلی گئی۔کسی کو یہ یقین نہ آتا کہ وہ سُرگباش ہوگئی تھی۔

کوئی کہتا کہ باہر سے آ کر کوئی اس کا گلا دبا گیا ہے۔باہر سے کوئی کیسے آتا؟ رات کے بارہ بجے تک تو پریتو کا استاد اُسے پڑھاتا رہا تھا۔آج کل امتحانات کے دنوں پریتو تمام رات پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔کالج کی پڑھائی بھی کہیں آسان ہوتی ہے؟ جیسے ہی ماسٹر صاحب گئے پریتو نے باہر ڈیوڑھی دروازہ بند کر کے آئی تو اُس نے دیکھا کہ تائی گنیشی ٹھنڈی یخ تختہ سی بنی پڑی ہے۔

پریتو نے شور مچادیا کہ اگر کوئی باہر سے آتا تو اس کے زیور نا اتار کر لے جاتا۔تائی گنیشی کے کپڑے اُس کی بالیاں، اُس کی انگوٹھیاں ویسی کی ویسی پڑی تھیں۔کسی نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا تھا کوئی کہتا تائی گنیشی نے کچھ کھا لیا تھا۔زہر کھا کر خود کوختم کرلیا تھا۔کس لئے؟ اگر کچھ کھانا ہوتا اُس وقت کھا لیا ہوتا جب رب نے اُس کا خاوند اُس سے چھین لیا تھا۔جس کا اُس نے ابھی تک چہرہ تک نہیں دیکھا تھا۔اگر کچھ کھانا ہوتا تو اُس وقت نا کھا لیا ہوتا جب عالم شباب میں اپنا وجود سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔اگر کچھ زہر مار کرنا تھا اُس وقت کرتی جب دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جوانی اُس کے ہاتھ سے نکلی جارہی تھی۔اس کے کنوارے ارمان اسی طرح

اس کے سینے میں دبے کے دبے رہ گئے تھے۔اب بھلا اُس نے کیوں کچھ کھانا تھا۔
اور کوئی کہتا اُسے کسی نے کچھ دے دیا تھا۔اور جو کوئی بھی یہ سوچتا تو اُس کا دھیان گھر والوں کی جانب تھا۔اب جب اُس کے دیور کے بچے جوان ہو گئے تھے تو اُسے گنیشی کے حصے کی ضرورت تھی۔اُس کے مرنے کی بیٹھک اُس کے نام کی جائیداد اُسے ہی ملنا تھی لیکن نہ جانے اُسے کب پرلوک سدھارنا تھا۔اور اُس کے دیور کی بیٹیاں تو روز بروز تیزی سے جوانی کی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ بیٹے شادی کے لائق ہو چکے تھے۔اور جو لوگ اس طرح سوچتے تو اُنھیں پریتو کے والد کی نظروں میں ہزاروں فریب اور لاکھوں جھوٹ کی نقش گری دکھائی دیتی۔ اس کی حرکت پر اُنہیں شک گزرتا۔اُس کی ہر بات کو اپنی مرضی کے معنی پہناتے اور پریتو کالج میں پڑھنے والی لڑکی پریتو سب کچھ سن رہی تھی۔ٹکّی ٹکّی، پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی۔لیکن اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔وہ پریشانی کی حالت میں صوفے سے دالان اور دالان سے صوفے کی جانب آ جا رہی تھی۔
اور پھر تھانے دار کی آمد ہوئی۔ایک نظر اس نے تائی گنیشی پر ڈالی اور پھر سر ہلانے لگا ''یہ اپنی موت نہیں مری ہے۔یہ تو ان آئی موت مری ہے''۔ وہ بار بار کہتا۔
تائی گنیشی کی آنکھوں کی پتلیاں ایسی تھیں جیسے وہ پھٹ کر باہر آ رہی ہوں۔پلکیں جھکی ہوئی۔چہرہ ایسے جیسے انتہائی حیرت میں ڈوبا ہوا ہو۔ہاتھ ایسے جیسے نا قابل برداشت بے بسی میں جڑے ہوئے ہوں۔دانت بھینچے ہوئے۔ ٹانگیں، بازو اکڑے ہوئے۔تھانے دار حکم صادر کر کے گیا کہ بوڑھی کی تجہیز و تکفین نہ کی جائے۔اس کے بارے میں خبر تو دینا ہی تھی ایک تو گھر کا فرد اس جہان سے چلا گیا دوسرا پولیس پیچھے پڑ گئی تھی۔گھر والے بڑے پریشان تھے۔
لوگوں نے جب تھانیدار کی باتیں سنیں تو ہر جانب، ہر نکڑ میں کھُسر پھُسر میں اضافہ ہونے لگا۔ہر کوئی قیاس آرائیوں سے کام لینے لگا۔''میں نا کہتا تھا؟'' ہر شخص دوسرے کی طرف دیکھ کر کہتا اور پھر جب لوگ گنیشی کے دیور کو ہی الزام دینے لگے تو اُس کے گھر والے زمین کی اور دیکھنے لگے کہ اگر یہ پھٹ جائے تو وہ اس میں سما جائیں۔
تائی گنیشی کی لاڈلی پریتو جب دیکھتی تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر کچھ کر گزرے۔
پھر پولیس کا کوئی افسر آیا۔اُس کے ہمراہ ڈاکٹر بھی تھا۔کافی دیر تک وہ بند کمرے میں تفتیش کرتے رہے۔اندر ہی اندر گھُر گھُر ہوتی رہی۔ڈاکٹر اور پولیس انسپکٹر کی ایک ہی رائے تھی کہ لاش کو تھانے لایا جائے تاکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے معاملے کی تہہ تک جلد پہنچا جا سکے۔جاتے ہوئے پولیس انسپکٹر نے حکم دیا کہ پریتو کے والد کو ہتھ کڑی لگائی جائے اُس کے منہ سے اس بات کا نکلنا تھا کہ گھر میں شور مچ گیا۔یہ کیا اندھیر ہونے والا ہے اس طرح تو باپ دادے کی رکھی رکھائی عزت خاک میں مل جائے گی۔

لیکن اس سے پیشتر کہ سپاہی پریتو کے پتا کو ہتھ کڑی پہناتا۔پریتو اپنے والد کو چند لمحوں کے لیے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔
کمرے کا دروازہ بند کر کے پریتو نے والد سے تمام کہانی کہہ ڈالی۔
''گذشتہ رات ماسٹر صاحب بہت دیر سے آئے تھے۔پڑھاتے ہوئے اُسے مزید دیر ہو گئی۔تائی گنیشی حسب معمول اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔جیسے ہی وہ لیٹی نیند نے اُسے آ لیا۔روز کی طرح کبھی کبھی ہمیں اُس کے خراٹے سنائی دیتے رہے۔بعد ازاں ماسٹر جی کے جانے کا وقت ہو گیا وہ کرسی سے اُٹھے اور حسب دستور میں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تاکہ باہر ڈیوڑھی کی کنڈی لگا آؤں۔پھر نا جانے کیا ہوا مجھے لگا جیسے میں ماسٹر جی کے بازوؤں میں کھنچتی چلی جا رہی ہوں میں اپنے آپ اُس کی چھاتی سے جا لگی۔مجھے اپنے ماسٹر جی بہت اچھے لگتے ہیں۔جونہی میں اس کی چھاتی سے چمٹی تو ہمارے لب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔پھر نا جانے ہم کتنی دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگ کر دیوانوں کی طرح پیار کرتے رہے۔جب ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ سامنے والی چارپائی پر پڑی تائی گنیشی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جب میرے ساتھ ماسٹر جی نے بھی نظر ماری تو ہم گھبرائے ہوئے باہر برآمدے میں آ گئے ہمیں کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ماسٹر سہمے ہوئے جلدی سے وہاں سے چلے گئے۔میں جھجکتی، لڑکھڑاتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آ گئی تاکہ تائی گنیشی کے پاؤں چھو کر اپنے گناہ معاف کروالوں۔لیکن تائی گنیشی تو اسی طرح پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ تائی گنیشی کی پتلیوں میں روشنی نہیں تھی۔میں نے گھبرا کر تائی گنیشی کو بلایا۔تائی۔۔۔تائی کا کوئی جواب نہیں تھا۔پھر میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ٹھنڈا یخ تو تھا اُس کا ہر انگ اکڑا ہوا ہر عضو۔پھر میری چیخ نکل گئی اور تمام گھر جمع ہو گیا۔قصور میرا ہے۔تمام قصور میرا ہے۔
ہکّا بکّا سن رہے پریتو کے پتا نے اپنی بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے خاموش کیا۔اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔تمام عمر پاکیزگی کا دامن تھامے رہی۔اور اسی پر اپنی زندگی قربان کرنے والی تائی گنیشی نے جب پریتو کی یہ کرتوت دیکھی تو یہ کرتوت گولی کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گئی اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ایک بار کھُلیں جیسے اُسے یقین نہ آیا ہو۔پھر ایسی کھُلیں کہ پھر بند نہ ہوئیں۔
پریتو کی مرضی تھی کہ وہ سچی بات سب کے گوش گزار کر دے۔ پولیس کے روبرو سب کچھ قبول کر لے۔
پریتو کے پتا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب سا آ گیا۔ ''نہیں۔۔نہیں'' کنواری بیٹی کی عزت، یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ نہیں۔نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔پریتو کے پتا نے باہر خود کو پولیس کے حوالے کر دیا اور اُسے ہتھ کڑی لگا دی گئی۔

ہائے وہ لوگ

شمشاداحمد

(کراچی)

جب میرے اردگرد کی وحشی، پاگل جانورزندگی میرے اعصاب کونچوڑنے لگتی ہے تو میں غیرارادی طور پرآنکھیں اور ذہن بند کر کے اس سے بھاگ نکلتا ہوں۔

ماضی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔۔۔ ماضی جہاں شیطان کم اور انسان زیادہ پائے جاتے تھے۔

ماسٹر طالع مند میرے استاد تھے۔ وہ قصبے کے ہر پڑھے لکھے فرد کے استاد تھے۔۔۔ کیونکہ قصبے میں صرف ایک ہی اسکول تھا۔

دبلے پتلے، چاک و چوبند۔۔۔ ہر وقت محبت سے لبریز مسکراتی آنکھیں۔۔۔ صبح صبح اُن کا چہرہ نظر آجائے تو ایک اچھے دن کے امکانات روشن ہوجاتے تھے۔

مجھے میٹرک کے بعد اپنا آبائی کاروبار سنبھالنا پڑا کیونکہ والد صاحب کچھ ڈھل مل رہنے لگے تھے۔

صبح اُٹھ کر اپنی اسٹورنما دوکان کی جھاڑ پونچھ کرتا۔۔۔ سڑک اور فٹ پاتھ کے درمیان کچی زمین پر چھڑکاؤ کرنے کے بعد جو سامان باہر سجانا ہوتا، وہ سجاتا اور۔۔۔ اور پھر ماسٹر صاحب کا انتظار کرنے لگتا۔

ٹھیک ساڑے سات بجے ماسٹر صاحب ہاتھ میں چھڑی لئے خراماں خراماں گلی کا موڑ مڑ کر بازار میں آجاتے۔۔۔ اسکول آٹھ بجے لگتا تھا۔

میں باہر کھڑا سراپا انتظار ہوتا تھا۔

میں آگے بڑھ کر جھک کر اُن سے ہاتھ ملاتا۔۔۔ وہ کھینچ کر مجھے گلے لگا لیتے۔ اُن کی آنکھوں میں محبت کے زمزمے پھوٹ رہے ہوتے تھے۔

وہ والد صاحب کی خیریت دریافت فرماتے۔ پھر کاروبار کا پوچھتے اوردعائیں نچھاور کرتے آگے بڑھ جاتے۔

اسکول سے واپسی پر کبھی کبھی اسٹور کے اندر آجاتے تھے۔ میں انہیں صراحی سے پانی کا گلاس پلاتا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنی راہ لیتے۔

ایک دن وہ اسکول سے لوٹے تو بغیر سلام دعا چپ چاپ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئے۔

میں گاہک نپٹا کر اُن کی طرف متوجہ ہوا۔

وہاں ماسٹر طالع مند نہ تھے۔ ایک دُکھ سے مَسلا اجنبی بیٹھا تھا۔

اُنہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ لیکن یہ ہاتھ بھی اُن کا نہ تھا۔

''ماسٹر صاحب۔۔۔ ماسٹر صاحب'' میں آگے کچھ نہ کہہ پارہا تھا۔

اور کچھ نہ سوجھا تو لپک کر باہر سے ایک ٹھنڈا لے آیا۔

ماسٹر صاحب نے مجھے بوتل لئے اپنے سامنے جھکا پایا تو کچھ ہوش میں آگئے۔

مجھ سے بوتل لے لی اور مجھے بیٹھے جانے کا اشارہ کیا۔

انہوں نے ایک گھونٹ لیا۔۔۔ پھر دوسرا۔۔۔

اُن کی آنکھوں میں روتی مایوسی کے آنسو تھمنے لگے۔

اُنہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''اگر تم نہ ہوتے۔۔۔ تو میں اپنی جان لے لیتا''

میرا منہ کھلا تھا۔۔۔ اور منتظر تھا کہ وہ کچھ اور کھُلیں۔

وہ بوتل میں سے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے رہے۔

بوتل ختم ہوگئی۔

''میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگیا تھا۔ مجھے ہر بری شے کی توقع رکھنی چاہیے۔ اب آئیڈلزم (IDEALISM) کا دور نہیں رہا''۔

میری جان میں جان آئی۔ میں نے ہمت کی۔

''ماسٹر صاحب۔۔۔ کچھ تو بتائیں۔۔۔ آخر۔۔۔''

اُنہوں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''معمولی بات تھی۔۔۔ مجھے دل پر نہیں لینا چاہیے تھا''

میرا تجسس مجھے کوڑے مار رہا تھا۔

''سر کہہ ڈالیے دل ہلکا ہوجائیگا''

وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔

''تم تو جانتے ہی ہو۔۔ میں نے کبھی کسی طالب علم کو سرزنش تک نہیں کی۔۔۔ ہمیشہ پیار اور محبت سے کام لیتا ہوں۔ کبھی کسی نے مجھ سے بدتمیزی نہیں کی''

اُن کے چہرے کی رگیں پھر تننے لگیں۔ وہ خاموش ہوگئے۔

میں پاگل ہوگیا۔

''کون ہے وہ بدبخت؟؟''

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے کندھے پر تھپکی دی۔

''بھول جاؤ سب کچھ میں نے اُسے معاف کردیا ہے''

ماسٹر صاحب تو چلے گئے۔ لیکن میں کھول رہا تھا۔

میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو آواز دی۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس واقعے کے متعلق سب کچھ جانتا ہوگا۔

وہ شاید کھانا کھا رہا تھا۔۔۔ نوالہ چباتا، منہ صاف کرتا لپکا چلا آیا۔

''یہ بتاؤ ماسٹر طالع محمد صاحب سے کس نے بدتمیزی کی ہے؟''
وہ نوالہ اتار چکا تھا۔
''وہ ہے نا۔۔۔ابرے بدمعاش کا بیٹا۔۔۔جھیلا۔۔۔۔''
میرا غصہ ایک جھٹکے سے زرد پڑ گیا۔
''کیا کہا ہے اُس نے ماسٹر صاحب کو؟''
میری آواز لرز رہی تھی۔
''اس نے ہوم ورک نہیں کیا تھا وہ اکثر ایسا کرتا ہے۔ماسٹر صاحب نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ایک دم سے اُبل پڑا۔جانتے نہیں ہو میں کون ہوں؟ اِبرے ملک کا بیٹا۔۔ایک بار اپنے باپ سے کہونگا تو چورا ہے پر ننگا کردے گا''۔
جوانی کسی احتیاط خوف کو نہیں مانتی۔
''اس کا باپ بدمعاش ہے تو گھر ہوگا۔۔۔ہم نے فیصلہ کیا کہ کل چھٹی کے بعد اس کی وہ دُھنائی کریں گے کہ باپ بیٹا ہمیشہ یاد رکھیں گے؟''
میں نے اُسے سختی سے منع کیا۔
''تم لوگ کچھ نہیں کروگے۔۔۔تم جانتے ہو اِبرہ کیا ہے! جاؤ کھانا کھاؤ۔۔۔کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔۔۔میں خود اِبرے سے بات کرونگا''
میں ڈھل مِل دوکانداری کرتا رہا۔۔۔میری بزدلی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔
شام آہستہ آہستہ اُترنے لگی۔میں فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔
ابا جان لاٹھی ٹیکتے آ گئے۔
''جا بیٹا۔۔۔آرام کرنے۔۔۔''
والد صاحب اکثر میرا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔
میں چپ چاپ کرسی سے اُٹھا۔۔۔اندر گھر میں جانے کی بجائے باہر سڑک پر نکل آیا۔اور میرے قدم خود بخود ابرے کے ڈیرے کی طرف اُٹھنے لگے۔خوف کے باوجود میں اپنے ہاتھ پاؤں تڑوانے کو تیار تھا۔
میں نے مضبوط بند لوہے کی گیٹ پر دستک دی۔اور انتظار کرنے لگا۔
عین میری آنکھوں کے سامنے لوہے کی ایک چھوٹی سی تختی نیچے سرک گئی اس چوکور سوراخ میں سے ایک خوفناک سرخ آنکھ مجھے گھورنے لگی۔
آنکھ غائب ہوگئی۔
تھوڑی دیر بعد چھوٹا دروازہ کھل گیا۔
وسیع وعریض کمرے میں ایک نواڑی پلنگ بچھا تھا۔دیواروں کے ساتھ لوہے کی پرانی کرسیاں بے ترتیبی سے بکھری تھیں۔
پلنگ پر اِبرہ پھیلا ہوا تھا۔
اس کی آواز کرخت اور بے رحم تھی۔
''چھوٹے چوہدری تمہیں اچانک ہم کیسے یاد آ گئے؟''
اس نے اپنے پہلو میں پڑی بید کی لچکدار چھڑی اٹھائی اور پوری قوت سے میرے اور اس کے درمیان والے خلا میں برسائی۔بید کی چھڑی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔
'میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں' میں خود اپنی آواز پہچان نہ پا رہا تھا'
وہ حیران مجھے گھورے جا رہا تھا۔
کمرے میں دو لمبے تڑنگے مسٹنڈے پولیس والے بیٹھے تھے۔
اِبرے نے انہیں حکم دیا۔
''جاؤ۔۔۔اور ایک گھنٹے میں مجھے اطلاع دو۔۔کام ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔''
دونوں سر جھکائے باہر نکل گئے۔اِبرہ میری طرف متوجہ ہوا۔
''تم پہلی بار میرے ڈیرے پر آئے ہو۔۔۔مانگو کیا مانگتے ہو؟ میں جانتا ہوں تم آجکل چینی کی شارٹیج کا فائدہ اُٹھا کر بلیک کر رہے ہو''
میری آنکھیں تو جھکی تھیں ہی،سر بھی جھک گیا۔
اُسے مجھ پر رحم آ گیا۔
''بیٹھ جاؤ'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
میں جذبات کی لہر پر اچھلتا ہو کودتا اِبرے کے ڈیرے پر آ تو گیا تھا لیکن اس کی دہشت مجھے بولنے نہ دے رہی تھی۔
اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔
''بولو۔۔۔بولو۔۔۔کبھی نہ کبھی شریفوں کو بھی بدمعاشوں سے کام پڑ جاتا ہے''
''وہ ماسٹر صاحب ہیں نا۔۔۔طالع محمد۔۔۔''
میری آواز کو خوف نے دبوچ لیا۔
ابرہ چیتے کی طرح اچھلا اور مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔
''کیا ہوا؟ ماسٹر صاحب کو کیا ہوا؟''
میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔
''تمہارا بیٹا۔۔۔جھیلا۔۔۔اُس نے ماسٹر صاحب کو دھمکی دی ہے کہ وہ تمہارے بدمعاشوں سے کہہ کر،اُنہیں چورا ہے میں ننگا کردے گا۔''
اِبرے کو چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا۔اس کے جسم کا ہر عضو پتھر ہو گیا۔پھر وہ ایک غیر انسانی آواز میں دھاڑا۔
''جھیلے۔۔۔خزیر کے بچے۔۔۔ادھر مر۔۔''
ابرہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔اس کے بید کی ضربوں سے ہوا سسک رہی تھی۔
جھیلا اندر داخل ہوا تو بید اسی پر ٹوٹ پڑا۔
جھیلا رو رہا تھا،کراہ رہا تھا۔۔۔لیکن ابرہ پاگل ہو گیا تھا۔
میں نے بیچ میں آ کر جھیلے کو بچانے کی کوشش کی۔اور اس کوشش میں،میں بھی بید کا راتب بن گیا۔
میں نے جھیلے کو دھکا دیکر اندر والے دروازے کے قریب کیا اور

باقی صفحہ ۸۶ پر ملاحظہ فرمائیں

''زرددائرہ''

محمد طارق علی

(راولپنڈی)

موت ایک ایسا سوال ہے جو ہرفرد کے دل ودماغ پر چھایا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسے رقیب کا نام ہے جو ہمیں ہروقت گھیرے میں لئے رہتا ہے۔ اس کا قرب ہمیں بہت کھلتا ہے۔ہم اس کے خیال سے،اس کے خونی پنجوں کی پہنچ سے ہرممکن طور پر بچنا چاہتے ہیں لیکن آنکھ بچا کر ہم ادھراُدھر ہوبھی جائیں، تب بھی یہ وحشت خیز خیال، یہ خوف ناک اور اٹل حقیقت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی، سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگی رہتی ہے۔ جب کبھی ہم کوئی نیا کام کرنے لگیں یا دوستوں کی محفل میں بیٹھ کرتاش کھیلیں،ان کے ہراچھے برے لطیفے پر دل کھول کر قہقہے لگائیں، کہیں پک نِک پر چلے جائیں یاٹی وی پر کوئی مزاحیہ ڈرامہ یافلم دیکھ رہے ہوں، کسی عزیز یادوست کے ہاں شادی کی محفل سجی ہو، ہم بھی وہاں موجود ہوں اور زندگی کی رونقیں دیکھ دیکھ کرخوش ہورہے ہوں تو اسی سمے یوں ہی، بس اچانک کوئی ہمارے ذہن کوآدبوچتا ہےاور کہتا ہے:

''ہنس لو جتنا ہنسنا ہے، پر یادرکھو،تم میری گرفت سے باہر نہیں ہو''

یہ خیال ہوتا ہے، اُسی خوف ناک سی ہستی کا جو ہماری ازلی رقیب ہے جو ہمیں خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔ہمیں ہنستے دیکھ کرایک طنزیہ سی ہنسی ہنستی ہے اوراُسکی ایک اَن کہی آواز ہماری سوچ سے آٹکراتی ہے:

''تم کب تک یوں ہی ہنستے پھروگے، یہ میرے خونی ہاتھ تمہارے گلے سے بہت زیادہ دُور نہیں ہیں بس ادھراُس مالک کا حکم ہوااور میں نے تمہارا ٹینٹوا دبا کر چند سیکنڈ میں تمہیں اس دنیائے آب وگل سے باہر کیا''

یہ آواز ہمیں اس طرح آتی ہے جیسے کوئی اچانک ہمارے کان میں سرگوشی کر کے کہیں چھپ گیا ہو۔ہم اِدھراُدھر دیکھتے ہیں مگرکوئی نظر نہیں آتا۔ہم اس معکوس خیالی پیکراوراسکی سرگوشی کوذہن سے جھٹک دیتے ہیں اور دوبارہ دنیا اوراس کی دل چسپیوں میں گم ہوجاتے ہیں یہ سوچتے ہوئے کہ یہ تو کوئی یوں ہی فضول ساواہمہ تھا۔

سرد رات کے اندھیروں میں جب کوئی دوسرا ہاتھ نہیں ہوتا، ہم نیند کی ناراض دیوی کومنانے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں تو ایسے میں بس یوں ہی ایک عجیب سی سرسراہٹ ہمیں آن گھیرتی ہے، کوئی اَن دیکھا وجود، پُراسرار انداز میں ہمارے آس پاس منڈلانے لگتا ہے، اگر اُس کی طرف ہم زیادہ دھیان کریں تو ہمارا حلق خشک اوراس کا ہالہ ہمارے اردگرد تنگ ہونے لگتا ہے۔ پھر جیسے کوئی خواب ناک انداز میں سرگوشی کرنے لگتا ہے:

''مت بھولو کہ تم ہروقت ایک زرد دائرے میں قید رہتے ہو، لاکھ زور لگا لو، اس سے باہر نکلنا تمہارا مقدر نہیں ہے۔تم جہاں کہیں بھی جاؤ، میں تمہارے ساتھ ہوتا ہوں، تمہاری نگرانی کرتا ہوں اوراس دائرے سے باہر جانے نہیں دیتا۔ یہ بھی جان رکھو کہ ایک راہ داری کا پروانہ جوتمہارے نام کا ہوتا ہے، ہروقت میرے پاس ہوتا ہے۔ یہ زندگی ایک سفر ہے اور وہ ایک آخری اسٹیشن جہاں سے تمہیں اگلی منزلوں کا سفراختیار کرنا ہوتا ہے،ایک لمبا اور یک طرفہ سفر،تمہیں اس جگہ یا اسٹیشن کا نام معلوم نہیں،مگراس الوہی حکم کے ساتھ ہی مجھے پتہ چل جاتا ہےاور پھرتمہیں ملکِ عدم کی طرف روانہ کردیتا ہوں کیاتم وہ پروانۂ راہ داری، وہ یک طرفہ ٹکٹ دیکھنا چاہو گے؟''

یہ بڑا ہی خوف ناک سا سوال ہوتا ہے یوں لگتا ہے کہ بہت سفّاک سی نظروں نے ہمیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ موت کے کئی مناظر خود بخود آنکھوں میں آسماتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے وہ چہرے سامنے آجاتے ہیں جو ہمارے اپنے عزیزوں کے، ہماری بہت ہی پیاری ہستیوں کے تھے۔ یہ چہرے سامنے آتے ہیں جدائیوں کے خوف ناک لمحات خود بخود یاد آنے لگتے ہیں، وہ فوت شدہ عزیز کفن میں لپٹے چپ چاپ، بے بس حالت میں لیٹے ہوتے ہیں۔ ان غم ناک لمحات میں ایک بہت ہی مکروہ سی خوش بو یعنی سلگتے ہوئے لوبان کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی ماحول کو اور مکدّر بنا رہی ہوتی ہے۔ یہ اصل میں موت کی گھناؤنی سی بُو ہوتی ہے، سخت ناگوار، ہر جگہ ہمارا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک کہ جب لوگ کفن پوش مردے کواٹھا کراسے شہرِ خموشاں کی جانب لے کر چلتے ہیں، یہ موت کی خوشبو ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے، ہمیں بار بار یاددہانی کراتی ہوئی کہ وہ بے شمار پرفیومز، سینٹ اور دیگر خوشبوئیں جوتم بڑے شوق سے خود پر سپرے کر کے سجے بنے پھرتے تھے، اب اس خوشبو کا بھی مزہ لے کر دیکھو، ہم اِدھراُدھر منھ پھیر کراس ناگوار بُو سے کترانے اور بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہاں یاد آیا، بات ہو رہی تھی اُس خوف ناک سی، اَن دیکھی ہستی کے خوف ناک سوال کی، وہی پروانۂ راہ داری والا، ہم اُسے فوراً جھٹک دیتے ہیں اور رات کی میٹھی نیند کا خیال دل سے نکال کر کوئی کتاب یا اخبار کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگراس وقت یہ اشیا میسّر نہ ہوں تو پھر ٹی وی آن کردیتے ہیں اوراسی کے ساتھ ہمیں ایک بھیانک قہقہے کی گونج سنائی دیتی ہے مگر ہم اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں اور وہ بیکار واہمہ ہمارے تصور سے نکل کر خود بخود کہیں معدوم ہو جاتا ہے لیکن قہقہہ لگا کر جاتے جاتے وہ آواز یہ کہتی ہے:

''تم کچھ بھی کرلو، ہم ہرسمت سے تمہیں دیکھ رہے ہیں، اب نہ سہی، پھر کبھی نہ کبھی ہم تمہیں اسی دائرے کے اندر آ پکڑیں گے، پھر تم کچھ بھی نہ کر پاؤ گے، تمہارا وجود ایک سرد مجسمے کی صورت اختیار کر لے گا، کوئی تمہیں ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں

کرے گا، موت کی خوشبو ہر طرف سے تمہیں گھیر لے گی اور اسی کے ساتھ تمہارا آخری سفر شروع ہو جائے گا، ایک اَن دیکھی منزل کی جانب''۔

پھر اُسی وقت دل میں گھسا ایک بے نام اندوہ، ایک بے پہچان غم کا کانٹے دار بوٹا یک بڑا ہو کر لہلہانے لگتا ہے اور کان میں کوئی چپکے چپکے کہتا ہے:

''تم اس بوٹے سے پیار کرو، اس میں حقیقت کے پھل لگتے ہیں، یہی پھل تمہیں کھانے ہیں''

جب زرد موسموں میں درختوں سے پتّے جھڑتے ہیں، ہوا انہیں اُڑا کر کہیں دُور لے جاتی ہے اور سرما کی ایک بے مہر سرد سی شام جب ہمیں چپکے سے آ کر چھوتی ہے تو دل جانے کیوں کانپ اٹھتا ہے۔ اسی شام کے جَلو میں گہری سیاہ رات، ہماری ذات کے رِدا پر، ہمارا نام پوچھے بغیر، ایک دبیز اجنبیت کی دُھند میں ہم سے آ کر لپٹ جاتی ہے۔ ہمارے اردگرد یاس کے دیئے جل اٹھتے ہیں اور میرے دل میں ایک گہرا زرد خلا کہیں اندر ہی اندر اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ یہ غم میرا نہیں، پھر بھی بن پوچھے مجھ سے آ کر چپک جاتا ہے، میرے ساتھ رہنے لگتا ہے میری سانسوں میں اپنی سانسیں ملا کر، میرے کسی بہت قریبی عزیز کی طرح۔ مجھے اس کا یہ بے طلب ساتھ اچھا نہیں لگتا۔ میں اس سے بالآخر پوچھتا ہوں:

''تم کون ہو؟''

وہ کہتا ہے: ''میں تمہارا ہم زاد ہوں، تم جانو یا نہ جانو، میں پہلے بھی تمہارے ساتھ تھا اور اب بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گا، ایک سائے کی طرح، ایک اَن دیکھے عکس کی طرح، تمہارے سرشت کا پَرتو بن کر۔ میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں اس زرد دائرے کی پہچان کراتا رہوں گا جو ہمہ وقت تمہیں حالتِ قید میں رکھتا ہے، اس دائرے کو تم ہمیشہ بھولے رہے مگر اب وقت آ گیا ہے تم اسکی حقیقت کو جان لو۔''

میں گھر میں کسی سے اس ہم زاد کا ذکر نہیں کرتا مگر دل کا خلا بڑھتا جاتا ہے، ہم زاد میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس کے پاس موت کے سندیس کے سوا اور کچھ نہیں اور مجھے اُس کی کوئی پروا بھی نہیں۔

ایک روز میری ایک قلم کار دوست فاخرہ اکبر فون پر بات کرتے ہوئے مجھ سے کہتی ہے:

''میری زندگی کچھ عجیب سی ہو گئی ہے۔ دل کسی خوشی کو اپنانے سے گریزاں رہنے لگا ہے، کوئی چمک دار لمحے اِسکو آ کر نہیں چھوتے اور اگر کہیں غلطی سے ایسا ہو بھی جائے تو یہ اُن لمحوں سے بے رخی برتتا ہے، بہت گہری اجنبیت دکھاتا ہے۔ لگتا ہے یہ دل میرا نہیں، پرایا ہے۔ ایسے اہم اور خوشی آمیز موقعوں پر ایک اجنبی آواز مجھے کہتی ہے ''بہتر ہوگا کہ تم خوشی کے ان لمحوں سے بچ کر رہو، تمہارا ان سے کیا کام؟ تمہاری عمر ساٹھ سے اوپر ہو چکی، اب تمہیں ایک دن مر جانا ہے۔''

فاخرہ بات جاری رکھتی ہے:

''جب کبھی مجھے شادی بیاہ یا خوشی کی کسی تقریب میں کہیں جانا ہو، میں تیار ہو جاتی ہوں، گاڑی میں اور سب گھر والے بیٹھ جاتے ہیں اور مجھے ساتھ آنے کیلئے آواز دیتے ہیں، تو اُسی وقت وہی آواز مجھے روک کر کہتی ہے ''تم کیوں جا رہی ہو، ایسی محفلوں میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں، تمہارے تو مرنے کی دن قریب آ چکے''

میری لکھاری دوست مجھ سے مزید کہتی ہے:

''کبھی کوئی اچھی ڈش کھانے کا میرا دل چاہے یا کوئی نئے چلن کا، نئے ڈیزائن کا کپڑا دیکھ کر میرا من للچائے تو وہی بے نام آواز میرا دامن تھام لیتی ہے اور کہتی ہے، یہ ذائقے دار کھانے، یہ چمچماتے ہوئے نئے لباس اب تمہارے لئے نہیں ہیں، تمہیں تو ایک دن اس دنیا کو خیرباد کہہ دینا ہے''

پھر وہ ''قلم کارہ'' مجھ سے پوچھتی ہے:

''طارق بتاؤ، ایسا کیوں ہے؟ ایک گہری یاسیت، ایک بے نام سی لاتعلقی کا روّیہ مجھے کیوں ہمہ وقت گھیرے میں لئے رکھتا ہے، کیا یہ میرے ہی ساتھ ہے یا تم بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہو؟''

''ہاں اکثر میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں، کوئی اندرونی آواز مجھے بھی مسلسل روکتی ہے، ہر نئی اور اچھی چیز سے، خوشی کی کسی محفل میں جانے سے، یہاں تک کہ کوئی اچھا گانا سننے سے اجتناب برتنے کا کہتی ہے۔ لیکن میں اِس بے نام آواز کو، اس اَن چاہے خیال کو جھٹک دیتا ہوں اور فوراً ہی ایک مشہور مصرعہ میرے لبوں پر آ جاتا ہے ''موت کا ایک دن معیّن ہے'' اس مصرعے کو سوچتے ہی میں وہی کچھ کرتا ہوں جو میں چاہتا ہوں''

''تم ٹھیک کرتے ہو لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی، میں خود کو ایک زرد دائرے میں مقیّد پاتی ہوں اور ایک بے نام سے خوف میں گھر جاتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ دائرہ موت کا ہالہ ہے کیوں کہ اس پر زردی چھائی ہوتی ہے جو اسے بہت خوف ناک بناتی ہے۔ چنانچہ میں بے بس ہو کر اس آواز کا کہا مان لیتی ہوں'' فاخرہ اکبر کا جواب۔

''میں ایسا نہیں کرتا، پہلے میں نے اس معاملے پر خوب سوچا ہے اور پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ آواز میرے ہم زاد کی آواز ہوتی ہے۔ اور رہا زرد دائرہ، یہ موت کے وجود کی، اُسکی ذات کی پہچان کی علامت ہے۔''

''اس کا مطلب ہے میرا ہم زاد بھی بہت نمایاں ہو کر میرے ساتھ ہے، میرے روزمرّہ کے معاملات میں ٹانگ اڑاتا رہتا ہے''

''ہاں ممکن ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم زاد کی بجائے موت کی اہمیت کہیں زیادہ ہے تو جب قانونِ فطرت کے تحت اس کا وقت مقرر ہے تو پھر اس سے کیا ڈرنا؟ میں نے اس کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے اب میں اسے اپنا دوست سمجھتا ہوں، اسی کے ساتھ میرا ہمیشگی کا ساتھ جڑا ہوا ہے''

''لیکن موت سے دوستی کا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ موت سے مفر ممکن نہیں ہے، یہ ناگزیر ہے، سو میں نے اس سے ڈرنا چھوڑ دیا، اب یہ میری ہم زاد ہے، میری ہم دم اور دم ساز بھی،

باقی صفحہ۸۶ پر ملاحظہ فرمائیں

ہمزاد

شاہد جمیل (گوجرانوالہ)

ٹھک، ٹھک، ٹھک! کون ہے بھئی؟ میں ہُوں! میں کون؟ میں اِبنِ فلاں! اِبنِ فلاں کون؟ اِبنِ فلاا ں! اِبنِ فلاں کون؟ حد ہو گئی بھئی! یہ کنڈیا لے چوہے جیسے بالوں والا بابا میری جان کو آ گیا ہے۔ یہ حیات کا مُنکر نکیر ممات سے پہلے ہی پُوچھ کر رہے گا کہ آخر میں کون ہوں۔ اگر چہ یہ دروازہ بھی میرے لئے نا مانوس نہیں بلکہ میرے اپنے جسم کا دروازہ ہے اور یہ بابا بھی کوئی غیر نہیں بلکہ میرا اپنا جسم ہی ہے مگر مجھے اس مورکھ کی لاٹھی کو ایک طرف کھسکانے کے لئے بتانا پڑیگا کہ میں کون ہوں ورنہ وہ مجھے اندر داخل نہیں ہونے دے گا اور میں ناکامیاب جادوگر کے نوخیز بچے کی طرح مرا پڑا رہ جاؤں گا۔ یہ بابا دراصل میرے لئے دربان ہونے کے ساتھ زندگی کی اس اجنبی اذیت کا استعارہ ہے جو کسی بیگانے در پر دستک سے در آتی ہے۔

تو دیکھ اے زندگی میں تیرا ایلن پو بالٹی مور کی گلیوں سے چُنی اپنی ہڈیوں، مانگے تانگے ملگجے کوٹ اور دریدہ پتلون کو سانسوں کی ڈور سے باندھتے ہوئے ویرانے کی طرف جا رہا ہوں جہاں میری بلیاں اور کُتے کچرے سے نکالے ہوئے کھانے کا انتظا کر رہے ہیں۔ ابھی کچھ ہی دیر میں مَیں لمبی لمبی پیلی گھاس سے لپٹ کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گا۔ مگر یہ کیا کہ میری مطلق اندھیروں سے آشنا ہوتی ہوئی آنکھوں کے سامنے کسی نے دُنیا کی مختصر تریں ڈراؤنی کہانی کا سکرپٹ لہرا دیا۔ "زمین پر آخری آدمی اپنے کمرے میں تنہا تھا۔" درست ہے بھئی! آج کے انسان کے لئے یہ کہانی ہارر تھننگ کا باعث ہو سکتی ہے کہ وہ لاکھوں سال بعد بھی خیر و شر کے فلسفیانہ یا مذہبی نُقطہء نظر میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ روایت پرستی (Stoicism) نے خیر و شر کے وجود سے انکار کر کے انسان کے دیرینہ مسئلے کو حل کرنے کی کوشش تو کی مگر پھر صلیب و ہلال نے میرے بھائی ولیم جیمز کی وہ دُرگت بنائی کہ خُدا اپناہ! مر گیا بیچارا اپنی ہی آگ میں جل جل کر۔

جرمن سپاہیوں کی طرح جرمن فلاسفر بھی بڑا تیز نکلا! کیا مطلب؟ کونسا فلاسفر! ایک منٹ! کہیں کوئی نازی سپاہی میری جان لینے تو نہیں آ رہا! کیا بات کرتا ہے گھامڑ! یہ امریکہ ہے امریکہ! اچھا! ہاں! یہ سُسرے ولہلم لیبنز کی بات کر رہا ہوں۔ اپنے اچھے خاصے دماغ کو چلنے سے روک دیا اس نے۔ چڑھا دیا اپنی فکر کو عام زندگی کی بھینٹ۔ لے بیٹھا میرے اقبال کو بھی، کھپا دیا ماحول کے پیچ، بٹھا دیا اُسے بھی پوتر مسند پر، بنا دیا اُس کو بھی سٹیچو۔ فکر کو لاٹھی سے مارتا ہُوا لایا اور اور زبردستی تسلیم کروایا اس سے خُدا کے وجود کو۔ پھر وہی جرمنوں والی چالاکی کہ خُدا کے وجود کو تسلیم تو کیا مگر اُسکی قُدرت کو منطقی طور پر مُمکن کاموں تک محدود رکھا اور اس طرح ہماری دُنیا میں شر کی موجُودگی کو لازم قرار دے کر سُرخرو ہُوا۔ آہاہا! خُدا کو ڈھونڈنے نکلا تھا شیطان کی تلاش پر منتج ہُوا! آہاہا!

میرے نزدیک مذکُورہ بالا مختصر ترین کہانی ڈراؤنی نہیں بلکہ فکری اور نظریاتی ہے۔ اِس کی تہ تک جانے کیلئے ہمیں اپنی سوچ کے بنے بنائے سانچوں کو توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینکنا ہے۔ دُشوار ہے مگر چند لمحے ملن، دو گھڑی گُفتگُو کے نشاط انگیز تصور میں یہ بھی کر دیکھو۔ فلسفہ و فکر کی مُوشگافیوں کو دِل و دماغ میں جگہ دینی ہو تو روایت کے مُردوں کو پاؤں تلے روندھتے گزرنا پڑتا ہے۔ یُوں بھی ہمارے روایتی ذہنی سانچوں کی حیثیت بھٹہ خشت پر اینٹیں تھپنے سے مماثل ہے۔ ایک جیسی رٹی رٹائی، تھپی تھپائی لال بھُوری اینٹیں۔ سر پھوڑنے کو دل کرتا ہے اِن اینٹوں سے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ مختصر ترین کہانی ہماری اس ظاہری دُنیا سے مُتعلق نہیں ہے بلکہ ہمزاد سے جُدائی اور تنہائی کا بیان ہے تو کیسا ہے۔ ایک منٹ یار! سانسیں کھینچ کھینچ کر میری پسلیوں کی رگیں چڑھ گئی ہیں۔ چند لمحے پیلی گھاس کے گداز سے لپٹ کر انہیں موزوں کر لُوں۔

ہاں تو میں ہمزاد کی بات کر رہا تھا۔ آہ! ہمزاد کی بات سے پہلے ہمزاد کا نوحہ! اُن لوگوں کا نوحہ جو فکری لحاظ سے ازل کے تنہا ہیں، جن کے محرم راز گورِیں جا سوئے ہیں، جن کی بات سُننے اور سمجھنے والا کوئی نہیں۔ بُہت پہلے کی بات ہے! بُہت پہلے کی نہیں بلکہ بہت بہت پہلے کی بات ہے۔ ساڑھے چار ارب سال یا پھر شاید پونے چودہ ارب سال سے بھی پہلے کی بات جب میں اور میرا ہمزاد کسی نامعلوم کہکشاں کے کسی بے نام سیارے پر یک جان کی طرح رہتے تھے۔ صدیوں کے ارتقائی سفر کے باعث ہماری حیات تصوراتی جنت کے موافق ہو گئی تھی۔ شر کی قوتوں کو ارواحِ مقررہ کے ذریعے کسی اور کہکشاں کے کسی اور سیارے کے پاتال میں قید کیا جا چُکا تھا۔ ہم لوگ اپنے ذہن کے ارتکاز سے اپنے ماحول میں موجود مقناطیسی میدان کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنے اردگرد کی چیزوں کو فقط تصور کرنے پر حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اپنے ماحول میں موجود الیکٹرک پاور کو استعمال میں لا کر لاکھوں میل تک پیغام رسانی، گُفتگُو، عوامل اور اسراع پر قادر تھے۔ اگر چہ سب لوگ روحانی طور پر ایک جیسی طاقت کے متحمل نہ تھے تاہم ارتقائی عروج کے ثمرات سبھی لوگوں کو بڑی حد تک بہم تھے۔ ایک جرمن کہاوت "جِس چیز کو آنکھ نہیں دیکھتی، اس کے لئے دل افسردہ نہیں ہوتا" کے مصداق ہماری دُنیا میں ان دیکھے خُدا کا تصور موجود نہیں تھا۔

اگر چہ بدروح TOIA اور شیطان OKEE جیسی مخلوقات کو پاتال بدر کر دیا گیا تھا مگر روحانی طاقت کے حصول اور استعمال سے متعلق ایک مقابلے اور مباہلے کی فضاء ہم لوگوں میں موجود تھی۔ نظریہء اضافیت کے مطابق ہم لوگ اپنے اجسام یعنی مادے کی کیفیت سے نکل کر لائٹ یعنی نور کی کیفیت میں رہ رہے تھے۔ تمام روحیں اُس وقت تک آزاد تھیں اور اپنی قوت کے مطابق مسحور اور شاداں بھی ہر روح کا اپنا دائرہ عمل اور الیکٹرک اور مقناطیسی فیلڈ مختلف تھی اسی طرح

لاکھوں سال گزر گئے اب ایک دو قرنوں سے ایک واضح تبدیلی ہمارے جہاں میں دیکھی اور محسوس کی جارہی تھی کبھی کبھی ایسا ہونے لگا کہ ہم روحوں کے مقناطیسی اور الیکٹرک فیلڈ ہماری مرضی کے مطابق کام کرنے سے قاصر رہتے کبھی کبھی تو اتنے زبردست جھٹکے لگتے کہ یوں محسوس ہوتا جیسے ہماری حالت (State) تبدیل کی جا رہی ہو اور یوں لگتا جیسے کچھ ہی دیر میں پھر ہم لوگ نور سے مادے کی کیفیت میں چلے جائیں گے مگر پھر کچھ وقت کے بعد ہماری پوزیشن درست ہو جاتی۔

پھر یوں ہوا کہ شاں کی تیز آواز آتی اور ہماری کروڑوں اربوں روحوں میں سے کچھ روحیں غائب ہو جاتیں۔ پہلے تو ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ نور یا روح کی حالت میں آنے کے بعد ہم ہر قسم کے کنٹرول سے مبّرا ہو جائیں گے مگر اب ہمیں ایک سُپر نور کی موجودگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وقتاً فوقتاً ہماری طاقت کے فیلڈ میں خلل آنے لگا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ اپنے تیئں ہم لوگ اسے اپنی توجہ کے ارتکاز کی کمزوری یا خلل ہی قرار دیتے تھے پھر ہم نے دیکھا کہ ہمارا اک ہمزاد نہ تو فیلڈ ٹوٹنے کا شکار تھا اور نہ جھٹکوں سے پریشان۔

ہم میں سے کئی روحوں نے اس سے اپنی کیفیت کا اظہار کیا مگر وہ کچھ نہ بتاتا بلکہ صرف مسکراتا تھا۔ اب تو وہ ہمیں کبھی کبھی عجیب و غریب تماشے بھی دکھایا کرتا ہم لوگوں کو اتنے زور سے گھماتا کہ ہم لوگ مادے کی کیفت میں چلے جاتے پھر ہمیں اتنے زور سے دوڑاتا کہ ہم لوگ شاں کر کے واپس اپنی نوری حالت میں آجاتے۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ ہم سب روحوں کے مقناطیسی میدان اور الیکٹرک فیلڈ بے اثر ہو گئے۔ ہم لوگ بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ہم لوگوں میں سے کچھ کی ریز روانرجی ختم ہونے لگی۔ اس موقع پر پھر ہمیں انرجی ٹرانسمشن کا احساس ہوا۔ نینو سیکنڈ سے بھی کئی ہزار درجہ کم وقت میں ہم لوگوں کو روشن یعنی زندہ رہنے کے لئے مائکروویو طاقت حاصل ہونے لگی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہماری ہی دنیا کی کوئی سُپر طاقت ہمیں زندہ رکھے ہوئے تھی۔ لازمی طور پر یہ طاقت وہی ہو سکتی تھی جس نے ہماری تمام طاقت ختم کر دی تھی یا پھر اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

لاکھوں سال اسی طرح گزر گئے اور ایک دن سُپر روح کا ظہور عمل میں آیا۔ یہ روح دراصل میرے ہمزاد ہی کی روح تھی مگر اب یہ بہت ہی پیچیدہ برقی راستوں اور مقناطیسی میدانوں سے مزین اور محفوظ ہو چکی تھی اُس کی موجودہ قوت اور قدرت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ ہم ایسی اربوں کھربوں روحوں کی تمام قوت اُس کے اختیار اور استعمال میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اپنے ظہور کے بعد ہم زاد نے تمام روحوں کو مخصوص مقام پر محفوظ کر دیا اور اپنی مرضی سے ان کو انرجی ٹرانسمٹ کرنے لگا۔

مادے سے نور میں تبدیلی کے وقت ہم نے ساڑھے چونتیس ارب میل فی سیکنڈ سے زیادہ رفتار کے ساتھ سفر کیا تھا پھر اسی طرح کئی نُوری قرنوں اور کئی برقی رفتاروں کے مقامات آئے اور گزر گئے۔ ایک دن پتہ نہیں ہمزاد کو کیا سوجھی کہ اُس نے دو روحوں کو مانع اور مستعمل کے چکر میں ڈال کر ایک لمبے ہی چکر میں ڈال گیا۔ پھر یوں ہوا کہ مانع و مستعمل کی عدم تعمیل کے باعث ان روحوں کے درجے میں تنزلی کر کے ان کی حالتِ نور کو مادے کی کیفیت میں تبدیل کر دیا۔ لو بھئی یہ تھے ہم اور یہ تھی ہماری کہانی، جب ہم لوگ روح تھے تو ہمزاد کے قُرب میں تھے مگر اب باری باری مادے کی حالت میں پہنچے تو ہمارے بیچ کئی سیاروں اور کہکشاؤں کے دبیز پردے حائل ہو گئے۔

پھر کیا ہوا کہ ہم لوگوں نے ہمزاد سے دوری کے سبب رونا پٹنا شروع کیا مگر اب اتنے نوری سال کے فاصلے پر مقناطیسی اور برقی میدانوں کے بغیر ہماری رسائی اگر سو فیصد ناممکن نہیں تو محدود ترین ضرور ہو گئی۔ ناممکن اس لئے نہیں کہ ہمزاد اپنی مرضی سے کچھ مادی جانوں کو الیکٹرک فیلڈ کے ذریعے روحانی طور پر اپنی جھلک دکھا بھی دیتا تھا شائد اس لئے بھی کہ ان لوگوں کے ذریعے اس کا نام اور مقام مناسب حد تک قائم اور زندہ رہے۔ ہمزاد کی مرضی کے مطابق میں نے اپنی قید کے مقام جسے زمیں یا اس جیسا کوئی اور سیارہ تصور کر لیں پر اپنی کم درجہ یعنی اپنی مادے کی حالت کے مطابق کم درجہ عوامل میں کئی صدیوں کے ارتقاء کے نتیجے میں ترقی بھی حاصل کی جو ہماری نارسا فکر اور ہمارے مختلف زمانوں کے لحاظ سے بڑی ارفع اور اعلیٰ بھی دکھائی پڑتی تھی۔ نظامِ شمسی ہی کے کسی دوسرے سیارے کی دریافت ہو کہ مادے کو ہوا میں جہاز کی رفتار سے اُڑانے کا معاملہ یا پھر بھاری بھر کم ٹھوس اجسام کا پانی پر تیرنے کا مسئلہ، یہ سب بھی مجھے تو حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ چونکہ میں نے ارفع سے ادنیٰ کی طرف سفر کیا ہے اس لئے میری سرشت میں روح کی محبت اور ہمزاد سے ملاپ کی تڑپ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اگرچہ ہمزاد نے میری نوری طاقت کو سلب کر لیا مگر مجھے فکری طور پر زندہ رکھنے کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی کچھ طاقت بحال بھی رکھی۔ اپنی اس مخفی قوت کے بَل بوتے پر میں نے اپنی روح کے کھوج اور ہمزاد کی تلاش کا سفر جاری کر رکھا۔ اُس وقت جب میرا نام حلاج ہوا کرتا تھا تو میں نے چیخ کر ہمزاد کے راز کو افشاں کرنا چاہا۔ چونکہ ہمزاد کا کوئی ہمراز نہیں ہو سکتا اس لئے اس نے ظاہری عوامل کو استعمال کر کے فوری طور پر میری مادے کی کیفیت کو نور میں تبدیل کر دیا تا کہ میں اپنے دیگر ہم نفسوں کے اذہان کھولنے اور انہیں حقائق سے آگاہ کرنے سے باز رہ سکوں۔ اور پھر میرے ہی ہم نفسوں نے ظاہر کے لباس پہن کر میری پھانسی کے حکم نامے پر مہر صدق لگا دی۔

دلچسپ بات ہے کہ تمام کائنات مادے سے مل کر بنی ہے اور دراصل مادہ اور نور ایک چیز کے دو پرتوں ہیں اور اُنکی مقدار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کائنات میں ایک جتنی یعنی یکساں ہے۔ ان کی صرف ہیت تبدیل ہوتی ہے یعنی مادے سے نور میں اور نور سے مادے میں مگر یہ ختم نہیں ہوتے۔ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کی کیا روحوں نے زمین سے آسمان کا سفر کیا البتہ مادے اور لائٹ کے لئے دو الگ مقام مخصوص کئے۔

باقی صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ فرمائیں

"خطوطِ خم"

سید مشکور حسین یاد

(لاہور)

تمام خوابوں کا خواب ہیں ہم
حقیقتِ بے نقاب ہیں ہم

نہ پوچھیے ہم سے کون ہیں ہم
حسب نسب کا حساب ہیں ہم

ہمیں ملو زلف زلف ہوکر
خطوطِ خم کا خطاب ہیں ہم

نہ صرف ہیں روبرو پہ حاوی
عقب عقب کے عقاب ہیں ہم

ہمیں پکڑلو پکڑ سکو تو
شتاب اندر شتاب ہیں ہم

بندھے ہیں عالی جناب جس سے
وہ ایک ادنیٰ طناب ہیں ہم

سوال اندر سوال یادؔ آوٗ
جواب اندر جواب ہیں ہم

○

محمود الحسن

(راولپنڈی)

اے مرے مستِ خرام ناز یہ کیا کر دیا
حشر سے پہلے ہی تُو نے حشر بر پا کر دیا
یہ ترے نقشِ کفِ پا کا کرشمہ ہی تو ہے
جو شکستہ پا تھے اُن کو عرش پیما کر دیا
خرقہ پوشوں کو بھی تُو نے اے مرے شاہِ امم
رُوکشِ اسکندر وجمشید و دارا کر دیا
تیرگی ہی تیری تھی سارے عالم پر محیط
تُو نے آ کر گوشہ گوشہ میں اُجالا کر دیا
بحر کی وسعت عطا کی میرے مَن کی موج کو
تُو نے ہر اک موجہِ دریا کو دریا کر دیا
دِل تو اک شفاف آئینہ تھا کس کج فہم نے
دل کو بھی آلودۂ داغِ تمنّا کر دیا
اے حیاتِ جاوداں کوتاہ بینوں نے تجھے
ہائے دریوزہ گرِ امروز و فردا کر دیا
چشمہِ حیواں یہیں سے پھوٹ نکلے گا اگر
اہلِ دل نے زخمِ دل کو اور گہرا کر دیا
دِل گرفتارِ بلا تو تھا مگر قابو میں تھا
تیری آنکھوں نے نہ جانے کیا اشارہ کر دیا
گرچہ اُن سے کچھ نہ کہنے کا اِرادہ تھا مگر
آنسوؤں نے میری خاموشی کو گویا کر دیا
ہم تو وہ ہیں، بارشِ سنگِ حوادث دیکھ کر
اپنا سینہ اور بھی ہم نے کشادہ کر دیا

○

آصف ثاقب
(بوئی،ہزارہ)

ہمیں تو عشق میں جادو گری نہیں آتی
اُتر کے قاف سے کوئی پری نہیں آتی

بہت اڑا ہے ہواؤں میں جانِ جاں کی طرف
اب اس پرند کو نامہ بری نہیں آتی

ہمارا حال جو دیکھو تو دیکھتے ہی رہو
تمہاری آنکھ میں لیکن تری نہیں آتی

بڑے ادب سے ہیں خدمت میں چاہنے والے
ہمیں جناب کی یہ نوکری نہیں آتی

ہم اس کا نام چناروں پہ لکھتے رہتے تھے
کہ اب تو یاد بھی وہ سانوری نہیں آتی

بھری بہار میں ہے موتیا اُتر آیا
نظر میں پھول سی خوش منظری نہیں آتی

وہ لطفِ سیر کے میلے نہیں رہے ثاقبؔ
کہیں بھی شہر میں بارہ دری نہیں آتی

○

سُرور انبالوی
(راولپنڈی)

ستارے کیُوں ہیں پلکوں پر سوادِ شام سے پہلے
تجھے کچھ سوچنا تو تھا مرے نیلام سے پہلے

وفا و مہراب اس سے بھی بڑھ کر اور کیا ہوں گے
سرِ دار آ گیا ہوں میں تیرے پیغام سے پہلے

بڑی ہی مُدتوں میں ذات کا عرفان ہوتا ہے
گزرنا پڑتا ہے انسان کو اوہام سے پہلے

مجھے دیوانگی میں بھی شعورِ ذات حاصل تھا
نہ لکھا دل پہ کوئی نام ترے نام سے پہلے

تمہارا عشق کربِ زیست کا پیغام لایا ہے
بسر ہوتی تھی اپنی زندگی آرام سے پہلے

پھر اُس کے بعد تو اِک نور کا سیلاب آیا تھا
کرن سورج کی پھُوٹی تھی تمہارے بام سے پہلے

غمِ جاناں ترا قرض ایک دن آخر چکانا ہے
میں دامن چھڑا لوں گردشِ ایام سے پہلے

صلیب اپنی اُٹھا کر خود سرِ مقتل بھی آنا ہے
یہ سوچا ہی نہ تھا ہم نے کبھی انجام سے پہلے

سُرور انبالوی اُس تک رسائی ہو تو جائے گی
تعلق ختم تو کر لیجیے اصنام سے پہلے

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

(دہلی، بھارت)

ناز تھا جن کی رفاقت پر کبھی
شہرِ دل ویران کر کے چل دیئے

رشتوں کی استواری کا انداز نو
طوطا چشمی بھی یہاں پانی بھرے

جا کے لوٹے گی اب یہ سانس کیا
لا یقینی ہے دہن کھولے ہوئے

ذہن کہ تھا منجمد، دل ملول
''چہارسُو'' کی آمد پہ نو بہ نو ہوئے

وہ ہے مجبور اور تُو خواہ مخواہ
کون اب سامانِ دلجوئی کرے

کھا جاتے ہو دانستہ فریب
کون سی مٹی کے ہو تشنہ بنے

❍

غالب عرفان

(کراچی)

کر کے اک حرفِ معتبر کی تلاش
کر رہا ہوں نئے سفر کی تلاش

آنکھ کرتی ہے یوں تلاش مجھے
جیسے اخبار میں خبر کی تلاش

سارے دریا کی لہر لہر نے کی
میں جہاں ڈُوبا اُس بھنور کی تلاش

کر رہا ہے پرند وقت ابھی
گمشدہ اپنے بال و پَر کی تلاش

میں نے اپنی مسافتوں میں کبھی
کی نہیں راہِ مختصر کی تلاش

چشمِ عرفاں کی جستجو ہے مگر
کام آئی نہ در بدر کی تلاش

❍

نصرت زیدی

(راولپنڈی)

صراطِ وقت پہ چلتا ہے ڈولتا نہیں وہ
یہ رازِ خوش قدمی کیا ہے کھولتا نہیں وہ

عجیب شخص ہے بس اُس کو دیکھے جاتا ہے
پلک جھپکتا نہیں کچھ بھی بولتا نہیں وہ

نہ جانے کس کا تصور لئے ہے آنکھوں میں
یہ بات کیا ہے جو آنکھوں کو کھولتا نہیں وہ

ہر ایک زخم لئے ہے شباہتیں اُس کی
میں کیا کروں مرے دل کو ٹٹولتا نہیں وہ

یہ آہ نیم شبی تو مرے نہ کام آئی
جو پڑ گئی ہے گرہ دل میں کھولتا نہیں وہ

سمجھ میں آئے اُسے کیا فراق و ہجر کی بات
سُنے ہے پر مرے لفظوں کو تولتا نہیں وہ

ہر ایک رنگ سے باتیں کرے ہے وہ نصرتؔ
بس ایک پیار کا کیوں رنگ گھولتا نہیں وہ

○

نذیر فتح پوری

(پونے، بھارت)

تو اپنے پیاس جزیرے سے تھوڑا باہر آ
تجھے پکار رہا ہے ترا سمندر آ

نگاہیں کب سے تجھی کو تلاش کرتی ہیں
ہمارے سامنے اے چاہتوں کے پیکر آ

دعا سے ہو گئیں محروم بستیاں ساری
چھپا ہوا ہے کہاں اے مرے قلندر آ

فلک پہ اڑنے سے بے چینیاں بڑھیں گی بہت
سکون کی ہے طلب تو ذرا زمیں پر آ

یہ کہہ کے بزمِ سخن تجھکو یاد کرتی ہے
نذیرؔ تجھ سا کہاں ہے کوئی سخن ور آ

○

نسیم سحر
(جدہ)

ایسا کب اپنے قدم آگے اُٹھانے سے کیا!
مَیں نے اعلانِ سفر پیڑ گرانے سے کِیا

مَیں نے کب کوئی گلہ تیرا زمانے سے کیا؟
حالِ دِل اپنا بیاں اپنے سرہانے سے کِیا

اپنی آنکھوں میں اُتارا اُسے فوراً مَیں نے
اُس نے انکار جب آئینے میں جانے سے کیا

تیرے بارے میں کوئی بات نہ ہوسکتی تھی
ذکر تیرا بھی کسی اَور بہانے سے کیا

کوزہ گر نے ہی اُٹھائی نہیں میری مٹّی !
میں نے انکار کہاں چاک پہ جانے سے کیا!

دام میں آکے ترے سوچ رہا ہوں، مَیں نے
کیوں گریز اتنا ترے دام میں آنے سے کیا

دیر تک ٹوٹتے شیشوں کی صدا آئی تھی
عکس نے کتنا گلہ آئنہ خانے سے کیا

جس طرف جانے پہ اصرار تھا باقی سب کو
مَیں نے انکار اُسی سمت میں جانے سے کیا

اور جب کوئی بھی صورت نہ بچاؤ کی رہی
ہم نے آغاز قلعے اپنے گرانے سے کیا

ہم نے اِس شہر کی بربادی کا آغاز نسیمؔ
اپنے حلقوم پہ تلوار چلانے سے کیا

○

صابر بدر جعفری
(کراچی)

کوئی دیوار کا سایہ ہے نہ در کی صورت
کیا نکل آئی ہے لوگو میرے گھر کی صورت

ایک مہ وش کا تصور کہ بہ عنوان وصال
ظلمتِ شب میں فروزاں ہے سحر کی صورت

بارِ عصیاں ، دیدۂ نم، سایۂ ابرِ کرم
بارے نکلی تو کوئی رختِ سفر کی صورت

مہربانوں میں ہمارے ایسے فن کار بھی ہیں
کج روی کو بھی دیتے ہیں ہنر کی صورت

صبح دم کام پہ جانے کو جو گھر سے نکلے
شام کو لوٹ کے آئے وہ خبر کی صورت

زندگی نے تو ہمیں چین سے جینے نہ دیا
ہم تو اس بحر میں جیتے ہیں بھنور کی صورت

باپ کی نظریں نہیں اُٹھتی ہیں ان کی جانب
بیٹیاں تیزی سے بڑھتی ہیں شجر کی صورت

نہ بخاریؔ ہے نہ تابشؔ، نہ ظفرؔ ہے نہ رئیسؔ
بدرؔ اب کون سنوارے گا ہنر کی صورت

○

عبدالرحمٰن عبؔد

(نیویارک)

فلک نے لیئے امتحاں کیسے کیسے
گرے ہم پہ سنگِ گراں کیسے کیسے

ہیں مستور نوحہ کناں کیسے کیسے
ہوا زندگی کا زیاں کیسے کیسے

زمیں چپ رہی، آسماں نے نہ روکا
شہید ہو گئے نوجواں کیسے کیسے

ستم دیکھیئے، کہ مری خامشی پہ
لگے بولنے بے زباں کیسے کیسے

سیاست میں ناداریاں جرم ٹھہریں
کہ ڈالے گئے ہم کہاں کیسے کیسے

مرے خوں سے ہیں ہاتھ رنگین جن کے
وہ دیتے ہیں دیکھو بیاں کیسے کیسے

جو حاکم تھے مجبور و معذور ہیں اب
''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''

○

صفوت علی صفوت

(یو۔ایس۔اے)

نغمۂ ملاؔلہ ہے چشمۂ بلاغت میں
طالبان رہتے ہیں جذبۂ شہادت میں

قوم خود سے لڑتی ہے غُزوۂ جہالت میں
فوج اور سیاستداں مست ہیں سیاست میں

قوم ہی وہ جاہل ہے جس کی لڑکیاں جاہل
یہ ہے وعظِ سائنسی آج کی امامت میں

کب کوئی ہوا مسلم جنگ جُو کے ہاتھوں پر
یہ تو اُسوۂ حسنہ ہے اثر رفاقت میں

کمتری کا ہے عنصر یار اس غزل میں کچھ
اب رقیب ہیں آگے، غیر ہیں قیادت میں

ختم کر رہا ہوں یہ نام پر ملاؔلہ کے
ہم کو فخر ہے تجھ پر قوم ساری چاہت میں

نا ہی یہ زمیں اپنی نا ہی آسماں اپنا
محو رہتے ہیں صفوؔت جانے کیوں عبادت میں

○

ربنواز مائل

(کوئٹہ)

ہم کو مرغوب تر وہ نظارا ہوا
گاہ تِنکے سے بھی، جب سہارا ہوا

اس برس خواب کٹتے ہیں یُوں ہم قدم
جیسے کب ہوں کہیں کچھ بھی ہارا ہوا

اس لئے بھی تو ہوں زندہ تر میں بہت
ہر گھڑی ساتھ کو جب وہ پیارا ہوا

آنکھ ناگاہ پھر، یہ جو اپنی کھلی
جانے کس معنی میں کیا اِشارہ ہوا

دید بھی نرم تر، سوچ بھی نرم تر
سب کو یوں ہی لگوں، یُوں سنوارا ہوا

○

ڈاکٹر پنہاںؔ

(یو۔ایس۔اے)

عجیب ربط مری جان ہست و بود میں ہے
مرے عدم کا بھی امکاں مرے وجود میں ہے

نظر کو حسنِ فسوں ساز نے کیا خیرہ
مزاجِ عشق کا سودا زیاں کے سود میں ہے

وہ میری قید سے آزاد ہو گیا ہے مگر
اڑان اس کی ابھی تک مری حدود میں ہے

گلاب رنگ ہے اک زخمِ دل مگر خوشبو
کسی بھی گل میں نہ عنبر میں ہے نہ عود میں ہے

سلگ کے راکھ ہوئیں جس کی پیاس میں آنکھیں
وہ روشنی تو ابھی تک حصارِ دود میں ہے

دھڑکتے دل کو سنبھالے لرزتی روح لئے
عدم کے خوف سے کوئی مرے وجود میں ہے

نہ جانے کس کا ہے باطن غزل کے ظاہر میں
کوئی تو ہے کہ جو پنہاںؔ مرے وجود میں ہے

○

پروفیسر زُہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

تمہارے حُسن پہ مائل کہاں ہے
یہ دل اب پیار کے قابل کہاں ہے

شبِ وعدہ ہے تُم ہو اور میں ہوں
حجاب درمیاں حائل کہاں ہے

گلے میں ڈال دیں بانہیں کسی نے
مری اب آرزوئے دل کہاں ہے

مرے افسانۂ غم کی ہے سرخی
ترے ہونٹوں کی یہ لالی کہاں ہے

ابھی کچھ اور بھی نشتر زنی ہو
ابھی تو دل مرا بسمل کہاں ہے

سرِ محفل وہ کل یہ کہہ رہے تھے
مِرا وہ رونقِ محفل کہاں ہے

وہ زلفوں کو بکھیرتے پوچھتے ہیں
زکوٰۃِ حسن کا سائل کہاں ہے

نکل آیا ہوں میں کوئے بُتاں سے
بتا اے دل کہ اب منزل کہاں ہے

سفینہ جانبِ طوفان لئے چل
مجھے معلوم ہے ساحل کہاں ہے

کیسے سونپوں متاعِ دردِ اُلفت
کوئی اس درد کا حامل کہاں ہے

زمانے کے لیے مشکل ہے مرنا
زہیر اپنے لیے مشکل کہاں ہے

○

اشرف جاوید
(لاہور)

طویل شب کی مسافت میں مبتلا لوگو!
یہیں سے صبح کا نکلے گا راستا لوگو!

غبارِ راہ مٹاتا ہے نقشِ پا اس کے
کسے خبر ہے کہ وہ آ کے جا چکا لوگو!

کوئی تو بولے، کوئی توڑے خامشی کا طلسم
کبھی کھلے تو سہی کیا ہے ماجرا لوگو!

بہت قریب تھا ساحل، بہت قریب تھے دوست!
میں ہاتھ اٹھائے ہوئے ڈوبتا رہا لوگو!

اُسی کے ساتھ رہ و رسمِ دوستی بھی گئی
تمام شہر مجھے اجنبی ہوا لوگو!

چمک رہے ہیں ستارے، دمک رہے ہیں چراغ
پتا کرو! کہ کہاں رہ گئی ہوا لوگو!

لرز رہا ہے شجر کے نحیف ہاتھوں میں
وہ برگِ سادہ جواب تک نہیں گرا لوگو!

اب اُس کا ملنا کوئی خواب دیکھنا ٹھہرا
وہ ایک شخص جو مجھ میں بہت رہا لوگو!

یہ ارضِ پاک، یہ حسنِ ازل، یہ میری غزل
میں اِن کے ساتھ جیا جب تلک جیا لوگو!

○

انتظار

نصرت بخاری

(اٹک)

''**میں** جنگل کا بادشاہ ہوں''۔معصوم ہرنوں کا تعاقب کرتے طاقت ورشیر کی دھاڑ میں یہی پیغام تھااوراس کی بادشاہت کے حادثے کوسارا جنگل قبول بھی کر چکا تھا۔اُن کا خیال تھا کہ شایداس کوبادشاہ تسلیم کرکے وہ اس کے شر سے محفوظ رہیں گے۔لیکن ایسا نہ ہوا۔معصوم جانوروں کی چیر پھاڑ دیکھ کر بھی جب کوئی وجود مزاحمت کے لیے سامنے نہ آیا تو شیر کے حوصلے بلند ہو گئے۔اس نے بھاگتے بھاگتے چھلانگ لگائی اور ہرنی اس کے بھاری بھرکم وجود تلے دب کر رہ گئی۔اس کے بے رحم پنجے ہرنی کے نازک بدن میں اترتے چلے گئے ۔پکڑے جانے سے پہلے اس نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی؛وہ اتنی تیز بھاگی تھی کہ اس سے پہلے شاید کبھی اتنی تیز بھاگی ہو،مگر ناکام ہوئی۔اسے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ وہ شیر سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتی۔ورنہ اس سے پہلے جب بھی کوئی شیران کے ریوڑ پرحملہ کرکے کسی ہرنی کوشکار کر لیتا تو یہ سمجھتی کہ شاید اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔آج پہلی باراس پر یہ عقدہ کھلا کہ شیر سے تیز بھاگنا اس کے بس کی بات نہیں،اس سے پہلے اگر وہ بچتی رہی تو محض اس لیے کہ ابھی اس کی موت کا وقت نہیں آیا تھا ۔اس نے اپنا آپ چھڑانے کی بہت کوشش کی ،بڑا زور لگایا لیکن وہ اس کے چنگل سے نہ نکل سکی۔اسے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔کیونکہ اس نے کئی بار دیکھا تھا کہ شیر جب کسی ہرنی کو پکڑ لیتا ہے تو پھر وہ اس کو زندہ نہیں چھوڑتا بلکہ مار کر کھا جاتا ہے۔اس وقت شیر نے اس کے جسم میں اپنے دانت گاڑ لیے تھے۔اس تکلیف کی شدت سے تڑپی تو ایک بار شیر کی گرفت سے نکل گئی۔اس کی ٹانگوں نے اسے بچانے کی آخری کوشش کی مگر ابھی وہ دوسری جست بھی نہ لینے پائی تھی کہ شیر کا پورا وجود دوبارہ اس پر سوار ہو گیا۔ہرنی نے مزاحمت کرتے ہوئے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اس کو کچھ فاصلے پر اپنا ریوڑ اور دوسرے جانور گھاس چرتے نظر آئے۔اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر یہ سارے مل کر شیر پر حملہ کر دیں تو اس کی جان بچ سکتی ہے؛وہ حیران تھی کہ شیر اس کی جان لینے پر تلا ہوا ہے مگر کسی جانور پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں۔

''شاید انھوں نے مجھے شکار ہوتے نہ دیکھا ہو''ہرنی نے سوچا۔اس نے ساتھیوں اور دوسرے جانوروں کو متوجہ کرنے کے لیے ایک چیخ بلند کی۔بعض پر اس کی چیخ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔چند ایک جانوروں کی نظریں یہاں تک آئیں مگر پھر ان کے منہ گھاس میں گم ہو گئے۔اس وقت اچانک اس کی ماں کی وہ بات ذہن کے کسی گوشے سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''ہم چونکہ کمزور، بے ضرر اور بے یارو مددگار جانور ہیں اس لیے ہمارے جنگل کی زندگی بہت مشکل ہے۔اگر درندوں اور دوسرے طاقت ور جانوروں کے خوف سے کہیں چھپ کے بیٹھے رہیں تو بھوک مار دے گی اور اگر کھانے ، پینے کے لیے نکلیں تو درندے گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ہم مجبوروں کے لیے زندگی کیا خوب صورت ہوگی جب کہ قدم قدم پر موت منہ کھولے کھڑی ہو''

''ہمیں جینے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟''اس نے اپنی ماں سے پوچھا تھا

'' جینے کے لیے ضروری ہے کہ ان خونخوار جانوروں سے دور رہو کیونکہ ان کے دلوں میں ہمارے لیے رتی بھر رحم نہیں۔ان کے دل پتھر ہوتے ہیں۔ہمارے چیخنے چلاّنے اور تڑپنے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ہم تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر وہ ہمیں جب چاہیں شکار کر سکتے ہے اس لیے بچت کی صرف ایک صورت ہے کہ چرنے کے لیے جنگل میں کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرو جہاں بہت سے گھنے درخت ہوں اور دور سے یہ درندے تمھیں اپنی طرف آتے نظر آ جائیں اور تم بھاگ کر ان درختوں میں چھپ جاؤ''۔

''بس، یہی ایک صورت ہے''؟

''ایک صورت اور بھی ہے''اس کی ماں نے کہا تھا

''وہ کیا''۔اس کی کپکپاتی زبان نے بڑی مشکل سے سوال اُگلا

''وہ یہ کہ اگر خدانخواستہ کوئی درندہ تمھیں پکڑ لے اور کوئی انسان وہاں آ جائے تو وہ تمھیں اس درندے سے چھڑا لے گا''۔

''وہ کیوں چھڑائے گا؟ ہمیں کھانے کے لیے''؟خوف نے اس کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال دیے

''نہیں،انسان تو بہت رحم دل ہوتا ہے۔وہ کسی کو اذیت نہیں دیتا، بلکہ وہ کسی کو مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔اس کا کام دکھیاروں کی ہم دردی اور غم گساری ہے''۔

''کیا انسانوں کے جنگل میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا''

''انسان جنگل میں نہیں رہتا۔اس نے شہر بسا لیے ہیں۔وہاں بھی ظالم لوگ ہوتے ہیں لیکن جنگل کا قانون نہیں ہوتا۔وہاں ظالم کو ظلم کی سزا ملتی ہے''۔

''انسان کیسا ہوتا ہے''۔اس کے معصوم ذہن میں تجسس امڈ آیا۔اس کا خیال تھا کہ شاید انسان ان درندوں کی طرح کوئی بڑا درندہ ہوگا۔اس کے بھی چار پیر، چار ٹانگیں اور دُم ہوگی۔اس کے جسم پر بھی بال ہی بال ہوں گے۔

''انسان اللہ کا سب سے خوب صورت شاہ کار ہے۔اس کے ہم چوپایوں کی طرح چار پیر نہیں ہوتے۔اس کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں جن کے سہارے وہ کھڑا ہوتا ہے اور دو ہاتھ ہوتے ہیں جن سے وہ اپنے کام کرتا ہے''

''دو ٹانگوں پر وہ کیسے کھڑا ہو سکتا ہے۔ہم جانور تو اس طرح نہیں کھڑے ہو سکتے''۔اس نے دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی تھی مگر دو ٹانگوں

نے سارا وجود اُٹھانے سے انکار کردیا اور وہ گر پڑی تھی۔

''بندروں کو تو دیکھا ہے نا کبھی کبھی دو ٹانگوں پر چلتے ہوئے''

''اچھا اچھا، اس طرح''۔ اس نے مایوسی سے کہا تھا

''ان بندروں کی طرح نہیں۔ انسان تو خوب تن کر چلتا ہے اور ہاں اس کے سارے بدن کی بجائے صرف سر پر بال ہوتے ہیں۔ اور وہ کپڑے پہنتا ہے''۔

''یہ کپڑے کیا ہوتے ہیں''۔

''تمھیں یاد نہیں؟ ابھی کچھ دن پہلے جب ہم سب دریا پر پانی پینے گئے تھے اور بھینسے پانی میں نہا رہے تھے۔ اس دن بھینسے کے سینگ سے جو چیز اٹک کر باہر آ گئی تھی اور بندروں نے اسے ایک دوسرے پر اچھال اچھال کر خوب اودھم مچایا تھا۔ وہی کپڑا ہے''۔

''دریا میں وہ کپڑا کیسے آ گیا''۔ اس نے معصومیت سے پوچھا تھا

''کسی نے دریا میں نہانے کے لیے کپڑے باہر اتارے ہوں گے اور وہ تیز ہوا یا کسی اور وجہ سے پانی میں گر گئے ہوں گے''۔

بدن پر لگنے والے ایک زخم کی تکلیف نے اس کی یادوں کا تسلسل توڑ دیا۔ وہ تڑپ رہی تھی لیکن ابھی اس کا حوصلہ مغلوب نہیں ہوا تھا۔ اس میں اب بھی زندہ رہنے کی امنگ باقی تھی۔ اچانک دور سے اسے ایک عجیب وغریب جانور اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس سے پہلے اس نے اس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور۔ اچانک اسے یاد آیا کہ یہ تو وہی انسان ہے جس کے متعلق اس کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ میری جان بچائے گا۔ ساری نشانیاں وہی تھیں۔ اس نے ویسے ہی کپڑے پہن رکھے تھے جیسے بندر ایک دوسرے پر اچھالتے تھے۔ بال بھی صرف سر پر تھے۔ اس انسان کے ہاتھ میں عجیب وغریب آلات تھے۔ اس نے جو ایک ہرنی کو شیر کے پنجوں میں پھڑکتے دیکھا تو وہیں رُک گیا۔ اس نے چند ثانیے یہ منظر دیکھا اور پھر جلدی جلدی اپنے آلات درست کرنے لگا۔ ہرنی مطمئن ہو گئی کہ وہ اس کی آزادی کا اہتمام کر رہا ہے۔ انسان کو دیکھ کر شیر کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی گویا وہ اس کی مداخلت سے اپنے شکار کو چھوڑنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ اگرچہ اس نے ہرنی کو قابو کیا ہوا تھا لیکن اس کی ساری توجہ اب اس انسان پر تھی جس کا کیمرہ شیر کے خون آلود منہ اور ہرنی کے تڑپ تڑپ کے مرنے کی فلم بنانے میں مصروف تھا۔

شیر کی غصیلی آنکھیں کچھ دیر تو فاصلے پر کھڑے انسان کو بڑے غور سے دیکھتی رہیں لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کے شکار کو چھڑانے کا ارادہ نہیں رکھتا تو وہ دوبارہ ہرنی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس بار اس نے اس زور سے اس کی گردن میں دانت پیوست کیے کہ ہرنی کے بدن سے جان نکل گئی، مرتے مرتے اس ہرنی کے ذہن میں یہی ایک بات تھی کہ جس کو وہ انسان سمجھ بیٹھی تھی وہ تو کوئی عجیب وغریب جانور ہے۔

''کاش کوئی انسان آ جاتا تو میری جان بچ جاتی''۔ ہرنی کے منتشر وجود کو ابھی تک انسان کا انتظار تھا۔

''اسٹینوگرافر''

آئی جو نئی اینگلو اسٹینو گرافر
اک آن میں تبدیل ہوا دفتری کلچر

وہ حسنِ ولایت وہی ''مِس اُرسلاٹرنز''
انگریزیاں اب بول رہے ہیں سبھی فر فر

ہنستی ہے وہ میخانہ بدوش آنکھ ملا کر
ہر گام پہ اِک جام پلاتی ہے وہ دِلبر

کیا رِدھم ہے کیا لوچ ہے چلتی ہے سنبھل کر
ہے دونوں طرف دوستوں بیلنس برابر

دیکھے کوئی مُڑ کر کوئی تاکے اُسے رُک کر
آداب بجالائیں سبھی دفتری جھک کر

ڈکٹیشن اُسے ملتا ہے ناول کے برابر
ٹائپ نہیں کرتی وہ مگر ایک بھی لیٹر

وہ سیٹ پہ بیٹھے تو بتاؤ بھلا کیوں کر
ہر لحہ اُسے چاء کی ملتی ہے جو آفر

ہے شان نئی دھج بھی نئی حسن کا پیکر
وہ قامتِ زیبا کہ کہے دل یہ مچل کر

ہر فتنۂ محشر سے ترا قد ہے فزوں تر
مُسکان پہ قربان کروں بختِ سکندر

اک روز وہ گھبرائی ہوئی آئی ستم گر
اور جلد ہی واپس ہوئی وہ چھوڑ کے دفتر

کچھ ایسی امرجنسی کوئی آ گئی سر پر
اک ہفتہ نہیں آئی وہ واپس کِیا شوفر

ہر شخص پریشاں پیَن (PEON) ہو کر ہوا افسر
''سب خیر رہے'' تھی یہ دعا سب کے ہی لب پر

پھر اچھی خبر آئی سُنی سب نے یہ ہنس کر
اس شوخ کے یاں خیر سے پیدا ہوا شوہر

○

تشنہ بریلوی (کراچی)

شناخت

جاوید اختر (جمشید پور، بھارت)

وہ دونوں بستر پر سوئے ہوئے تھے۔ایک دوسرے میں بالکل سمائے ہوئے۔یوں لگتا تھا مانو کبھی نہ ختم ہونے والے بستر پر سوئے ہوئے ہیں.....

جی ہاں! یہ دونوں میاں بیوی ہیں ان کے ڈھیر سارے بچّے ہیں دیکھوتو اُن کی خوابگاہ،اور دیواروں پر آویزاں بچّوں کی تصویریں لیلی،مونا،پنکی، ڈولی،جولی،روزی دوڑتی بھاگتی ہنستی مسکراتی اور کھیلتی ہوئیں۔

عجیب فضاء تھی....ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بادلوں کے درمیاں کھڑا ہو کر دھندلے سفید ریشمی مرغولے اُس کے بدن کو مس کر رہے ہیں کبھی کبھی اِن مرغولوں میں ایک درار سی پڑ جاتی تھی اور اس درار میں اُسے جھانکتے ہوئے گداز اجسام نظر آتے تھے۔نرم،ملائم جانگھیں،گھنیری پلکوں سے ڈھکی ہوئی خوبصورت آنکھیں ،نرم ہونٹ جیسے اِن سے تازہ لہو ٹپک رہا ہو۔

دفعتاً اُسکے اندر ایک عجیب سے لجلجے پن کا احساس گھر کر گیا۔وہ اِن مرغولوں کی حد سے بچنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

اور وہ بھاگا....لیکن وہ بھاگ نہیں سکا تیزی کے ساتھ پھیکے گئے پتھر کی طرح وہ نیچے کی طرف گرنے لگا۔

چھپاک....

وہ گہرے پانیوں میں اترتا چلا گیا چاروں طرف نیلا پانی تھا اور سنہری مچھلیاں منہ پھاڑے اُس کی طرف بڑھ رہی تھیں جذبات سے مغلوب ہو کر اُس نے ایک مچھلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مٹھی کس لی لیکن مچھلی اُس کی گرفت میں نہ آ سکی پھسل کر بہت دور نکل گئی۔اُس کے ہاتھ میں صرف ایک لجلجا رقیق چپک کر رہ گیا کراہیت کا وہی جذبہ اُسے ڈنک مار گیا اُس کے سارے بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔

آگ....

ایک بہت بڑا الاؤ تھا جس کے گرد نیم برہنہ جنگلی عورتیں جنونی رقص کر رہی تھیں اور وہ خود ننگی حالت میں ایک شیطانی مجسمے سے بندھا ہوا تھا جس کے دانتوں سے لجلجا لہو بوند....بوند ٹپک رہا تھا۔اُسے یہ احساس ہوا کہ یہ ساری عورتیں اُس کی مائیں ہیں جو اپنے بچّے کو دیوتا کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے لائی ہیں اور بہت جلد یہ واضح ہو گیا کہ واقعی وہ اُس کی مائیں ہی ہیں کیوں کہ اُن میں سے جس کی چھاتی سڑے ہوئے گوشت کی طرح تھی۔اس کی ماں تھی جسے مرے ہوئے چند ہی سال گذرے تھے۔جب بھی آگ کا شعلہ بلند ہوتا اُن میں سے ایک وحشی عورت اُس کے پاس آتی اور باری باری اپنی دونوں چھاتیوں کو اُس کے منہ سے لگا دیتی۔اور وہ کسی بھوکے بچّے کی طرح مزے سے اُس لسلسے اور بدبودار دودھ کے ذائقے کو اپنے حلق کے اندر اُتارتا پھر وہ عورت اُس کے پوشیدہ حصّوں سے نہ جانے کیا کھلواڑ کرتی کہ اُس کی سکڑی ہوئی نسیں تن جاتیں اور آنکھیں اُبل پڑتیں۔ہونٹ کے دہانے سے کوئی لجلجا رقیق بہنے لگتا لذّت کی گراں باری سے وہ نچلے ہونٹ کو اپنے تیز دانتوں سے لہولہان کر لیتا اور آنکھیں سختی سے میچ لیتا....دفعتاً اُسے محسوس ہوا کہ اُسکے جانگھوں کے بیچ کا حصّہ نہیں رہا جیسے کسی نے اُسے تراش لیا ہو اُس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی....

آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر ہے اور اُس کی تمام بچیاں اُسکے بدن کو تختۂ مشق بنائے ہوئی ہیں۔بچّیوں کو اُس نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔

اب وہ اپنی بیوی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔اُس کی مضبوط باہیں بیوی کی گداز اور ملائم چھاتیوں کے اردگرد حمائل تھیں۔وہ گہری نیند میں تھی....آدھ کھلی آنکھیں صاف وشفاف چہرہ اور مسکراتے ہوئے ہونٹ ....اچانک اُس نے اپنی باہیں بیوی کے جسم سے الگ کیں اور اُٹھ کر خوابگاہ میں لگی مختلف تصویروں کو گھورنے لگا۔

لیلی....ایک سرسبز وشاداب میدان میں کھڑی ہے اُس نے سفید سوٹ پہن رکھا ہے۔بڑی دلکش لگ رہی ہے اُس کے گھنے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔بال کیوں اُڑ رہے ہیں! آس پاس پیڑوں اور پودوں کا تو نام ونشان نہیں ہے صرف اوپر صاف اور شفاف نیلے آسمان کے سوا۔اُس نے یہ تصویر شاید کالج کے پکنک ٹور پر کھنچوائی تھی وہ کیمرہ بھی تو ساتھ لے گئی تھی۔

مونا....ابھی ابھی اسکول سے آئی ہے پسینے کی بوندیں اُس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔وہ بہت زور سے مسکرا رہی ہے بالکل اپنی امّی کی طرح جب ہنستی ہے تو دانتوں کے قطاروں کے ساتھ ہلکا سا گلابی مسوڑہ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔میں نے ہی تو اُسے ہنسایا تھا۔اپنی ناک کو چپٹا کر کے۔وہ ہنس پڑی تھی اور میں نے بٹن دبا دیا تھا۔

پنکی....یہ بہت خاموش طبیعت کی لڑکی ہے۔اُسے میں نے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔بڑی سنجیدہ ہے۔اُس نے کبھی مجھ سے ٹافی کیلئے ضد نہیں کی،یوں لگتا ہے جیسے اُس کی کوئی خواہش ہی نہیں تصویر میں بھی یہ بالکل خاموش کھڑی ہے۔بہت اِلتجاؤں کے بعد اُس نے تصویر کھنچوائی تھی۔اور بٹن دبتے ہی بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

یہ ڈولی ہے....اپنی امّی کے ہاتھ پکڑے ہوئے بڑی ضدی لڑکی ہے آٹھ سال کی ہو گئی ہے لیکن اکثر راتوں کو میرے بستر پر آکر سو جاتی ہے اور مجھے پیار کرنے لگتی ہے ایک بار تو اُس نے حد ہی کر دی تھی میرے نچلے ہونٹ کو اتنے زور سے دانتوں سے دبایا تھا کہ میرے ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے ابھی بھی

میرے نچلے ہونٹ پر کٹے کا نشان باقی ہے۔

اور یہ ہے جولی.... بہت شریر، بچپن سے ہی اُسے توڑ پھوڑ کی عادت ہے اُس نے ایک بار میرا قیمتی چشمہ توڑ ڈالا تھا کیوں کہ دفتر سے لوٹتے وقت میں ہر روز کی طرح ٹافی لانا بھول گیا تھا تصویر میں بھی اُس کی شرارت عیاں ہے ہاتھ میں اُس نے جو گڑیا پکڑ رکھی ہے غور سے دیکھئے اُس کا سر غائب ہے اُس کی یہ گڑیا میں نے اُس کے برتھ ڈے پر دی تھی بڑی قیمتی گڑیا تھی یہ.... سر توڑ کر کہنے لگی۔ ڈیڈی میں نے اپنی گڑیا کا سر توڑ ڈالا ہے کیوں کہ یہ ہنستی نہیں تھی۔ صرف آنکھیں پھاڑے گھورتی ہی رہتی تھی۔

اور یہ ہے میری سب سے چھوٹی بیٹی روزی.... ابھی یہ پانچ چھ دنوں کی ہی ہے بڑی پیاری بچی ہے بیوی نے ہسپتال میں مجھے بتایا تھا کہ جب یہ پیدا ہوئی تو نوزائیدہ بچّے کی طرح نا تو سفید پپڑیاں جالے کی طرح اُس کے ہونٹوں پر چسپاں تھیں اور نا پیروں کے تلووں اور ہتھیلیوں میں ہی شکنیں تھیں وہ بالکل صاف اور شفّاف تھی اور وہ روئی بھی نہیں تھی دیکھو میری گود میں کتنے پیار سے مسکرا رہی ہے بیوی نے یہ تصویر ہسپتال سے گھر آنے کے دوسرے ہی دن کھنچوائی تھی۔

میرے بچّے کتنے پیارے ہیں میں انہیں بہت چاہتا ہوں۔ دفتر سے آنے کے بعد سارے بچّے مجھے ڈیڈی ڈیڈی کہہ کر لپٹ جاتے ہیں۔ اور چوم چوم کر میرا چہرا سرخ کر دیتے ہیں۔ پنکی جو سیدھی سادھی اور سنجیدہ ہے اُسکی فطرت بھی اُسی کی طرح دلکش اور خوبصورت ہے۔ وہ سب سے آخر میں آتی ہے جب بوسوں اور شور وغل کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ وہ آتے ہی میرے موزے، جوتے اور ٹائی اُتارنے لگتی ہے۔ میں شاید سب سے زیادہ اُسے ہی چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سبھی بچّے اپنے اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ تو بڑے پیار سے مجھے باتھ روم جانے کو کہتی ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آتے ہی وہ کوفی یا چائے لے کر آتی ہے۔ ایک کپ اپنے لئے بھی لے آتی ہے۔ اور ساتھ بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ پینے لگتی ہے۔ وہ تو میرا اتنا خیال رکھتی ہے، جیسے وہ میری بیٹی نہیں بیوی ہو یا........ پھر میری ماں ڈھیر سارے بچّے ہونے سے پہلے جیسے میرا خیال بیوی رکھتی تھی۔ اب تو اُسے گھر کی صفائی اور کچن سے فرصت ہی نہیں ملتی وہ تو مجھے بستر سے اُٹھنے کے بعد بستر پر ہی ملتی ہے۔ تھکی تھکی.... چور چور۔ کبھی کبھی دو چار باتیں کر کے سو جاتی ہے۔ وہ تو میں بے صبرہ ہوں جو اپنے مطلب کے لئے دیر تک جگائے رکھتا ہوں۔ اور جب میں مطمئن ہو جاتا ہوں تو کروٹ بدل کر گہری نیند سو جاتا ہوں۔ اندھیرے میں جب نیند کھلتی ہے تو بے خبر سوئی ہوئی بیوی پر بہت پیار آتا ہے۔ میں اُسے اتنا چومتا ہوں اتنا چومتا ہوں کہ اُس کی نیند کھل جاتی ہے۔ اور آنکھیں کھلتے ہی وہ بستر سے سیدھے کچن میں جانے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ اتوار کی صبح تو جیسے اُس کی جان بچ جاتی ہے کیونکہ اُس دن بچوں کے ساتھ چرچ میں عبادت کا دن ہوتا ہے۔ پانچ بجے صبح سے ہی اپنی اور بچّوں کی تیاریاں کرنی پڑتی ہیں اُس دن میری پیاری بیوی جو میری روح ہے بچ جاتی ہے۔ ورنہ ہفتے کے اور دنوں میں اُسے بانہوں میں لے کر دس بارہ بوسے ہونٹوں اور گالوں کو ملا کر لے لیتا ہوں۔

ایک جگہ اور میں بوسے لیتا ہوں.... مجھے بہت اچھا لگتا ہے لیکن اُسے بہت شرم آتی ہے۔ اس کے لئے تو وہ بہت دیر میں راضی ہوتی ہے کبھی کبھی تو بہت ناراض ہو جاتی ہے۔ لیکن اکثر وہ بڑی معصومیت سے راضی بھی ہو جاتی ہے۔

میں اپنی بیوی سے پوری طرح مطمئن ہوں وہ راتوں کی تاریکی ہو یا پھر دن کا اُجالا وہ دونوں صورتوں میں پوری کی پوری کھری ہے صبح اس کے ہونٹ سوجے ہوئے ہوتے ہیں اور دن میں کاموں کے بوجھ سے اُس کے ہاتھ پیر....

سوتے ہوئے چہرے کو دیکھو کتنا اطمینان اور سکون ہے اُس کے چہرے سے اُسکی آسودگی عیاں ہے۔ ادھ کھلی آنکھیں.... سوجے ہوئے ہونٹ پھیلی ہوئی گداز باہیں.... اور جانگھوں سے اوپر اُٹھی ہوئی میکسی.... اُسے اپنی چھاتی کا بھی خیال نہیں کس قدر عیاں ہو چکی ہیں۔ وہ تو میں ہوں جو ہر صبح اُٹھنے سے پہلے اُس کے سینے کے بٹن بند کر دیتا ہوں۔

وہ پھر اپنی بیوی کے بغل میں لیٹ گیا.... اُس کی آنکھیں اپنی بیوی کے نشیب و فراز پر پھسل رہی تھیں۔ باہر ابھی تک اندھیرا تھا صبح ہونے میں ابھی دیر تھی وہ دیر تک اپنی بیوی کو نہارتا رہا پھر اچانک اُس نے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔

نرم ملائم گداز جسم اُس کے مضبوط اور پتھریلی بانہوں میں جیسے روئی کے گالوں کی مانند سما گیا وہ سمایا رہا آج اُسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ وہ پوری طرح ننگی ہو چکی ہے دن بھی چڑھ آیا ہے اُسے بھی نا جانے کیا ہو گیا تھا۔ ابھی تک وہ نا تو جاگی ہی تھی اور نا ہی روز کی طرح کسمسا کر کچن میں ہی دوڑی تھی۔ وہ بے سدھ سوئی ہوئی تھی۔ یا پھر اُسے آج یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ دفعتاً اُسے محسوس ہوا کہ اس کی بانہوں میں کوئی ملائم اور لجلجی شئے قید ہے۔ اُس کے بستر پر بے شمار لسلسی بدبودار مچھلیاں رینگ رہی ہیں۔ جانگھوں کے بیچ کوئی ٹھنڈی شئے آ کر چپک گئی ہو وہ اچھل کر بیوی سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ ابھی بھی سو رہی تھی۔ ایک نا معلوم سی کُلبلاہٹ اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی وہ مادر ذات ننگا باتھ روم میں نہا رہا تھا۔ بالکل بر وستر.... یکایک اُسے محسوس ہوا اُس کے مضبوط اور پتھریلے جسم میں کوئی گداز اور ملائم شئے برق کی سی تیزی سے سرایت کرتی جا رہی ہے۔ وہ چونک پڑتا ہے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں باتھ روم میں لگے آئینے کے مقابل وہ کھڑا تھا۔ سر تا پا وہ اپنے آپ کو نہار رہا تھا۔

جانگھوں کے بیچ کا وہ حصّہ جس میں کوئی ٹھنڈی سی شئے آ کر چپک گئی تھی بالکل سپاٹ تھا۔ چہرے پر اُگی ہوئی داڑھی کے سخت بال بھی نہیں رہے۔ اُن کی جگہ چکناہٹ اور ملائمیت نے لے لی ہو۔ لمبی لمبی گداز باہیں نکل آئی ہوں۔ گداز اور ملائم چھاتیاں زمین کو چھو رہی ہیں۔ اور اُن کے نپلس اس کے پیروں کے انگوٹھوں کو.... وہ ہو بہو ایک گداز عورت میں بدل چکا ہے آنکھوں کے کنارے کھنچ کر لمبے ہو گئے ہیں۔ اور جسم کے اُس حصّے سے ایک انجانا سا سرور

اسے کمزور کررہا ہے کہ کوئی سخت شئے اس میں سرایت کر جائے۔اور وہ آنکھیں بند کئے شاور کے نیچے لیٹا رہے۔

لیکن دوسرے ہی پل جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو گہرے پانیوں میں تیرتی ہوئی سنہری مچھلیاں الاؤ کے گرد رقص کرتی نیم برہنہ جنگلی عورتیں۔شیطانی مجسمے سے بندھا اُس کا برہنہ جسم۔اور کسی بدروح کی بھیانک چیخ کے ساتھ اُس کے ہونٹوں سے بدبودار چھاتیوں کا لگنا۔اُس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ واضح طور پر نمایاں ہو گیا۔دفعتاً اُسے محسوس ہوا جیسے ''کافکا'' کے ناول کے کردار کی طرح اُس کا بھی بیٹا فارماسس ہو چکا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ''کافکا'' کا کردار کاکروچ میں بدل گیا تھا اور وہ ایک نازک اندام دوشیزہ میں اُس نے ایک جھرجھری سی لی اور باتھ روم سے نکل گیا۔وہ بالکل خالی الذہن بیٹھا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے اُسے چونکا دیا۔یس کمنگ۔میں تیار ہوں۔وہ اپنی گدّے دار کرسی میں اچھل کر رہ گیا۔ایک نسوانی آواز نے اُسے مخاطب کیا تھا۔

اُف یہ اذّیت۔یہ نسوانی مترنم آوازیں۔

ملائمیت۔اور گداز پن کا احساس....اُسے یوں لگا۔مانو اُس کی انگلیاں فون میں دھنس جائیں گی اور اُس کا جسم گدّے دار چیئر میں....وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔آنکھیں بند تھیں۔اور ذہن کہیں دور خلاؤں میں محو پرواز....

مے آئی کم اِن سر۔بیک وقت کئی نسوانی آوازوں نے اُسے گھیر لیا۔سر آپ نے ہمیں ڈکٹیشن کے لئے بلوایا ہے۔

وہ ان خوبصورت عورتوں کو اپنی خالی خالی آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔اُس کا جسم ساکت تھا۔اور آنکھیں اُن عورتوں کے وجودوں پر پھسل رہی تھیں۔پیشانی پر بے شمار سلوٹیں ابھریں اور غائب ہو گئیں۔اب وہ ایک مکمل مضحکہ خیز انداز میں اپنے چیئر پر اکڑو بیٹھا ہوا۔اُلّوؤں کی طرح انہیں ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔جذبات سے عاری چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔آنکھیں بڑی بڑی ہو کر باہر کو نکل آئی تھیں۔اُسے محسوس ہوا جیسے یہ ساری عورتیں اُس پر جھک آئی ہیں۔اور اُن کی بڑی بڑی گداز چھاتیاں اُس کے منھ کے راستے اُس کے اندر داخل ہو رہی ہیں۔وہ چیخ پڑتا ہے۔اور دوسرے ہی لمحے بندروں کی مانند چھلانگ لگاتے ہوئے چیمبر سے باہر نکل جاتا ہے۔

وہ اب سڑکوں پر بڑی تیزی سے چلا جا رہا تھا۔کہاں؟ اُسے خود بھی پتا نہ تھا۔بس وہ چلتا ہی جا رہا تھا۔اُلّوؤں کی طرح پلک جھپکاتے ہوئے،تیز، بہت تیز....اور بہت تیز....

سڑک کے کنارے بنے عمارتوں کی منزلوں سے جھانکتی عورتیں۔فٹ پاتھ پر ہنستی کھلکھلاتی دوشیزائیں۔قہقہوں کے بیچ سڑک پار کرتی کالج کی طالبات اور خوبصورت شوکیشوں میں سجی بڑی بڑی ماڈل گرل جیسے سب اُس کا پیچھا کر رہی ہوں۔وہ تیز اور بہت تیز اور بہت تیز بھاگتا رہا۔

شام کی سیاہی گہری ہوئی اور وہ ایک کلب میں داخل ہو گیا وہ ایک خالی میز پر بیٹھ گیا اندر مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اُس کی الّوؤں کی طرح بڑی بڑی آنکھیں اپنے اطراف کا بڑے غور سے جائزہ لے رہی تھیں۔

ساری میزیں پُر تھیں کھنکناتی نسوانی آوازیں کلب کے ماحول پر محیط تھیں یہ مسٹر چوپڑا ہیں ایک سال ہوئے کار ایکسیڈینٹ میں ان کی پتنی کا دیہانت ہو گیا تھا یہ اکیلی آئی ہیں سامنے جو بیٹھی ہیں وہ ابھی شادی شُدہ نہیں ہے اور جو دور بیٹھی قہقہے لگا رہی ہے جس کے ہاتھوں میں سگریٹ ہے اُس کا ہسبینڈ اُسے چھوڑ کر امریکہ جا بسا ہے اور وہ جو ساری عورتیں بیٹھی ہیں یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کی ساری بیوہ ہو چکی ہیں اور سبھی کے ہسبینڈ مر چکے ہیں تبھی تو یہ سب اکیلی آئی ہیں اُسے اپنا وجود کھوکھلا محسوس ہوا جیسے کچھ کھو سا گیا ہو اُس کی آنکھیں کچھ تلاش کر رہی ہیں وہ نامکمل ہے اس کے اپنے وجود میں ہی کہیں کچھ سڑ گیا ہے جس کی بدبُو وہ اپنے چہار سو محسوس کر رہا ہے۔

وہ شاید کہیں کھو گیا ہے۔اپنے اردگرد کا وہ باریکی سے جائزہ لیتا رہا لیکن وہ کہیں بھی تو نہیں اپنے وجود کا کرب اُسے اندر ہی اندر جیسے کھوکھلا کئے جا رہا تھا وہ سڑکوں،پارکوں،موٹروں،فٹ پاتھوں،ہوٹلوں،کلبوں،گھروں اور دفتروں میں اپنے آپ کو تلاشتا پھرتا رہا....وہ ہاتھوں میں بیگ لئے کتنی تیزی سے جا رہی ہے وہ دیکھو پارک کے اُس کونے میں جہاں پختہ سمینٹ کی کرسیاں نصب ہیں چالیس سال کی ایک عورت اپنے ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ خوش گپّیوں میں مشغول ہے وہ بڑے بڑے بال والی سفید عورتیں کتنی تیزی سے کار چلا رہی ہیں اور وہ جو بیٹھی ہے کتنی موٹی اور بدشکل ہے اُس کی جوان لڑکی ہے گھر میں بھی ڈھیر ساری لڑکیاں اور بچیاں ہیں دفتر میں بھی تو جیسے اچانک سارے کے سارے اسٹاف ہی بدل گئے ہیں۔

وہ اسٹینو جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔پتا نہیں کیوں اُس نے استعفیٰ دے دیا اُس کی جگہ ایک نہایت نازک اندام لیڈی آ گئی ہے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک موٹی پرت سُرخی کی لگی ہوتی ہے۔

اُس کا چپراسی بھی تو بدل گیا ہے پتا نہیں کہاں کھوں گیا چھٹی لے کر جو گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔اُس کی جگہ ایک بھدّی موٹی سی تھُل تھُل کرتی عورت آ گئی ہے جو صبح ہی صبح اُسکی میز پر چائے رکھ جاتی ہے۔

وہی شکلیں....وہی صورتیں....وہی مانوس آوازیں....ویسی ہی مانوس شباہتیں اور ویسی ہی ملائم گداز احساسات ایک نسوانی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی ''کیا آپ میرے ساتھ ڈانس کرنا پسند کرینگے'' Please come and enjoy

چند لمحے کے لئے جیسے اُس کی سماعت بند ہو گئی ہو وہ اُس عورت کو پھر الّوؤں کی طرح دیکھے جا رہا تھا اُس کی نگاہیں اُس کی گول گول چھاتیوں پر مرکوز تھیں۔پھر نا جانے کیوں بندروں کی طرح اپنی جگہ سے اُچھلا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔وہ ایک بار پھر سڑکوں پر تیز....اور تیز....اور بہت تیز بھاگ رہا تھا۔

وہ کئی دنوں سے اپنی خوابگاہ میں اپنے آپ کو قید کئے ہوئے تھا بیوی بچّوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے وہ سب خوف زدہ تھے کیوں کہ خوابگاہ کے اندر سے اکثر و بیشتر نسوانی چیخیں اور کراہنے کی آوازیں آتی تھیں جیسے اندر کوئی نازک اندام دوشیزہ پر کوئی کوڑے برسا رہا ہو.....
آج کئی دنوں بعد خوابگاہ کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا تھا اُس کی داڑھی اور مونچھ بڑی بڑی ہوگئی تھیں۔جسم پر کپڑے کا نام ونشان نا تھا پورے جسم پر گھنے بال اُگ آئے تھے.....وہ اپنی بیوی کو دیکھ کر مسکرایا.....بیوی کے پیٹ کے اُبھار پر اُس نے اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور تھرائی ہوئی آواز میں کہا.....میں نے خوابگاہ کی ساری تصوریں چُور چُور کر ڈالی ہیں میرا وجود.....میری شناخت.....تمہارے پیٹ میں پل رہا ہے.....اور.....اور دوڑ کر اُس نے خوابگاہ کا دروازہ بند کر دیا۔

۔ بقیہ ۔ ''ہائے وہ لوگ''

خود دروازے میں تن کر کھڑا ہو گیا۔
اِبرے کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔
مجھے راستہ روکے کھڑا دیکھ کر اُس نے بید دیوار پر دے مارا۔
''میں اسے زندہ نہیں چھوڑونگا۔۔۔ اسکی یہ جرأت۔۔۔ ماسٹر صاحب۔۔۔''
میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
''لڑکا ہے۔۔نوجوان ہے۔۔۔بے سمجھ ہے۔۔۔اسے سبق مل گیا ہے۔۔''
ابرہ اچھلا، میرا بازو پکڑا اور مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر بازار میں لے آیا۔
''چلو۔۔۔میرے ساتھ ماسٹر صاحب کے گھر چلو۔''
وہ ماسٹر صاحب کے دروازے پر رک گیا۔اور میری طرف دیکھنے لگا۔۔۔اُسے دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔
میں نے دستک دی۔پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا۔
اُن کی نظر ابرے پر پڑی تو ان کا رنگ فق ہو گیا۔۔۔اُن کے گھٹنے لرزنے لگے اور جھک گئے۔
اِبرہ لپکا اور ماسٹر صاحب کے پیروں میں گر گیا۔وہ زاروقطار رو رہا تھا۔ماسٹر صاحب اور جھک گئے اور ابرے کو حیران و پریشان دیکھنے لگے۔
پھر انہوں نے ابرے کو اٹھایا اور گلے لگا لیا۔
ماسٹر صاحب کو میں نے پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تھا۔
حال سے چھٹکارا ممکن کہاں!۔۔۔مجھے پھر واپس اردگرد کی وحشی، پاگل جانور زندگی میں لوٹنا پڑا۔۔۔لیکن میری مایوسی اور ٹینشن میں خاصی کمی آ گئی تھی۔

۔ بقیہ ۔ ''زرد دائرہ''

یہ میری جنم جنم کی ساتھی جو ہوئی، اگر ہم زاد کے ذریعے مجھے اس کی آواز آتی ہے تو یہ کسی دشمن کی نہیں، دوست کی آواز ہے۔ یہ موت ہی ہے جو روز مرہ کی زندگی میں مجھے میانہ روی سکھاتی ہے، مجھے صراطِ مستقیم پر چلتے دیکھنا چاہتی ہے تا کہ میں بے راہ رو ہو کر بھٹک نہ جاؤں، سیدھا چلتا رہوں، ایک ازلی سچائی کی جانب، ایک ابدی خوشیوں بھری زندگی سے دائمی اتصال کی راہ پر''
''تمہاری بات سمجھنے کے لیے وقت درکار ہے'' فاخرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ہاں، لیکن آدمی کو ہمیشہ سے وقت کی کمی رہی ہے، یہ مت بھولنا''
میں نے جواباً کہا۔اور پھر ہم نے اپنے اپنے فون بند کر دیئے۔

۔ بقیہ ۔ ''ہمارا گشتی ادب''

ایک اور عاشق مزاج نے محبوب سے یکجہتی کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

مجھ کو آواز تو دے کر دیکھو میری جان
موت کو چھوڑ کے آ جاؤں گا

ایک رکشہ کے پینٹر اڈرائیور نے عوامی مسائل کی نمائندگی کا حق بھی ادا کر دیا۔اس کے ذوق اور حالات حاضرہ سے آگہی کی داد دیجیے۔کہتا ہے۔

بالآخر بلب روشن کر ہی دیں گے کے ایم سی والے
پر اس سے پہلے یہاں ایک حادثہ ہونا ضروری ہے

چند روز ہوئے، ایک دوست ہم سے ملنے گھر آئے۔جس وقت وہ ٹیکسی سے اتر رہے تھے اتفاق سے ٹھیک اسی وقت ہم گھر میں داخل ہو رہے تھے لہٰذا ان سے گیٹ ہی پر مڈبھیڑ ہو گئی۔ان کی ٹیکسی واپس جانے لگی تو ہمیں اس کے پیچھے ایک شعر نظر آیا جو اتنا عمدہ تھا کہ ہم نے ڈرائیور سے منٹ بھر رکنے کی درخواست کی تا کہ لکھ لیں ورنہ ذہن سے نکل جاتا۔شعر کیا تھا ایک ابدی حقیقت کو دو مصرعوں میں سمو دیا گیا تھا۔اسے پڑھیے اور سر دھنیے۔لکھا تھا۔

طے کر گئے آخر یونہی ہستی کا سفر بھی
دو چار کے پیچھے رہے دو چار کے آگے

مختصر یہ کہ کتابی ادب پر جمود ہو تو ہو، گشتی ادب شب و روز حرکت میں ہے۔اب ہم لوگ اس کی طرف توجہ ہی نہ دیں تو اس میں قصور ہمارا اپنا ہے۔یہاں تو اس کی صرف چند جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔اگر ادب کا کوئی جیالا یا متوالا اس پر بھرپور تحقیق کرے تو مکمل مقالہ تیار ہو سکتا ہے جو آج کل لکھے جانے والے بہت سے مقالوں سے معیار، مقدار اور مقصد میں کہیں آگے ہوگا۔

غبارِ وقت

شفیع ہمدم
(فیصل آباد)

میں ایک صنعتی شہر کے گورنمنٹ کالج میں اردو ادبیات کا استاد ہوں۔ شہر کے مشینی ماحول میکانکی رویوں کی وجہ سے میرا اپنے باطن سے رشتہ بہت کمزور پڑ گیا ہے۔ شہر کے شور وغل، دھویں اور تیز رفتاری کی وجہ سے میرے باطن پر شور، دھوئیں اور سیاہی نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ صنعتی شہر کے غل غباڑے، ملوں اور فیکٹریوں اور گاڑیوں کے دھوئیں اور بلند وبالا عمارات اور پلازوں کی وجہ سے میں فطرت سے کٹ کر رہ گیا ہوں۔ سورج نکلنے اور غروب ہونے کے حسین مناظر کو ترس رہا ہوں۔ شہری زندگی کی رفتار بہت تیز اور تنوع بے پناہ ہوتا ہے جبکہ دیہاتی زندگی کی رفتار فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ میں گزشتہ چھ سات سالوں سے شہر کی ہنگامہ خیز زندگی سے نکل کر اپنے دوست جبّار کے گاؤں چلا جاتا ہوں۔ یہ گاؤں شہر سے اسّی کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ پندرہ بیس روز قیام کے بعد واپس آ جاتا ہوں۔ دیہات میں گزارے ہوئے دن میرے اندر عجیب سے شکتی پیدا کر دیتے ہیں۔ گاؤں پہنچ کر میرا باطن سے ٹوٹا ہوا رشتہ خود بخود استوار ہو جاتا ہے۔ اس سال موسم گرما کی چھٹیاں ہوئیں تو میں نے جبّار کے گاؤں جانے کا پروگرام بنایا۔ گاؤں میں جبّار میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور نہایت گرم جوشی سے معانقہ کیا۔ گاؤں پہنچ کر مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں فطرت کی آغوش میں پہنچ گیا ہوں۔ چاروں طرف ہوا کے دوش پر لہلہاتے کھیت، مستی میں جھومتے ہوئے گھنے سایہ دار درخت، ٹیوب ویل میں نہاتے اور چھینٹے اڑاتے بچے اور پانی بھرتی مٹیاریں، ایسے مناظر شہروں میں کہاں ملتے ہیں۔ گاؤں میں مجھے فطرت سے مصافحہ اور معانقہ کرنے کے بے شمار مواقع ملتے ہیں۔ شام کے وقت اکثر جبّار اور میں ندی کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ جس کے دونوں طرف درخت کھڑے ہوتے ہیں۔ گنگناتی اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ندی کا پانی خراماں خراماں بہے چلا جاتا ہے۔ ہم دونوں ندی کے کنارے دور تک چلے جاتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو ندی کے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ بھی سادہ، پرخلوص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ جبکہ شہروں میں لوگ منافقت، عداوت اور ریاکاری جیسی علتوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ میں یہاں ہر روز طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کا منظر دیکھتا ہوں۔ یہاں پر غل غپاڑہ نام کو نہیں۔ یہاں پتّا بھی کھڑکے تو آواز سنائی دیتی ہے۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ دور سے بانسری کی مدھر آواز جب کانوں میں پڑتی ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے سارا ماحول گنگنا رہا ہو اور پیڑ رقص کر رہے ہوں۔

ایک روز شام کے وقت میں گاؤں کی کچی سڑک پر جا رہا تھا سامنے سے ایک خمیدہ کمر بڑھیا آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ دفعتاً اس نے ٹھوکر کھائی۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ میں نے لپک کر اسے تھام لیا۔ وہ دعاؤں کے ڈھیروں پھول مجھ پر نچھاور کرتی ہوئی پھر سے سنبھل کر چلنے لگی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا آدمی کھڑا ہوا تھا جسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ تین سال پہلے وہ شہر کے ہائی اسکول میں تعلیمی خدمات انجام دیتا رہا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گاؤں میں مستقل طور پر آ گیا تھا۔ اس سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اسے اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ رائٹر تو نہیں تھا مگر اردو ادب کا مطالعہ وسیع تھا۔ اسے افسانے، خاکے، انشائیے، ناول اور سفر ناموں سے بڑی رغبت تھی۔ شاعری کا شوق بھی فزوں تر تھا۔ جدید اور قدیم شعرا کا کلام اسے زبانی یاد تھا۔ جب بڑھیا چلی گئی تو وہ میرے قریب آ کر بولا ''آپ نے جس بڑھیا کو سہارا دے کر گرنے سے بچایا تھا کیا آپ اسے جانتے ہیں''۔ ''بالکل نہیں وہ گرنے لگی تو میں نے لپک کر اسے سہارا دیا تو وہ گرنے سے بچ گئی ورنہ بہت چوٹیں آتیں بے چاری کو''۔

''آیئے میں اسی کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہوں۔ یہاں نہیں آپ میرے غریب خانے پر تشریف لایئے وہاں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے''۔ اس کا گھر قریب ہی تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر ایک صوفے پر بٹھانے کے بعد میرے منع کرنے کے باوجود یہ کہہ کر اندر چائے کا کہنے چلا گیا کہ ''آپ پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہیں چائے تو ضرور پینا پڑے گی'' اس کی غیر موجودگی میں میں اس کے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے اس ڈرائنگ روم میں شہری اور دیہاتی زندگی کا حسین امتزاج نظر آیا۔ ڈرائنگ روم خاصا کشادہ تھا۔ فرش پر درمیانی قیمت کا پھولوں والا قالین بچھا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک طرف جدید طرز کے صوفے اور دوسری طرف دیہاتی قسم کی کرسیاں تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں تپائی پر ایک چھوٹا سا خوبصورت گھڑا رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ہرنی، ہاتھی اور بارہ سنگھے کے مجسمے براجمان تھے۔ کمرے کی دیواروں پر پینٹ کیا ہوا تھا۔ کمرے کی ایک دیوار پر رنگ برنگے رنگوں سے بنی ہوئی خوبصورت چھنگیر استادہ تھی۔ دوسری دیوار پر خوبصورت پینٹنگ سجی ہوئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم شہری اور دیہاتی زندگی کی بھرپور نمائندگی کر رہا تھا۔

میں اس شخص کی جمالیاتی ذوق کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اتنے میں وہ چائے اور کھانے پینے کی چیزیں پلیٹوں میں سجا کر لایا تو میں نے کہا ''آپ نے تو بہت تکلیف کی، ان اشیاء کی ضرورت نہ تھی صرف چائے کا ایک کپ ہی کافی تھا''۔ ''آپ پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہیں آپ کی خدمت کرنا

میرا فرض بنتا ہے''۔اس نے پھر پہلے والا جملہ دہرایا۔ہم دونوں چائے پینے میں مصروف ہوگئے۔وہ میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔پلیٹوں میں پڑی ہوئی اشیاء مجھے اٹھا کر دیتا اور پُر زور اصرار سے کھلاتا۔اس نے مجھے اتنا کھلا دیا کہ رات کے کھانے کی حاجت نہ رہی۔چائے سے فارغ ہو کر وہ بولا۔''جس بوڑھی عورت کو آپ نے سہارا دیا تھا وہ جوانی میں بے حد حسین و جمیل تھی۔''اس کی آنکھیں غزالانِ دشت جیسی،اس کے رخساروں پر جگنو رقص کناں تھے''

''آپ تو بہت مشکل اردو بول رہے ہیں،ذرا آسان اردو بولیئے''

ہمدم صاحب آپ اردو ادبیات کے پروفیسر ہیں۔اس قسم کے ادبی جملے آپ کے سامنے نہیں بولوں گا تو کیا دتّو موچی اور فجے نائی کے سامنے بولوں گا۔دتّو موچی اس گاؤں کا واحد موچی تھا جو لوگوں کے جوتے مرمت کر کے اپنی روزی کماتا تھا۔اس دفعہ میں نے بھی اس سے اپنی چپل مرمت کروائی تھی۔پیسے پوچھے تو وہ بولا''بابو جی آپ اس گاؤں کے مہمان ہیں ہم مہمانوں سے پیسے نہیں لیا کرتے''۔فجا نائی کی گاؤں میں دکان ہے۔وہ گھروں میں بھی چلا جاتا تھا۔میں نے جب پہلے روز اس سے شیو بنوائی تو اس نے پیسے نہیں لیے اور بولا پھر آؤ گے تو پیسے لے لوں گا۔وہ بھی مجھ سے کم پیسے لیتا تھا مگر میں زبردستی اس کی میز پر پورے پیسے رکھ کر آجایا کرتا تھا۔وہ پھر بولنے لگا۔اس کی زلفیں کالی گھٹا کی مانند تھیں،اس کے ہونٹوں کا رنگ گلابی تھا،اس کا چہرہ نودیدہ گلاب کی مانند تھا،اس کے دندان کی اتنی چمک تھی کہ دُرِ خوش آب میں بھی ایسی چمک مفقود تھی۔غرضیکہ اس پر ٹوٹ کر شباب آیا تھا۔اس کی آواز میں اس قدر لوچ تھا کہ جیسے مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔اس کے بوٹے سے قد میں اتنی کشش تھی کہ اسے دیکھ کر سرو بھی شرم سے سرنگوں ہو جاتے تھے۔جوانی کے خمار میں جب وہ چلتی تو اس کی پتلی کمر اس انداز میں بل کھاتی کہ دیکھنے والوں کے دل دھک دھک کرنے لگتے تھے۔غمزہ و دل ستاں اور عشوہ گری اس کے حسن پر نور کو اور بھی پُرکشش بنا دیتے تھے۔اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے گاؤں کے اکثر نوجوان اس کی راہ تکا کرتے تھے۔

''حبیب صاحب آپ بھی اس کی زلف کے ضرور اسیر رہے ہوں گے''۔''نہیں میں اس وقت سات آٹھ سال کا تھا اور اس کی عمر اٹھارہ انیس تھی مگر وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔کئی مرتبہ اس نے مجھ سے سودا سلف منگوایا تھا۔مجھے اس کا کام کرتے ہوئے عجیب سے خوشی ہوتی تھی۔'' گاؤں کے نوجوان اس کی طرف جملے بھی اچھالتے ہوں گے اور چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہوں گے۔''نہیں وہ بہت گھمنڈی تھی۔اسے اپنے حسن و جوانی پر بڑا ناز تھا۔گاؤں کی معمولی شکل وصورت کی لڑکی کو تو وہ لفٹ دینا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔اس کی سہیلیاں بھی بہت خوبصورت تھیں مگر حسن میں اسکا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنی کسی سہیلی کو ڈانٹ بھی دیا کرتی تھی مگر وہ برا منانے کی بجائے ہنس دیا کرتی تھی۔دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کا نمبردار بہت شریف آدمی تھا۔وہ نوجوانوں کی اس قسم کی حرکات پر انہیں سخت سزائیں دیتا تھا۔اب اس کا بیٹا اس کی جگہ پر نمبردار ہے وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے''۔''اس کی شادی کہاں ہوئی تھی؟''۔ساتھ والے گاؤں میں اس کی شادی ہوئی تھی مگر اس کی اپنے خاوند اور سسرال والوں سے نہ بن سکی۔وہ حسن و جوانی کے نشے میں اس قدر چُور تھی کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔وہ اپنے خاوند اور ساس سے بدتمیزی سے پیش آتی تھی۔ایک تو حسن و جوانی کا خمار دوسرے اس کا تعلق خوشحال گھرانے سے تھا۔چنانچہ چند ماہ کے بعد لڑ جھگڑ کر اپنے گھر آگئی۔اس کے سسرال والے اسے منا کر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے۔اس کے والدین نے بھی اسے بڑا سمجھایا اور جانے پر زور دیا مگر اس نے کسی کی بھی نہ مانی اور ان کے ساتھ جانے کے لیے رضامند نہ ہوئی۔وہ بھی کھاتے پیتے لوگ تھے اسے طلاق دے کر لڑکے کی شادی کہیں اور کر دی گئی۔جوانی اور حسن کے نشے نے اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔جب جسم و جان پر وقت کا غبار جمنے لگا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔اب افسوس کرنے کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔وقت کا چیتا انسان کو کتنا تبدیل کر دیتا ہے۔وقت کی دھول جب جسم و جان پر جم جاتی ہے تو شکل و شباہت اتنی بدل جاتی ہے کہ ماضی کے نقوش تلاش کرنا مشکل ہو جاتے ہیں۔وہ چہرہ جو نوجوانوں کا مرکزِ نگاہ تھا اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ پہروں انتظار کیا کرتے تھے اب کوئی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔

میزبان سے واپسی کی اجازت طلب کرتے ،ڈرائنگ روم میں سجے قدِ آدم سنگھار میز کے آئینے میں اپنے عکس پر نظر پڑی تو وہ مجھے بہت اجنبی اور انجانا لگا۔کوشش کے باوجود،اپنے سراپے کو نظر بھر کر دیکھنے کے بجائے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل آیا۔

''LOVE CITY''

محبت کی لازوال یادگار''تاج محل'' سے متاثر ہو کر''تاج عربیہ'' کے نام سے دبئی میں ایک ارب ڈالر صرف کر کے تاج محل سے مشابہہ عمارت تیار کی جا رہی ہے۔عمارت میں تین سو کمروں کی تعمیر کا منصوبہ بھی شامل ہے جو شادی بیاہ کی تقریبات کے لیے استعمال میں لائی جائیں گی۔یہ منصوبہ تاج محل سے بڑا ہونے کا امکان ہے جس میں اہرام مصر،دیوارِ چین اور ایفل ٹاور سے مماثل عمارات کے علاوہ وسیع باغات کا پروگرام بھی ہے۔تاج عربیہ ۲۰۱۴ء تک مکمل ہونے کا امکان ہے۔

○

"We have No choice"

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

"اُس کا مطلب ہے کہ تم نے آخری فیصلہ کر ہی لیا!" "اوں، آں، ہاں" شانوں تک بکھری گھنی سیاہ زلفوں غزّال آنکھوں سے لمحہ بھر کو بے مروتی برتتے ہوئے ہمارے منہ سے ناموس اور غیر یقینی آوازیں سن کر کمان دار ابرو مزید تن گئے۔ "یہ اوں، آں کیا کر رہے ہو، صاف صاف بتلاؤ ارادہ تو نہیں بدل گیا!" لہجے کی کاٹ اور پہلو بدلنے سے ناگواری کا بہ خوبی اندازہ لگاتے ہوئے "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" اب کی بار اُس نے شوخ نظروں سے ہمارے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے قدرے اٹھلا کر کہا "سوچ لو!" ہم نے بھی دوٹوک انداز میں جواب دیا "سوچنے سمجھنے کے بعد ہی ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ اب اگر مگر کے چکّر میں الجھا کر ہمیں مزید کمزور یا بودہ کرنے کی ضرورت نہیں البتہ! یہ بتلانا ضروری ہے کہ زادِراہ کے طور پر کیا کچھ ساتھ ہونا چاہیے!"

"زادِراہ" یہ لفظ ادا کرتے ہوئے اُس کی زبان کافی دیر تالو کو چھوتی رہی۔ شاید لفظ زادِراہ اُس کے لیے نامانوس یا ہمارے دریافت کرنے کا انداز ناپسندیدہ تھا۔ "تمہارے خیال میں کیا کچھ ہونا چاہیے؟" کچھ دیر گومگو کی کیفیت میں سر کھجانے کے بعد "یہ تو سفر کی نوعیت اور دورانیے سے آگاہی کے بعد ہی بتلایا جا سکتا ہے" "میں اگر کہوں کہ یہ سفر صدیوں پر محیط ہو سکتا ہے تو!" یہ لفظ کچھ اس انداز میں ہاتھ پیر کی حرکت اور آنکھوں کی جنبش کے ساتھ ادا کیا گیا کہ جسم میں پھریری سی آ گئی۔ "صدیوں!" صورت حال کو بھانپتے ہوئے "تم چاہو تو پلک جھپکنے میں واپسی کی راہ لی جا سکتی ہے" ہم نے بھی زبان سے کچھ کہنے کے بجائے شانے اچکا کر بے بسی کا اظہار کیا تو اس نے جلترنگی قہقہہ لگاتے ہوئے "اچھا چھوڑو! اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو اور سب باتوں سے بے فکر ہو جاؤ" بظاہر موصوفہ نے سب باتوں سے بے فکر ہونے کا جملہ بڑی سادگی سے ادا کیا مگر محترمہ کے مبہم اندازِ گفتگو کے حوالے سے بے فکری ہمارے بس میں نہ تھی۔ صورت حال کی نزاکت کو کسی قدر انجوائے کرتے ہوئے اُس نے ہمارے ہاتھ پر دباؤ بڑھاتے ہوئے خاموشی کا سبب دریافت کیا تو ہم بمشکل پروین شاکر کا شعر گنگنا سکے۔

اُس نے تپتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک پھیل گئی تاثیر مسیحائی کی

پہلا پڑاؤ

سفر کے دورانیئے اور منزل کی بابت وثوق سے کچھ کہنا ہمارے لیے مشکل تھا گرد و پیش بھی کچھ مانوس کچھ نامانوس لگتا تھا۔ یہ جگہ کسی زمانے میں جنت کا نمونہ رہی ہوگی۔ یہاں کے درخت پھول پودے حتیٰ کہ گھاس بھی خاص طرح کی تاثیر کی حامل لگ رہی تھی ہماری خواہش تھی کہ دم بھر کو یہاں ٹھہر کر اس روح پرور منظر کو دل و دماغ میں محفوظ کر لیں۔ اچانک ہمارے کانوں میں مختلف زاویوں سے وہی آواز گونجنے لگی جس کی تکرار سے گھبرا کر ہم نے فرار کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہماری اُڑی اُڑی رنگت دیکھ کر ساتھی نے کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں بہت جلد ہم اس آواز کی پہنچ سے دور ہو جائیں گے"

یہ ایک دیہی علاقہ تھا جہاں تھوڑے فاصلے سے کچے پکے، شکستہ اور آفت زدہ مکانوں کے بیچ کچھ روح پرور بلند و بالا عمارات بھی نظر آ رہی تھیں۔ انہیں میں سے ایک عمارت کے در و دیوار سے آگ کے شعلے اور دھواں بڑی مقدار میں خارج ہو رہا تھا۔ چاروں طرف چیخ و پکار اور ماتم کی کیفیت طاری تھی۔ لوگ باگ گروہوں میں بٹ کر اپنی مدد آپ کے تحت امدادی کام سرانجام دے رہے تھے۔ کچھ لوگ گھڑوں، بالٹیوں اور مشکوں کی مدد سے آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے، ننھے ننھے معصوم زخمی بچوں اور کچھ اُن کی لاشوں کو ہاتھوں، جھولیوں، چادروں اور چارپائیوں پر لا رہے تھے۔ ہر طرف بے بسی اور لاچارگی کا بے رحم رقص جاری تھا۔ سرکاری مشینری یا اہل کار کا، دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ لوگ باگ اپنی زبان میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر، جھولیاں پھیلا کر نامانوس دشمن کو دل کھول کر بددعائیں دے رہے تھے۔ اُن کی گفتگو میں ایک لفظ "ڈرون" کثرت سے استعمال ہو رہا تھا وہی ہماری سمجھ میں آ سکا۔ مگر انسانیت کی اس ناواجب تذلیل کا جواز سمجھنے سے ہم قاصر تھے۔

دوسرا پڑاؤ

یہ دھواں دھواں چہرے، یہ سنسان گلیاں، یہ ویران بازار اور یہ شکستہ عمارتیں طوفان کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اب یہاں خبر تب بنتی ہے جب گولی نہیں چلتی، دھماکے نہیں ہوتے یا لاشے نہیں گرتے۔ یہ بازار اس وقت جہاں قیامتِ صغریٰ کا منظر برپا ہے اگر اس تاریخی شہر کا دل گردانا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس بازار کی رونق، قصّے، کہانیاں اور تہذیب تاریخ کے اوراق میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ دُور دراز سے آنے والے مسافر، سوداگر اور سیّاح تجارت سے زیادہ اس شہر کی محفلوں، چوپالوں، سرائے، قہوہ خانوں کے علاوہ شاعروں، مصوّروں، مغنّیوں اور ہنرمندوں کی شہرت سن کر طرح طرح کے ارمان سجائے یہاں کا رُخ کرتے اور جب ان محفلوں، مجلسوں اور چوپالوں سے سیر ہو جاتے تو تجارت کی جانب رُخ کرتے۔ اس شہر کے دریا دل لوگ آنے والے مہمانوں کا اس باب میں بھی فراخ دلی سے ہاتھ بٹاتے۔ اب مگر اس شہر کی قسمت میں روز لٹنا اور روز بسنا ٹھہر گیا ہے۔ آئے دن کی دہشت گردی کے باعث اوّل تو بازار کھلنا ہی بھیانک

خواب بن کر رہ گیا ہے۔ مگر جب گھروں میں چولہے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور معصوم بچے بھوک سے بلبلانے لگتے ہیں تو یہاں کے جی دار محنت کش جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آتے ہیں۔ پھر سے کوئی گمراہ یا نافہم اپنی مہم پر نکل پڑتا ہے اور آج کی طرح اس بازار میں پھر سے انسانوں کے چیتھڑے اُڑنے لگتے ہیں، پھر سے معصوم بچے اور خواتین روئی کے گالے بنا دئے جاتے ہیں۔ مارنے والے کو مرنے والوں کے مذہب، عقیدے اور شناخت سے قطع نظر سب سے اہم مشن کی تکمیل ہے جس کے بعد ایک خیالی تصور اُس کی راہ دیکھ رہا ہے۔

تیسرا پڑاؤ

اس وقت جس شہر سے ہمارا گزر ہے یہ دنیا کے قدیم مذاہب، تاریخ اور تہذیب کا امین شہر ہے۔ یہاں کے دستکار ایک زمانے میں اس خطے کا قیمتی اثاثہ تصور کیے جاتے تھے۔ کیا معمار، کیا خطاط، کیا سنگ تراش، کیا ہنر مند، کیا دستکار سب کی چہار دانگ دھوم تھی۔ اس شہر کی وجہ شہرت اس کا قدیم قبرستان بھی ہے جہاں دنیا کے کونے کونے سے آئے مہم جو ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اُن کی آخری آرام گاہوں کے سرہانے لگے قیمتی اور منقش کتبوں سے ماضی میں اُن کی حیثیت و مرتبے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس شہر سے خطے کے لوگوں کی عقیدت کا سبب ایک اور بڑی قبر ہے جس میں اپنے وقت کے نامور صوفی بزرگ آرام فرما ہیں۔ آپ کی وسیع المشربی اور روحانی فیضان کے قصّوں سے کتب خانے بھر چکے ہیں۔ اس قبرستان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس شہر کے لوگ اکثر روزمرّہ کی بھاگ دوڑ سے اکتا جاتے ہیں تو یہاں کا رُخ کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ قبرستان نہیں روئے زمین پر جنت کا نشان ہے۔ روحانی بزرگ کی مستقل آرام گاہ کے باعث یہاں کی ہر چیز زندگی سے سرشار ہے۔ کچھ کے خیال میں یہاں کے خاموش مکیں روزمرہ آنے والوں سے راز و نیاز بھی کرتے ہیں۔ کچھ کے خیال میں یہاں کے پھول، پودے اور درخت بھی حسّاس دلوں کے روح کی تازگی کا سامان کیا کرتے ہیں۔ آج مگر یہ مرجع خلائق لہولہو کر دیا گیا ہے۔

شہر کے معروف سیاستدان کو عرصے سے دھمکیاں مل رہی تھیں جنہیں آج عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی اُس کے دشمنوں کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو آخری رسومات ادا کرنے والوں کو خون میں نہلا کر سارے شہر کو دہشت میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ وہ جو کبھی حاجت روا بن کر صوفی بزرگ کی قدم بوسی کے لیے آتے تھے، وہ جن کے دلوں میں خاموش مکینوں سے گفتگو کی آرزو سر ابھارتی تھی، وہ جن کو یہاں کے پھول پودوں سے راز و نیاز کی خواہش ستاتی تھی، اُن سب بے گناہوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا ہے۔ اس وحشت و بربریت کے بعد خدا معلوم کوئی ذی روح اس طرف کا رُخ کرنے کی جرأت کر سکے گا کہ نہیں!

چوتھا پڑاؤ

یہ بستی خدا معلوم پہلے گاؤں تھی، قصبہ یا شہر، اب ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ چہار جانب انسانی جسموں کا ساکت و غیر ساکت انبار مالِ غنیمت کی طرح بکھرا ہوا ہے۔ لاتعداد زندگی کو خیر باد کہہ کر پیچھے رہ جانے والوں کو زندہ در گور کر گئے ہیں اور جو زندگی سے نبرد آزما ہیں وہ اپنوں کی چھاتی کا بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔ زندگی کے نشان ملیامیٹ ہو چکے ہیں۔ خوراک، پانی، ادویہ یا امداد کے دُور دُور تک آثار نہیں۔ قیامت کا بازار تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کھلے بندوں سجا ہوا ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زخموں سے چُور لوگ اپنے پیاروں کو پکار رہے ہیں، بین کر رہے ہیں۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر حوصلہ ہار جاتے ہیں اور پروردگار کی جانب رُخ کر کے رحمت کی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس سانحے کی شدت سے ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں اور اپنے پروردگار سے شکوہ کناں ہیں۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ اس کڑے وقت میں ٹھنڈی چھاؤں بن کر ان کے دکھ درد کا مداوا کریں کہ اچانک ایک سوٹڈ بوٹڈ زخموں سے چُور شخص دبیز شیشوں کی چکنا چور عینک کو درست کرتے ہوئے آہستہ آہستہ قدموں سے چل کر اُس شخص کے نزدیک ہو جاتا ہے۔

''میرے خاندان کے ایک دو نہیں کئی درجن لوگ پلک جھپکتے میں جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے مگر میں تمہاری طرح اپنے پروردگار سے شکوہ کا ایک لفظ تک زبان پر نہیں لایا۔ جانتے ہو کیوں؟ یہ تباہی اور بربادی خالق دو جہاں نہیں بلکہ خدساختہ ناخدا کا کھیل ہے'' شکستہ شخص حیرت سے نووارد کو دیکھتے ہوئے ''کھیل ہے؟'' ''ہاں کھیل ہے! اُس کے لیے ساری دنیا ایک کھلونا ہے اور جب تک وہ اس کھلونے کو تباہ نہیں کر دیتا چین سے نہیں بیٹھے گا''۔ شکستہ شخص حیرت واستعجاب سے منہ کھولتے ہوئے ''کسی انسان کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے؟'' ''ممکن ہے تبھی (شخص مذکور کو قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے) یہاں سے ہزاروں میل دور ہارپ ٹیکنالوجی سے ایک سو اسّی مائیکرو انٹیناز کے ذریعے تین گیگا بائٹ انرجی حاصل کی جاتی ہے اور اس انرجی کو INNOSPHERE کے نظام میں ڈال کر ہمارے ہاں زلزے، سیلاب کئی طرح کی تباہی و بربادی پھیلائی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ تیسری دنیا کے کئی ملکوں تک دراز ہے'' مذکورہ شخص کانپتے ہوئے دھیمی آواز میں دریافت کرتا ہے ''ان تمام باتوں کا مقصد؟'' ''ہماری طاقت اور معیشت کی تباہی!''

پانچواں پڑاؤ

یہ شہر کسی زمانے میں روشنیوں اور رنگوں کا شہر کہلاتا تھا۔ یہاں کی صنعت و حرفت ملک کی نصف آبادی کو وسائل مہیا کرتی تھی۔ یہ شہر وسیع القلبی اور وسیع المشربی کے حوالے سے اس خطے کا نمونہ گردانا جاتا تھا۔ اس شہر کو لوگ چھوٹے ملک کا لقب دے چکے تھے۔ اس شہر کے دروازے ہر موسم اور ماحول میں بلا رنگ و نسل سب کے لیے وا تھے۔ ملک کے دُور دراز اور پسماندہ علاقوں کے مکیں بھی اپنا گھر بار اور آل و عیال چھوڑ کر بلا خوف و خطر رزق کی تلاش میں یہاں چلے آتے۔ یہ ایک غریب پرور شہر تھا جہاں نہ کوئی بھوکا سوتا نہ کوئی بے

لباس نظر آتا تھا۔لوگوں کے چہروں کی رونق اس شہر کی خوشحالی کا پتہ دیتی تھی۔ نامعلوم اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی یا اس کے حکمرانوں کی نیت میں فتور آ گیا کہ نہایت بے آواز طریق پر ایک سے ایک نئے آسیب اس شہر کو اپنی لپیٹ میں لیتے گئے۔ پہلے لسانی عصبیت نے سر ابھارا، پھر علاقائی فتنے نے جنم لیا، پھر مذہبی تنازعات نے گرفت مضبوط کی اور اس شہر کے چراغوں کو بڑی تیزی سے گل کر دیا، یہ شہر اب شہر نہیں انسانوں کا ایک ایسا جنگل بن چکا ہے کہ جہاں کے گلی کوچوں سے دن رات نوجوان لاشے اُٹھ رہے ہیں،لوگوں کا اثاثہ لُٹ رہا ہے، صنعتیں بند ہو رہی ہیں، بے روزگاری بڑھ رہی ہے، لوگ ذہنی و جسمانی عوارض کا شکار ہو رہے ہیں مگر کوئی ان کی فریاد سننے پر آمادہ نہیں، کوئی اُن کی دادرسی کے لیے آگے نہیں آتا، کوئی ان کی مدد نہیں کرتا۔ چوری، ڈاکے اور بندوق کی نوک پر دن دہاڑے لٹنا، روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ بچے کھچے صنعتی اور کاروباری اداروں سے بھتّہ خوری سب سے منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔ جب سے حکومتی کارپردازوں نے سماج دشمن عناصر سے ناجائز کمائی میں حصہ داری کے لیے گٹھ جوڑ کی ہے تب سے عوام کی امیدوں کا جنازہ اٹھ گیا ہے۔اب ہر روز مختلف بازار، مارکیٹس اور انجمن کے لوگ رضا کارانہ بھتّہ جمع کر کے از خود سماج دشمن عناصر کو پہنچا رہے ہیں اور آنے والے طوفان سے قطعی بے خبر زندگی کی گاڑی کو دھکا دیے جاتے ہیں۔

چھٹا پڑاؤ

اس شہر کی بنیاد قریب ڈیڑھ صدی قبل ایک انگریز کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔عرصے تک اُسی انگریز کے نام سے یہ شہر موسوم رہا۔ازاں بعد ایک برادر ملک کے سربراہ کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ ابتدا میں یہاں گھریلو صنعت کا فروغ ہوا۔ یہاں کے محنت کشوں کی ہمت، لگن اور ہنرمندی نے آہستہ آہستہ اس شہر کو ایک بڑے صنعتی زون میں تبدیل کر دیا۔اس شہر کی تیز رفتار ترقی اور معیاری مصنوعات کے باعث ایک ترقی یافتہ ملک نے اپنے جدید صنعتی شہر کو اس شہر کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے انہیں جڑواں شہر کا اعزاز دیا۔اس شہر کی تیز رفتار ترقی نے گردو پیش کے گاؤں، گوٹھ، دیہات اور قصبات تک روزگار کے دروازے کھول دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے چہروں پر رونق اور گھر بار آباد نظر آنے لگے۔

گذرے چند برسوں میں اس شہر کی ترقی خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔ یہ شہر آج کل ویران اور سنسان نظر آتا ہے۔ بجلی اور گیس کی طویل لوڈ شیڈنگ نے بے شمار صنعتوں کو ٹھپ کر دیا ہے اور بہت سے صنعتکار اپنے اداروں کو سمیٹ کر پڑوسی ملکوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ جو شہر کسی زمانے میں اپنی خوشحالی اور خوش خوراکی کے لیے مشہور تھا آج وہاں بھوک، ننگ، خودسوزی اور خودکشی عام ہے۔

شہر کے بیچوں بیچ چوک میں تنہا بیٹھی سوگوار عورت کا شوہر اپنے بچوں کی بھوک سے گھبرا کر خودکشی پر آمادہ ہوا۔ یہ بے بس و بے کس عورت آنے والے اندیشوں کا تنہا شکار نہیں اُس کے ساتھ بیٹھے تینوں بچوں کے سُتے ہوئے چہرے بھی اُن کی پریشانی کو عیاں کر رہے ہیں۔ ان پریشاں حالوں کا شمار بھی کبھی خوشحال ماں باپ کے بچوں میں ہوتا تھا۔ یہ بھی کبھی گلے میں بستہ ڈال کر مستقبل کے سہانے گیت گاتے اسکول کی جانب رواں دواں نظر آتے تھے۔ان کے گھر کا چولہا بھی طرح طرح کے کھانوں اور پکوانوں سے دہکتا، مہکتا تھا۔ آج ان کی سگی ماں بیکاری، بے روزگاری، بھوک اور بدحالی کے ہاتھوں اس قدر عاجز آ چکی ہے کہ اپنے جگر گوشوں کو بے مول فروخت کرنے پر آمادہ ہے۔ یہ اپنی کوکھ کے ان ننھے غنچوں کے عوض زر و جواہر یا مال و دولت کے انبار طلب نہیں کر رہی، نہ حیثیت و عزت کی خواہش مند ہے، یہ فقط دو وقت کی روٹی اور دو گز کپڑے کے وعدے پر اپنے معصوم جگر گوشوں کو کسی بھی اجنبی کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہے۔اُس کے بعد اُس پر کیا بیتے گی یا ان بچوں کا مستقبل کیا ہوگا یہ نہ مجبور مامتا کی ماری ماں جانتی ہے اور نہ یہ لاچار بچے!

ساتواں پڑاؤ

اس شہر کے لوگوں کی کثیر تعداد ایک شاہراہ سے دوسری شاہراہ کی جانب مڑتے ہوئے ایک خاص علاقے کی جانب بڑھ رہی ہے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے احتجاجی کتبے اور پلے کارڈ نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں۔ ان کتبوں اور پلے کارڈ پر جس شخص کی تصویر نمایاں ہے اس سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔ یہ ملک کے مختلف اخباروں اور چینلز پر تقریری مقابلوں، مباحثوں اور تقاریب کی صدارت کرتے نظر آتا ہے۔اس شخص کو بطور مصلح اور سماجی کارکن اندرون اور بیرون ملک نیک شہرت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ یہ شخص علم و حکمت کا ایک ذاتی ادارہ بھی چلاتا ہے جس کی آمدن سے ملک کے بہت سے شہروں میں مستحق اور نادار طلبہ کے لیے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔تعلیم کے دوران مفت خوراک، رہائش، لباس اور کتب فراہم کرنا بھی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ اس ادارے سے بے شمار بچے تعلیم حاصل کر کے مفید خدمات انجام دے رہے ہیں اور ادارے کی نیک نامی کا باعث بننے کے ساتھ اُس کے فروغ میں بھی ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

گذشتہ کچھ عرصے سے سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں کی جانب سے اس شخص کو حیلے بہانوں سے تنگ کیا جاتا تھا یعنی اُس کی نیک کمائی سے بھاری رقم کا مطالبہ کیا جا رہا تھا جسے شخص مذکور مستحق بچوں کا حق گردان کر دینے سے منکر تھا۔ ایک طرف اُن کی انا، دوسری طرف ہوس اور تیسری جانب اُن کی دہشت کے لیے یہ شخص خطرے کی علامت بنتا جا رہا تھا۔ لہٰذا ایک دن اچانک وہ شخص گھر اور دفتر کے درمیان سے اغواء کر لیا گیا۔ بدلے میں تاوان کی اس قدر بڑی رقم طلب کی گئی کہ مقررہ وقت میں اُس شخص کے اہلِ خانہ، احباب اور ملک کے دردمند لوگ اُس کا بندوبست نہ کر سکے تو ایک دن اُس نیک انسان کو بے دردی سے قتل کر کے بوری میں بند اُس کی لاش گھر پہنچا دی گئی۔ یہ شہر جو عرصے سے خوف

ودہشت کے سائے میں پل رہا تھا اس قدر بڑے ظلم پر خاموش نہ رہ سکا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس شہر کے لوگوں کا غم و غصہ اور احتجاج کب تلک موت کے سوداگروں کو للکار سکے گا!

آٹھواں پڑاؤ

اس پڑاؤ پر بڑی خاموشی، سراسیمگی اور پُر اسراریت پائی جاتی ہے۔ ہم اس خاموشی، سراسیمگی اور پراسراریت کا راز جاننے کے لیے سوالیہ انداز میں ہمراہی کی جانب دیکھتے ہیں تو وہ اُنگلی کے اشارے سے ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد چند بندوق بردار کرخت چہروں پر خشخشی داڑھی اور سر پر بھاری پگڑی سجائے تین نوخیز لڑکیوں اور ایک ادھیڑ عمر عورت کو رگید کر لاتے ہیں جن کے ہاتھوں میں رسّیاں اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ حوّا کی چاروں بیٹیاں تمام تر عاجزی، انکساری اور رقّت کو بروئے کار لاتے ہوئے قوی الجثہ بزرگ کے قدموں میں گر کر جاں بخشی کی بھیک مانگ رہی ہیں۔ شخص مذکور باریش اور بزرگ ہونے کے باوجود اُن کی مِنت سماجت کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے ٹھوکر مار کر کہتا ہے ''لے جاؤ ان بدبختوں کو میرے سامنے سے، یہ عورتیں نہیں بے حیائی کی چلتی پھرتی مشینیں ہیں، پہلے اُنہوں نے ہمارے قبیلے کے رواج کو توڑ کر چپکے چپکے تعلیم حاصل کی اور اب پسند کی شادی کے خواب دیکھنے لگیں، اس بدکاری میں کوئی اور نہیں'' بزرگ خاتون کو ٹھوکر مارتے ہوئے ''یہ، ان کی سگی ماں، جسے بھرجائی کہتے ہماری زبان نہ تھکتی تھی، یہ بھی ان کے جرم میں برابر کی شریک ہے حالانکہ پچھلے برس اسی جرم کی پاداش میں اس کی دو بھتیجیاں کاری قرار دے کر قتل کر دی گئی تھیں'' آواز کی شناخت کے بعد بزرگ خاتون سردار کے قدموں میں سر رکھ کر گڑگڑاتی ہے ''بھائی صاحب آپ کو اللہ کا واسطہ، آپ کو پیارے رسول کا واسطہ، آپ کو پنجتن پاک کا واسطہ، جس طرح چاہو آپ میری جان لے لو، ان بچیوں کو بخش دو، یہ معصوم ہیں، بے قصور ہیں، بے آسرا ہیں'' سردار پر بزرگ خاتون کی آہ و زاری کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے خواتین کو خود سے دُور لے جانے کا اشارہ کرتا ہے۔

چند ساعتوں کے بعد ٹھک پک کی گونج میں بارود کی بُو نتھنوں کو آلودہ کرنے لگتی ہے، فضا میں کئی گھٹی گھٹی چیخیں ایک ساتھ سنائی دیتی ہیں۔ چاروں تڑپتے زندہ لاشے گہرے گڑھے میں دھکیل کر منوں مٹی ڈال دی جاتی ہے اور روایتی شیطانی رقص شروع ہو جاتا ہے جس کے بعد بزرگ کی معیت میں تمام لوگ چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے اندھیرے میں ایسے گم ہو جاتے ہیں جیسے کنوئیں میں مینڈک یا بل میں سانپ۔

نواں پڑاؤ

کسی زمانے میں یہ آبادی امن و آشتی کا گہوارا ہوا کرتی تھی۔ کم و بیش ایک صدی قبل خدا معلوم کیوں اس آبادی پر ایک بڑا عذاب نازل ہوا جس کی زد میں آ کر اس شہر کی آبادی کا بڑا حصہ نیست و نابود ہو گیا۔ یہ تمام ترقی اور چہل پہل اُس تباہی کے بعد ہونے والی ترقی کا نتیجہ ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس شہر بلکہ خطّے کے لوگوں نے اُس تباہی سے سبق سیکھنے کے بجائے پھر سے بڑی تباہی کو آواز دینے کی ٹھان لی ہے۔ یہ لوگ اپنے گھر اور گھر والوں سے ناراض ہو کر علیحدہ شناخت کے خواہش مند ہیں۔ جس قدر گلے، شکوے، شکایت انہیں اپنوں سے ہیں اُسی قدر بدگمانی اور بےاطمینانی کا دفتر اُدھر بھی کھلا ہوا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک بے شمار فورم کی موجودگی میں یہاں کے سادہ اور کم علم لوگوں نے ہتھیار کے زور پر بات منوانے کا عزم کر رکھا ہے۔ یہ ضدّی اور غصّیلے لوگ اپنی دھن کے اس قدر پکے ہیں کہ صدیوں سے آباد اپنے شریکوں کا خون بہا کر اپنی جیت میں مصروف ہیں۔ یہ وہ شریک ہیں جو اس خطے میں آئے تو رزق کی تلاش میں تھے مگر اُن کے بزرگوں نے اس علاقے کی ترقی اور تہذیب میں بےلوث خدمات سرانجام دے کر اس زمین سے وفا کا رشتہ استوار کیا۔ آج اُنہی کی نسل اپنے گھر بار روزگار اور بزرگوں کی قبروں سے بے وفائی کی مرتکب ہو کر جان کی امان کے لیے مارے مارے پھر رہی ہے۔ موت ان کے تعاقب میں ہر جگہ ان کا پیچھا کر رہی ہے۔

کچھ دنوں سے یہاں پر مذہبی جنونیت بھی نمایاں ہونے لگی ہے خاص کر کمزور طبقے دہشت گردوں کو مسیحا جان کر اُن کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔ دونوں طرف کے سادہ دل لوگ اس بات سے قطعی بے خبر ہیں کہ اس خطے میں اگر امن اور بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے تو اس سرزمین کے دفینے نہ صرف اسے خطے بلکہ پورے ملک کی معاشی صورت حال میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

دسواں پڑاؤ

اگلا پڑاؤ ایک بارونق شہر کی پوش آبادی میں تھا۔ ایک عالی شان گھر کے سامنے رنگ برنگے شامیانے لگے ہوئے تھے اُن شامیانوں میں قطار در قطار لگی کرسیوں پر قیمتی لباس میں ملبوس رعونت زدہ چہرے ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف تھے۔ گھر کے سامنے اور گھر سے ملحقہ خالی زمین پر قیمتی گاڑیاں شوفروں سمیت اُن کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ اس بڑے اور قیمتی گھر کا مالک ایک صنعت کار تھا جو دل کی حرکت بند ہونے کے باعث اس دنیا میں نہ رہا تھا۔ آخری رسوم میں شریک لوگ مرحوم کی فراخ دلی اور اعلیٰ اخلاق کی دل کھول کر تعریف کر رہے تھے۔ ہم بھی اس نیک اور شریف آدمی کے سفرِ آخرت میں شریک ہونے کے خواہش مند تھے مگر ساتھی کا اشارہ حکم کا درجہ رکھتا تھا لہٰذا واپسی میں عافیت جانی۔

''بڑے افسردہ نظر آ رہے ہو؟'' ہمراہی کے سوال پر ہمارا دل بھر آیا ''ایک نیک اور شریف آدمی اچانک فوت ہو جاتا ہے اور ہم اُس کے جسدِ خاکی کو کاندھا بھی نہیں دے سکتے'' ''پہلی بات تو یہ کہ وہ نیک اور شریف ہرگز نہیں تھا!'' قبل اس کے کہ ہم کوئی سوال کریں اُس نے اپنا بیان جاری رکھا ''وہ ایک ذخیرہ

انددوز، ملاوٹی اور منافع خور تھا، دوسری بات یہ کہ اُس کی موت دل کے دورے سے نہیں، شراب پینے سے واقع ہوئی ہے'' اس بار ہم اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکے ''شراب؟'' جواب میں اُس نے بھی وقفہ دینا مناسب سمجھا ''شراب نہیں بلکہ زہریلی شراب یہ لوگ جب حرام کماتے ہیں تو اُسے لٹاتے بھی حرام میں ہیں، غلط پیسہ آتے ہی اِن کے اندر شراب و شباب کی بھوک اُمڈ آتی ہے، شہر کے اکثر پوش علاقوں میں ان جیسوں کی بھوک مٹانے کے لیے بڑی بڑی عالی شان دکانیں کھلی ہوئی ہیں جہاں پرانے زمانے کے نوابوں اور راجوں کی طرز پر قیمتی گھروں اور موٹی رقموں کے عوض ان کی ہوس پوری کرنے کا تمام سامان دستیاب ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ طوائف کا منہ کھلتا جاتا ہے اور سیٹھ کا ہاتھ تنگ ہوتا جاتا ہے، سیٹھ طوائف کو بوجھ لگنے لگتا ہے جسے وہ شراب میں زہر ملا کر اتار دیتی ہے''

گیارھواں پڑاؤ

یہ شاید دنیا کے آٹھویں بڑے عجوبے کی سب سے خوش فکر مخلوق ہے جو ہر طرح کے دکھ، درد، خوف، اندیشہ، ملال یا وسوسوں سے قطعی بے نیاز معلوم ہوتی ہے۔ ان کے چہروں پر خاص طرح کی تمکنت، غرور اور احساس تفاخر نمایاں نظر آتا ہے۔ بھرے بھرے بے ڈول اجسام قیمتی لباس میں ملبوس ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ جب بیش قیمت گاڑیوں کا رُخ کرتے ہیں تو ہٹو بچو کی آواز میں اہلکاروں کی ایسی دوڑیں لگتی ہیں کہ غدر کا منظر یاد آ جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ علاقہ ممنوعہ ہے یہاں عام آدمی کا گذر بھول کر بھی نہیں ہو سکتا۔ ان خوش فکروں کی رہائش اور دفتر کے بیچ صرف ایک سڑک حائل ہے جس کو پار کرنے کے لیے حفاظت کے نام پر جس طرح کا ڈھونگ اور سوانگ رچایا گیا ہے اُسے دیکھ کر اوسط عقل کے مالک انسان کے لیے بھی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ لوگ باری باری دفتر سے ملحقہ جس بڑے گھر کے ہال نما کمرے کی جانب روانہ ہیں اس کی صدر کرسی پر بیٹھا ہال کا بڑا، گلہ پھاڑ پھاڑ کر ان کو وقت کی اہمیت کا احساس دلا رہا ہے۔ وہ کبھی غریب کے منہ سے چھنتی روٹی کا رونا روتا ہے کبھی مہنگائی کی جانب توجہ دلاتا ہے، کبھی امن و امان کی زبوں حالی پر پریشان ہوتا ہے، کبھی بڑے اداروں کی تباہی کی نشاندہی کرتا ہے، کبھی ڈگمگاتی معیشت کو سہارا دینے کی جانب توجہ دلاتا ہے، کبھی ملک کی سلامتی کی بابت خدشات کا اظہار کرتا ہے اور کبھی رشوت، چوری، ڈاکہ اور تعلیمی گھپلوں کی جانب اشارہ کر کے سزا کا خوف دلاتا ہے۔ خدا معلوم یہ لوگ کس مٹی کے بنے ہیں۔ کسی بات کا ان پر قطعاً اثر نہیں ہوتا۔ دن کی روشنی میں جو لوگ عوام کے نام پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں یہاں وہ اس طرح شیر و شکر ہو رہے ہیں جیسے کبھی ان کے درمیان ناچاقی کا کوئی واقعہ سرے سے گذرا ہی نہ ہو۔

ہال کی کارروائی سے لاتعلق یہ لوگ دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں بٹ کر بے تکلفانہ انداز میں اس طرح خوش گپیوں میں مصروف ہیں کہ ان پر لنگوٹیوں کا گمان ہوتا ہے۔ بظاہر رہبر و رہنما، دانشور و مفکر کا مکھوٹا چڑھانے والے بھانڈوں کی مانند ہاتھ پیر نچا کر ایک دوسرے پر ایسی ایسی پھبتیاں کس رہے ہیں جنہیں سُن کر انسان شرم سے پانی ہو جائے۔ ان کی گفتگو کا محور طرح طرح کے کھانے، مشروب اور معروف پردہ نشینوں کے علاوہ مال، دولت، زمین، جائیداد، پلاٹ، پرمٹ، کرنسی، اکاؤنٹ اور شطرنج کی بچھی وہ بساط ہے جسے جیتنے کے لیے ہر کوئی بے چین و بے قرار ہے۔ ہر کسی کی جیب، دماغ یا ہاتھ میں ایک سے بڑھ کر ایک نسخہ کیمیا ہے اور ہر کوئی کسی بھی قیمت پر یہ بساط جیتنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ بچگانہ طریق پر جیتنے کی خواہش میں اکثر بساط الٹ بھی جاتی ہے۔

بارھواں پڑاؤ

یہ شاید کسی ہوٹل، ریسٹ ہاؤس یا ہاسٹل کا کانفرنس روم ہے۔ یہ کمرہ جس قدر کشادہ اور اس میں لگی کرسیوں کی تعداد کے مطابق حاضری بہت کم ہے۔ سامنے کی رو میں بیٹھے لوگوں کے چہروں کی متانت، سنجیدگی، لباس اور آنکھوں پر لگے چشموں کے دبیز شیشے اُن کی حیثیت و مرتبے کو نمایاں کر رہے ہیں۔ پچھلی رو میں یہ تنظیم نظر نہیں آتی۔ اس میں ملے جلے لباس اور اشکال کے لوگ ایک ایک، دو دو کرسیاں چھوڑ کر دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے بحث و تمحیص میں مصروف ہیں۔ کچھ دیر بعد چند لوگوں کی ہمراہی میں ایک معتبر شخصیت کے مالک بزرگ تشریف لاتے ہیں اور فوری طور پر انہیں مائیک سونپ دیا جاتا ہے۔

''عمرِ عزیز کا غالب حصہ قرطاس و قلم کی صحبت میں گذارنے کے باوجود آج بھی میں خود کو طالب علم تصوّر کرتا ہوں۔ آپ کی محبت کہ آپ ناچیز کو اس قدر عزت اور مان دیتے ہیں میری باتوں کو علم گردانتے ہیں۔ میں عرض کروں کہ یہ وہی علم ہے جسے علمِ نافع کہا جاتا ہے اور جسے ہمارے آخری نبیؐ نے حاصل کرنے کی تاکید کے ساتھ دُور دراز کا سفر کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا تھا اور اسی علم کو بروئے کار لاتے ہوئے سب سے زیادہ تاکید غور و فکر کی فرمائی تھی، کیا آپ جانتے ہیں! خالق دو جہاں نے ہمارے دماغ میں کروڑوں کے حساب سے بلب نصب کر رکھے ہیں جو ہر نیا لفظ پڑھنے کے ساتھ بھاری تعداد میں روشن ہو کر دماغ کو تیز اور تازہ دم کر دیتے ہیں۔ جوں جوں ہم پڑھتے جاتے ہیں ڈوں ڈوں ہمارے دماغ میں نصب بلب روشن ہوتے جاتے ہیں اور اس روشنی کے بطن سے ابن الہیثم، ابن سینا، سقراط، بقراط، حافظ، سعدی، ہومر، کافکا، شیلے، شیکسپیئر، خلیل جبران، غالب، اقبال، ٹیگور اور نذر السلام پیدا ہونے لگتے ہیں جن کی شاخوں سے ثمر پھوٹتا ہے، شجر اُگتے ہیں، بہار آتی ہے اور کائنات مہکنے لگتی ہے۔ علامہ اقبال کس خوبصورتی سے علم کی جانب ہماری توجہ دلا رہے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا کام تجھ سے دُنیا کی امامت کا

''امامت کے خواب دیکھنے والوں سے یہ تو دریافت کیا جائے کہ ان کے اپنے علم کی بنیاد کیا ہے، خوشامد، سفارش یا۔۔۔ (ایک آواز) صاحبِ صدر کی بابت تو

نہیں البتہ آپ کے علم کی بنیاد کیا ہے یہ میں خوب جانتا ہوں۔۔۔(دوسری آواز) ذرا اُن صاحب کا نام تو بتلا دیجیے جن کی ڈگری کا چربہ مار کر آپ بقراط بنے بیٹھے ہیں۔۔۔(تیسری آواز) ان کی ڈگری کی بابت رائے زنی کرنے سے پہلے آپ نے کبھی اپنے گریبان میں جھانکا ہے، کہ آپ اب تک کس کس کا سرقہ کر چکے ہیں۔۔۔(چوتھی آواز) یہ تو شکل سے ہی چغد لگتا ہے۔۔۔(پانچویں آواز) گھر سے آئینہ دیکھ کر چلتے تو شکل کی بجائے عقل کی بات کر لیتے۔۔۔(چھٹی آواز) میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتا۔۔۔ میں کب تمہیں گھاس ڈالتا ہوں۔۔۔میاں گھاس تو گھوڑوں کے لیے ہوتی ہے۔۔۔!

آخری پڑاؤ

جس طرح ایک مخصوص آواز کی ضرب سہہ سہہ کر ہماری روح لہولہان ہو چکی تھی اُسی طرح اس طویل اور بے مقصد سفر نے ہمیں تھکا بلکہ ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ یہ سفر، سفر نہیں، ایک ایسی روداِد الم ہے جہاں قدم قدم پر انسانیت چیخ اور بلک رہی ہے مگر اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ جس قدر بے بس ، لاچار اور بے توقیر ہم خود کو اس سفر کے بعد محسوس کر رہے ہیں اس سے پہلے کبھی ہمیں اس طرح کے احساسات کا سامنا نہ تھا۔ اب ہمیں خود پر گذرے سارے درد والم بے ضرر اور معصوم لگنے لگے ہیں۔

وہ گھر جس سے بھاگ کر ہم پناہ کی تلاش میں نکلے تھے اب شدت سے یاد آ رہا ہے۔۔۔وہ گھر جو کبھی ہمارے لیے امن کا سائبان تھا۔۔۔وہ گھر جس نے کھلی بانہوں سے ہمیں خوش آمدید کہا تھا۔۔۔وہ گھر جس نے خوش دلی سے ہمیں آسرا دیا تھا۔۔۔وہ گھر جس نے ہمارا رزق کشادہ کیا تھا۔۔۔وہ گھر جس نے ہمیں مان، مریادہ، عزت اور شناخت دی تھی۔۔۔وہ گھر آج گرم ہواؤں کی زد میں ہے تو ہمیں۔۔۔آزردہ ہونے۔۔۔شکوہ کناں یا فرار ہونے کے بجائے اُس گھر کو شاد و آباد کرنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔۔۔جس طرح اس وقت ہمیں اُس گھر کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے یقیناً وہ گھر بھی ہمیں ٹوٹ کر یاد کرتا ہوگا۔۔۔ ہماری یاد میں اُس کے در و بام۔۔۔یقیناً۔۔۔سوگوار ہوں گے۔۔۔ہمیں جلد۔۔۔جس قدر جلد ممکن ہو۔۔۔گھر پہنچنا چاہیے۔۔۔گھر۔۔۔قبل اس کے۔۔۔کوئی طوفانِ بلا ہمارے گھر کو کسی طرح کا گزند پہنچائے۔۔۔ہمیں گھر پہنچنا چاہیے۔۔۔جسم کی ساری توانائی کام میں لا کر۔۔۔گھر۔۔۔ اپنے گھر پہنچنا۔۔۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی خواہش ہے۔۔۔اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہم کسی بھی طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔۔۔کسی بھی طرح کی۔۔۔ چاہے وہ آوازوں کی صورت ہو۔۔۔یا۔۔۔یا۔۔۔آں۔۔۔ایں۔۔۔یہ۔۔۔یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔پھر۔۔۔پھر وہی آواز۔۔۔یہ۔۔۔ یہ آواز تو۔۔۔وہی نام بار بار دہرا رہی ہے۔۔۔وہی ۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ بالکل وہی۔۔۔ ہو بہو۔۔۔ وہی ۔۔۔ جو۔۔۔ جو۔۔۔ ہمارے۔۔۔را۔۔۔راشن کارڈ۔۔۔شا۔۔۔شناختی کارڈ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور۔۔۔ گھر کے صدر دروازے پر کندہ ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہمارے۔۔۔گھر پر لوگوں کا ہجوم کیوں ہے۔۔۔ ان۔۔۔ ان کے چہرے۔۔۔ سو۔۔۔سوگوار کیوں ہیں۔۔۔ یہ۔۔۔یہ سب۔۔۔ ماتم کناں کیوں ہیں۔۔۔

ہمراہی۔۔۔ ساتھی۔۔۔ مہربان۔۔۔ دوست۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔کہاں ہو۔۔۔کہاں ہو تم۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ گھور اندھیرا۔۔۔گھور۔۔۔ان۔۔۔دھے۔۔۔را۔۔۔!!!

☆

(دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ میں ہلاک ہونے والے پرندوں کی یادگار پر کندہ ''They Have No Choice'' سے متاثر ہو کر)

- بقیہ -

ہمزاد

مجھے اپنی مادی کیفیت کی تبدیلی کا پتہ بھی تقریباً بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا جب میرا نام نیوٹن ہوا کرتا تھا اور میں نے حرکت اور ثقل کی قوتوں کو دریافت کیا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے کائنات کے سب سے بڑے راز کو معلوم کر لیا مگر جب میں نے آئن سٹائن کے روپ میں جنم لیا اور نیوٹن کے برعکس نظریہ اضافیت یعنی یہ کہ فاصلہ اور وقت اضافی ہیں کی بنیاد رکھی اور اضافت کی سپیشل تھیوری کے تحت مادے کی نور میں تبدیلی کا پتہ لگایا۔ میں نے رومی کی نے بن کر بھی آواز لگائی جو کسی نے سُنی نہیں !تمام تر فاصلوں کے باوجود ہمزاد نے بھی مجھ سے محبت کا رشتہ قائم رکھا ۔ مجھے علم شریعہ سے مستفیض کیا تا کہ میرا میلان نہ تو بھٹکے اور نہ ہی حد سے بڑھے۔ پھر کبھی کبھی طریقت کے رستے میرے مقناطیسی اور الیکٹرک فیلڈ میں کبھی کبھی ارتعاش بھی پیدا کر دیتا ہے مگر پتہ نہیں اُس نے مجھے مزید کتنی صدیوں تک نا مراد و نا رسا رکھنا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے فاصلے اور وقت کی اکائیوں کی طرح اپنا ہر فعل، اپنی ہر سوچ، ہر فکر، ہر احساس اور ہر پہنچ اضافی یعنی (Relative) لگتی ہے۔ سوچتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں کیونکہ اگر ایسا ہے تو پھر میرا ہر کام اور ہر عمل بے معنی و لایعنی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو میرا مقصد نوری کیفیت کی تلاش اور ہمزاد سے ملاپ کے لئے ہے اگر چہ ہمزاد کے مصمم وعدہ اور غیر متزلزل ارادہ کی نوید ہے مگر پتہ نہیں میری حالت میں تبدیلی اور ہمزاد سے ملاپ کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے میں کتنی صدیاں اور کتنے نوری قرن صرف ہو جائیں۔ یہ سب سوچ کر میرا دل ڈوب جاتا ہے اور میں پھر اپنے خول یعنی اپنے جسم میں پناہ ڈھونڈتا نظر آتا ہوں، اسی پناہ کے لئے ابھی ابھی میں نے اپنے جسم کے دروازے پر دستک دی تھی۔

''قرارِ قلب''

صدیق شاہد (شیخوپورہ)

کھلے نہ ہم سے وہ عالی جناب ایسے تھے
ہماری جان پہ ان کے عتاب ایسے تھے!

قدم قدم پہ نیا ساز و رختِ فکر ملا،
کتابِ زیست کے کچھ تلخ باب ایسے تھے

قرارِ قلب و نظر تھی ترے جمال کی چھوٹ
رُخِ صبح نہ دیکھا، حجاب ایسے تھے!

ہماری شب کو کبھی روشنی عطا نہ ہوئی
ستارے ایسے تھے وہ ماہتاب ایسے تھے

مری تھی خامی کہ میں ہی نہ پڑھ سکا ان کو
کہ دیکھنے میں وہ چہرے کتاب ایسے تھے

وہ ڈھونڈتی تھی حویلی میں مرنے والے کو
ہوائے تند کے کچھ پیچ و تاب ایسے تھے

جہاں بھی دیکھا انہیں ہم نے تہ بہ تہ پایا
ہمارے عہد کے شاہدؔ سراب ایسے تھے

نعیم الدین نظرؔ (میرپورخاص)

زندگی کے نشاں تلاش کروں
آگ، مٹی، کنواں تلاش کروں

اک نئے درد کی ضرورت ہے
رنج و غم کی دکاں تلاش کروں

نقص باقی ہیں کچھ تلفظ کے
کوئی اہلِ زباں تلاش کروں

کوئی تاجر ہوں جو محبت میں
اپنا سود و زیاں تلاش کروں

رنگ و بو کے جہاں کو ٹھکرا کر
راحتِ جانِ جاں تلاش کروں

سرکشی حد سے بڑھ نہ جائے کہیں
عبرتوں کے نشاں تلاش کروں

راز بھی راز کب ہے لوگوں میں
اب کوئی رازداں تلاش کروں

ہم جہاں روز چھپ کے ملتے تھے
آج وہ اک مکاں تلاش کروں

وقت کی بھینٹ چڑھ گیا ہے نظرؔ
اپنا بچپن کہاں تلاش کروں

سیفی سرونجی (بھارت)

یہ پھول سا ترا چہرہ کھلا نہیں ہوتا
وہ ایک لفظ جو میں نے کہا نہیں ہوتا

سوال میرا یقیناً غلط رہا ورنہ
جواب اس نے مجھے یوں دیا نہیں ہوتا

یہی بہت ہے کہ بیٹا خفا نہیں مجھ سے
وگرنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

خدا کا شکر ہے ہر بار کوششوں کے بعد
ہوا سے گل بھی میرا دیا نہیں ہوتا

مرے نبی کا یہ ادنیٰ سا اک کرشمہ تھا
وگرنہ پیڑ بھی وہ ہرا نہیں ہوتا

سیدخورشیدکاظمی

(جموں، کشمیر)

چشمِ کرم تُو اِدھر بھی اُچھال دے
آنکھوں میں میری اِن حسیں آنکھوں کوڈال دے
میں زندگی میں تجھ کو کبھی بھول پاؤں گا
یہ شائبہ ہے تُو اسے دل سے نکال دے
اس زندگی میں کوئی بشر مطمئن نہیں
کوئی نظر سے گزرا ہو ایسی مثال دے
بدحالی ہے یہ سارا جہاں اے مرے خدا
اب تو سکوں کے اس کو کوئی ماہ و سال دے
ثانی نہیں ہے کوئی بھی ترا اس جہان میں
ہو اور کوئی تجھ سا تو اُس کی مثال دے
حق بات سُننے کی تجھے عادت نہیں اگر
بہتر ہے اپنی بزم سے ہم کو نکال دے
تُو اپنے خیر خواہوں میں اُس کو شمار کر
جو تیری ذات میں کوئی خامی نکال دے
خورشید تری شاعری جس سے ہو پُر اثر
اللہ سے کر دعا وہ تجھے یہ کمال دے

○

کرامت بخاری

(لاہور)

نہ اُس نے کوئی بات مانی مری
ہوئی ختم آخر جوانی مری
مرا عرصۂ عمر ہے تشنگی
بجھائے گا کیا پیاس پانی مری
مرے سر پہ سایہ رہا دھوپ کا
رہی مختلف سائبانی مری
ہر اِک دل کاغم ہے مرے دل کاغم
ہر اک دل پہ ہے حکمرانی مری
ہے مٹھی میں وعدہ کہ دل ہے مرا
دکھاؤ اگر ہے نشانی مری
وہ جب چاند چہرا ہوا روبرو
ستاروں نے کی ترجمانی مری
کوئی نام اس میں نہیں آئے گا
مرے تک رہے گی کہانی مری

○

انجینئر سید تقی محمد

(میر پورخاص)

جو بولتے رہے محفل میں بے نشان رہے
خموش رہے کے سبھی میرے ہم زبان رہے
ہم ایسے کون سے محفوظ تھے گھروں میں مگر
تری تلاش میں کچھ اور بے امان رہے
ہزار کانٹے بھی ہم کو نہ کر سکے گھائل
وہ ایک پھول تھا جس سے لہولہان رہے
ملی ہے صاف بیانی کی عارضی قیمت
وہ اس طرح نہ کبھی ہم سے بدگمان رہے
یونہی نہیں رہے ہم لوگ بے امان تقی
اک عہدِ کہنہ نبھانے میں بے امان رہے

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

پہلے ہم حیرت سے اُس کی باتوں کو سُنتے رہے　　خامشی ہونے پہ پھر بے ساختہ ہنستے رہے
کوئی بھی اُلجھن بہاؤ میں نہ آڑے آ سکی　　سوچ کے دریا مرے ہی روبرو بہتے رہے
اس سوا کوئی ٹھکانہ ڈھونڈے بھی ملتا کہاں　　بکھرے بکھرے خوابوں کی دنیا میں ہی رہتے رہے
خوشبو اُس کی پہلے گردوپیش میں پھیلی وپھر　　رات کی رانی کی دستک رات بھر سنتے رہے
گو رہی دیوار و دَر سے جھانکتی افسردگی　　آس کا روشن دیا لے کے مگر رہتے رہے
ناگواری کی چبھن کچھ کم نہ تھی کیسے کہیں　　مصلحت کے پھول چُن کر پر سبھی سہتے رہے
سنتے ہی، ساری اُداسی جیسے چھَٹ کر رہ گئی　　تازہ جھونکے صبح کے جب سیر کو کہتے رہے!

ملک زادہ جاوید

(نوئیڈا، بھارت)

تیر جس کی کمان میں رہتا ہے　　وہ صدا امتحان میں رہتا ہے
دفن ہو کر زمین کے نیچے　　وہ کہیں آسمان میں رہتا ہے
علم حاصل کیا ہے جس نے بھی　　صاف ستھرے مکان میں رہتا ہے
جس کو اللہ نے نوازا ہو　　وہ ہمیشہ بیان میں رہتا ہے
اس سے ناراضگی، اور اُس سے جنگ　　یہ تو ہر خاندان میں رہتا ہے
جس نے دل کھول کر لٹایا ہو　　وہ کھنڈر داستان میں رہتا ہے
گم ہے منظر سے ان دنوں جاویدؔ　　جانے وہ کس جہان میں رہتا ہے

مالک سنگھ وفاؔ

(جموں، کشمیر)

یہ زمین ہے نہ آسمان اپنا　　اب نہیں کوئی مہرباں اپنا
میں کدھر جاؤں کس طرف جاؤں　　اب تو کوئی نہیں یہاں اپنا
میں سمجھتا تھا جس کو اپنا ہے　　وہ بھی نکلا کہاں میرا اپنا
میری خاطر سبھی ہیں بیگانے　　دشت و صحرا نہ گلستاں اپنا
سوچتا ہوں کسے پکارُوں میں　　جب نہیں کوئی بھی یہاں اپنا
کیا پہنچ پائے کا سرِ منزل　　زندگی کا یہ کارواں اپنا
خیر سے جانتے ہیں ہم سب کو　　ہے مگر کون رازداں اپنا
ہم چلے جائیں گے جہاں سے وفاؔ　　چھوڑ جائیں گے کیسا نشاں اپنا

○

خورشیدانور رضوی

(اسلام آباد)

سخن کا فائدہ کوئی نہیں ہے
کسی کی مانتا کوئی نہیں ہے
خلوص اک لفظ شرمندۂ معنی
ریا کی انتہا کوئی نہیں ہے
یہ کیسی صبحِ کاذب ہے کہ جس میں
صداقت کی صدا کوئی نہیں ہے
حقیقت کس سے پوچھیں کیا بتائیں
کہ سچ تو بولتا کوئی نہیں ہے
سبھی ہم بند گلیوں میں کھڑے ہیں
بتاتا راستا کوئی نہیں ہے
نجانے کب کھلے گا بند موسم
کسی کو کچھ پتا کوئی نہیں ہے
قفس کو توڑنا پڑتا ہے صاحب
قفس کو کھولتا کوئی نہیں ہے
چمن ہوگا تو ہونگے آشیانے
مگر یہ مانتا کوئی نہیں ہے
ہم ایسے قافلے کے راہرو ہیں
کہ جس کا رہنما کوئی نہیں ہے
خدا کے ماننے والے بہت ہیں
خدا کی مانتا کوئی نہیں ہے

○

نزہت انیس

(کراچی)

رفاقتوں کو سبھی مجھ پہ بار اس نے کیا
کبھی لباس تھی میں تار تار اس نے کیا
کہا نماز مرے آنچلوں پہ جائز ہے
مگر حیا کو مری داغ دار اس نے کیا
کسی بھی یاد کو نہ خوشگوار رہنے دیا
کرید کر مرے زخموں کو وار اس نے کیا
نہ میرا ساتھ ہی دیتا وہ چھوڑ دیتا مجھے
اذیتوں کی مگر حد کو پار اس نے کیا
میں گھر سے آج کٹہرے میں آگئی نزہتؔ
تمام رشتوں کو بے اعتبار اس نے کیا

○

عادل فریدی

(کراچی)

کہانی اب نئے انداز سے تحریر کرنا ہے
کہ اختتام کو آغاز سے تحریر کرنا ہے
وہی لکھنا ہے جو دیکھا ہے ان بیدار آنکھوں نے
مصائب کو سخن اعجاز سے تحریر کرنا ہے
طوالت بوجھ ہے اس عہد میں حسنِ سماعت پر
سو اختصار اور ایجاز سے تحریر کرنا ہے
مسافت میں تھکن کا اپنا اک کردار ہوتا ہے
سو اس کو جسم کی آواز سے تحریر کرنا ہے
وہ سرگوشی ہو عادلؔ یا اشارہ اور کنایہ ہو
بہر صورت نئے انداز سے تحریر کرنا ہے

○

تصوراقبال
(تلہ گنگ)

ایک دیا ہے رات بہت | یادوں کی برسات بہت
دینے والا ہاتھ ہے اک | لینے والے ہاتھ بہت
جان اکیلی ہے بے چاری | اُوپر سے صدمات بہت
گھر سے کوئی نکلے کیا | رستے میں خطرات بہت
دل کے بدلے دردِ دل | اچھی ہے سوغات بہت
ایک ذرا سی کوشش کر | ملنے کے اوقات بہت
پیار میں دھوکا کھا بیٹھا | اب جو ہُوں محتاط بہت
کچھ بھی اور نہیں لینا | کاغذ قلم دوات بہت
میری تنخواہ کم ہے اور | گھر کے اخراجات بہت
غم کا اور خوشی کا ربط | اک دُوجے سے ساتھ بہت

محمودکاوش
(راولپنڈی)

کبھی جو رُوپ بدل کر نیا عذاب آیا | تو سادہ لوح یہ سمجھے کہ انقلاب آیا
یہ جانا تشنہ لبوں نے کہ اب کے آب آیا | قدم سراب سے نکلے تو پھر سراب آیا
ورودِ حشر میں اب دیر کس لیے اتنی | کہ زندگی ہی میں جب سر پہ آفتاب آیا
جو چور خود ہو کرے گا محاسبہ کیوں کر | کہا ہے کس نے کہ اب دَورِ احتساب آیا
تمام عمر کٹی اپنی اِس طرح کاوِش | کہ اِک عذاب ٹلا، دُوسرا عذاب آیا

اجیت سنگھ حسرتؔ
(لدھیانہ، بھارت)

عقل حیراں ہے جنوں یہ کیا کرشمہ کر گیا | دور تک کیسے کوئی لڑتا بُریدہ سر گیا
کر دیا لبریز تر اوندھا پیالہ عشق نے | پھر ہوس کے بیکراں اندھے کوئیں کو بھر گیا
ٹوٹ کر برسا ہے یوں اب کے تر ا ابرِ کرم | دست کو گلزار، صحرا کو سمندر کر گیا
آخری دیدار کو آئیں چلو دیکھیں اُسے | لوگ کہتے ہیں سحر ہوتے ہی سورج مر گیا
یہ ازل ہی سے چلا آتا ہے چکّر دوستو! | کوئی اپنے گھر سے نکلا کوئی اپنے گھر گیا
پہلے اپنا گھر جلایا روشنی کے واسطے | آگ جب بھڑکی تو اندھی روشنی سے ڈر گیا
اور بونا ہو گیا حسرتؔ انا کے بوجھ سے | قد بڑھانے کیلئے جو شخص پربت پر گیا

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط۔۔۱۵

۱۹۶۳ء۔۔زندگی کا اہم ترین اور یادگار سال

۱۹۶۳ء میں میں نے انٹر سائنس کا امتحان پاس کیا اور میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ اسی سال نہ صرف میں نے شاہ عبدللطیف گورنمنٹ کالج کو بلکہ میر پور خاص کو بھی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اگر چہ مجھے اس وقت اسکا احساس نہ تھا۔ میر پور خاص تو میری رگ وپے میں پیوستہ تھا اور یہاں کے چپے چپے پر میرے قدموں کے نشان تھے اور ہر موڑ پر میری یادوں کے مینار کھڑے تھے۔ پھر ان دنوں میرے گھر میں اس قدر رونق تھی کہ کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ہمارے گھر کا ماحول، میرے دوستوں کی محفلیں، ریلوے اسٹیشن کی رنگارنگی اور سحر انگیز شامیں جو فروٹ فارم کی سیر سے عبارت تھیں مجھے اپنی جانب کھینچتی تھیں۔ مگر جانا تو تھا۔ مجھے اس بات سے بڑی تسلی تھی کہ حیدرآباد زیادہ دور نہیں اور میں ہر ہفتے گھر آ سکتا ہوں۔ مگر شاید میں اس مقولے کو بھول گیا تھا کہ جس نے کبھی ایک دفعہ وطن چھوڑا وہ لوٹ کر نہیں آ سکا۔ اور اگر آیا تو وطن وہ نہیں رہتا جسے وہ کبھی چھوڑ کر گیا تھا۔ یوں تو اس سال کے کئی اہم واقعات کا مزید تذکرہ آئیگا مگر سب سے پہلے۔۔

امتحان کے بعد۔۔

امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ اب ہمیں نتائج کا انتظار تھا۔ ایک بوجھ تھا جو اتر گیا تھا مگر اب مستقبل کی فکر نے جکڑ لیا تھا۔ پھر بھی یہ زمانہ بہت ہی مزے کا تھا سہ پہر کو ریلوے کلب جا کر رسائل کا مطالعہ کرنا جس میں خاص طور سے ''لیل ونہار'' شامل تھا، مہتاب سعید کے ساتھ ٹیبل ٹینس کھیلنا اور شام کو اشفاق بیگ کے ساتھ فروٹ فارم کی لمبی تفریح جس میں اردو ادب کی کلاسیکل کتابوں اور اس کے ساتھ ہی تازہ ترین تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ ہوتا تھا میرا معمول بن گیا تھا۔ فروٹ فارم اس قدر خوبصورت تھا کہ اس کے دلکش نظاروں کی صحیح طور پر لفظی تصویر کشی یہاں ممکن نہیں۔ قطار اندر قطار کھجور کے درخت تھے جن کے درمیان کچی پگڈنڈیاں تھیں۔ کچھ پلاٹس پر چیکو کے ان گنت درخت تھے تو کہیں نیبو اور لیمن کے پیڑ جن پر سفید شگوفے کھلتے تھے اور فضا مہک جاتی تھی۔ پھر آم۔۔جن کے لئے میر پور خاص اگر دنیا میں نہیں تو پاکستان بھر میں مشہور ہے۔ یہاں میلوں قسم قسم کے آموں کے درخت تھے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ ٹھنڈے اور شفاف پانی کی نالیاں بہہ رہی تھیں اور ان میں ہاتھ پیر اور منہ دھونے سے ایک عجب تازگی ملتی تھی۔ پھر شام ہونے پر درجنوں مکرانی عورتیں اپنے خاص شیشے لگے گہرے سرخ لباس میں سر پر گھاس پھوس اور دوسرے سامان کا گٹھر اٹھائے ان پگڈنڈیوں پر رواں دواں ہوتی تھیں۔ درختوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں، لمبے ہوتے سایوں اور اپنے گھونسلوں کو لوٹتے پرندوں کی چہکار سے ماحول جادوئی ہو جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ریڈیو سننا اور فرمائش کے خطوط بھیجنے میں بھی اب کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اس وقت پاکستانی فلم ''بدنام'' کے اس گیت نے جو ثریا ملتانیکر نے گایا تھا۔

محبت کی جھوٹی اداؤں پہ صاحب
جوانی لٹانے کی کوشش نہ کرنا
بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے
کہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا

ایک تہلکہ مچایا ہوا تھا۔ میں اور رشید اس کی فرمائش ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے کر کے اسے بار بار سنا کرتے تھے اور اپنا نام نشر ہونے پر آسمان پر اڑنے لگتے تھے۔

رات کو جب رشید ہمارے یہاں کھانا کھانے آتا تو کھانے کے بعد میں اسی کے ساتھ ریاض کے گھر چلا جاتا وہاں ہم تینوں اس کے گھر کے پیچھے درختوں کے نیچے پڑے کھٹولوں پر لیٹ جاتے اور آدھی رات تک بہت ہی دلفریب باتیں کرتے تھے جس میں ہمارے خواب، ہمارے خدشات، ہماری محبتیں، ہماری خواہشیں اور ہماری مایوسیاں سبھی کا ذکر ہوتا تھا۔

ان دنوں ریاض بھی شہر کے ایک مشہور گھرانے کی لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا جو اسے خوشبوؤں میں بسے رومال بھیجا کرتی تھی۔ مگر ان دو گھرانوں میں بڑا سماجی فرق تھا اور وہ کبھی کبھی ٹھنڈی آہیں بھر کر کہتا تھا کہ شاید ہمارا ملاپ ممکن نہیں۔ مگر وہ لڑکی اس کی ہمت بڑھاتی تھی کہ جب تم پڑھ لکھ کر کامیاب انجینئر بن جاؤ گے تو تمہیں کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔ شاید ریاض کی زندگی کی بے مثال کامیابی کی وجہ اسی لڑکی کی حوصلہ افزائی ہو۔

امتحان کا نتیجہ

اس دفعہ میں نے امتحان کے بعد کراچی جانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکہ بھائی جان کی شادی بہت قریب تھی اس کے علاوہ مجھے میر پور خاص میں بہت مزا آ رہا تھا۔ ہمارے کالج میں اس بات کا بڑا تجسس تھا کہ صوبے میں بورڈ کے امتحان میں کون اوّل آئے گا۔ انہوں نے میرے سلسلے میں بڑی امیدیں لگائی ہوئی تھیں۔ مجھ سے پہلے بیچ میں میر پور خاص سے عبداللطیف چغتائی اور میرے دوست چندر دھانو مل نوتانی نے اوّل اور دوئم پوزیشنز حاصل کی تھیں۔ بہر حال نتیجہ نکلا اور اللہ کے فضل سے پری میڈیکل گروپ میں میں صوبے میں اوّل، خیر پور

سے منیر عباسی دوئم اور ڈگری سے مدد علی خانقائم خانی سوئم آیا تھا۔ ڈگری دراصل میرپورخاص ہی کا نواحی شہر تھا مگر مدد علی نے حیدرآباد کے کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ میرے دوستوں میں ریاض، رشید اور سعید کی بھی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ اشفاق کی بھی بہت اچھی پوزیشن آئی تھی مگر وہ پری انجینئرنگ میں تھا اور اس نے امتحان کیڈٹ کالج پٹارو سے دیا تھا۔ شہر میں ایک دھوم تھی میں دوسرے دن کالج گیا تو تمام پروفیسروں نے اور خاص طور سے افتخار صاحب اور ستار صاحب نے گلے لگا کر مبارکباد دی۔ میرے گھر والے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس سلسلے میں دو ہفتے بعد ہمارے گھر والوں نے خوشی کا میلاد کیا اور پروگرام بنایا کہ میلاد کے بعد مجھے بنا سنوار کر تخت پر بٹھایا جائیگا اور گلے میں ہار پھول ڈالے جائینگے۔ میں ان تمام معاملات سے بہت گھبراتا اور شرماتا ہوں، میں نے انہیں بہت منع کیا مگر کوئی نہیں مانا۔ آخر کار اس شام سے پہلے میں اکیلا چپکے سے شام پانچ بجے کی گاڑی پکڑ کر حیدرآباد بھاگ گیا صرف اپنی بہن ریحانہ آپا کو بتا دیا کہ جب ڈھنڈیا پڑے تو امّاں کو بتا دینا۔ بہرحال تقریب ہوئی اور سلطان بھائی جان جو کسی زمانے میں اسٹیج کے ڈراموں میں حصہ لیا کرتے تھے اور ان میں کسی قسم کی جھجک نہیں تھی، نے نہ صرف تخت پر بیٹھ کر گلے میں خوب مسکرا مسکرا کر ہار ڈلوائے بلکہ جھک جھک کر بڑی ادا سے سب کو سلام بھی کیا اور شکریہ ادا کیا۔ واپسی پر میری امّاں نے خوب کان مروڑے۔ میری خالہ جان کے یہ کہنے پر کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں میری امّاں نے بڑے جوش سے کہا ابھی کیا بڑا ہوا ہے یہ تو جب ڈاکٹر بن جائے گا میں تو تب بھی اسکے کان مروڑونگی۔

میڈیکل کالج میں داخلہ

یہ ۱۹۶۳ کا سال تھا۔ اس دور میں پورے پاکستان میں صرف آٹھ میڈیکل کالج تھے۔ پانچ مغربی پاکستان میں اور تین مشرقی پاکستان میں، یعنی دس کروڑ کی آبادی کے لئے صرف ایک ہزار نشستیں تھیں۔ اس پر کوٹہ کا نظام بھی تھا اور آزاد نشستوں پر کل پاکستان بنیاد پر صرف سات سو لڑکے کالج میں داخلے کے حقدار قرار دئے جاسکتے تھے۔

انٹر سائنس کے نتائج کا تذکرہ میں گذشتہ باب میں کر چکا ہوں۔ ان نتائج کے لحاظ سے میں انٹر سائنس کے پری میڈیکل گروپ میں پورے سندھ میں اوّل آیا تھا، خیرپور سندھ سے منیر عباسی دوئم اور گورنمنٹ کالج حیدرآباد سے مدد علی قائم خانی جو حقیقت میں ایک چھوٹے سے گاؤں ڈگری سے تھا سوئم آیا تھا۔ لیاقت میڈیکل کالج میں داخلے کا فارم بہت ہی پیچیدہ، طویل اور دقت طلب تھا۔ اس کے علاوہ کالج نے بہت سی اضافی اسناد بھی مانگیں تھیں۔ سلطان بھائی جان نے جو اس قسم کے فارم بھرنے اور اضافی اسناد حاصل کرنے میں خاص دسترس رکھتے تھے فوراً یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ فارم تو در حقیقت بھرا ہی انہوں نے۔ ان کا خط بہت ہی خوبصورت تھا اور وہ کبھی کبھار انگریزی کے حروف اس طرح لکھتے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ ٹائپ کئے گئے ہوں۔ میرے امتحان میں اتنے اچھے نمبروں سے کامیابی کی وجوہات یہ بھی تھیں کہ نہ صرف میڈیکل کالج میں داخلے سے ناکامی کے بعد میرا مستقبل بالکل تاریک تھا اور مجھے شاید زندگی بھر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں کلرکی کرنی پڑتی بلکہ یہ مسئلہ بھی تھا کہ اگر داخلہ ہو بھی جاتا تو پورے سندھ میں میڈیکل کالج میں صرف اوّل دس لڑکوں کو اسکالرشپ ملتی تھی اور ہمارے گھر کے مالی حالات ایسے تھے کہ اسکالرشپ کے بغیر میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے انگریزی کے محاورے DO OR DIE کے مصداق میرے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ شاید اسی لئے میں نے اس امتحان میں خاص محنت کی تھی اور اللہ نے مجھے اپنی خاص عنایت سے اتنی زبردست کامیابی عطا کی تھی۔ ویسے بھی یہ سال میرپورخاص کے لڑکوں کے لئے ایک تاریخی سال تھا۔ پہلی دفعہ ہمارے کالج (یعنی پورے شہر سے) سات طلبہ نے میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے مطلوبہ نمبر حاصل کئے تھے۔ ہمارے کالج اور شہر میں اسکی دھوم تھی۔ ان میں میرا سب سے گہرا دوست رشید غوری، فیض محمد بالیپوٹہ، محمد حسین لغاری، گھنشیام داس، پرشوتم داس اور ایک لڑکی نجمہ شیخ کا داخلہ یقینی تھا۔ اسکے علاوہ ایک اور لڑکی اختر شمیم کو بھی داخلہ ملنا تھا مگر اس نے انٹر سائنس حیدرآباد سے کیا تھا۔

بہرحال پہلا مسئلہ تو میرپورخاص کے سول سرجن سے ایک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لینا تھا کہ میں اچھی صحت میں ہوں۔ اس سلسلے میں لوگوں نے بہت ڈرایا تھا کہ بہت معمولی بات پر ڈاکٹری امتحان میں فیل کر دیا جاتا ہے۔ وزن کی کمی، کان کے پردے میں سوراخ یا گلے کے غدود کی سوجن کی بنیاد پر میرپورخاص کے لڑکے فوج کے کمیشن سے رد کئے گئے تھے۔ میرے ساتھ تو کان کے سوراخ کے سوا سارے ہی مسائل تھے۔ میرا وزن صرف پچانوے پاؤنڈ تھا اور گلے کے غدود تو ہمیشہ ہی تکلیف دیتے تھے اور کئی دفعہ ڈاکٹروں نے ٹانسل کا آپریشن تجویز کیا تھا۔ میں بہت ہی پریشان تھا کہ اتنی محنت اور اتنے اچھے نمبروں کے باوجود کہیں داخلے سے نہ رہ جاؤں۔ اس زمانے میں میرپورخاص میں ڈاکٹر چوہدری سول سرجن تھے۔ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے مجھے نہایت شفقت سے دیکھا اور میرا معائنہ اور خون کی جانچ کروائی۔ یہ تو ضرور کہا کہ ڈاکٹری ایک بہت مشکل اور محنت طلب پیشہ ہے اس لئے مجھے اپنی صحت بہتر بنانی چاہئے اور وزن بڑھانا چاہئے مگر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا اور مجھے پاس کر دیا اور سرٹیفکیٹ دے دیا۔ شاید اس میں اس چیز کا بھی عمل تھا کہ پورے صوبے میں اوّل آنے کی وجہ سے میرپورخاص کا ہر بااختیار فرد میڈیکل کالج میں میرے داخلے کے سلسلے میں جس طرح بھی ہو میری مدد کرنے پر آمادہ تھا۔ اس کے بعد ایک اچھے کردار کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت تھی جو مجھے ہمارے یونین کاؤنسل کے صدر سے حاصل کرنا تھا۔ سلطان انصاری صاحب اس کے صدر تھے نہ صرف وہ میرے بھائی کے ہم نام تھے بلکہ کالج میں ایک زمانے میں وہ بزم ادب کے صدر اور میرے بھائی سلطان عالم جنرل سکریٹری تھے۔ پھر اللہ کے فضل سے میری اپنی میرپورخاص میں ایک خاص

عزت تھی اس لئے اس کے حصول میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

اس کے علاوہ سندھ کا ڈومی سائل بھی ضروری تھا مگر ہم تو میر پور خاص میں پاکستان بننے سے پہلے ہی سے رہ رہے تھے اس لئے یہ سب سے آسان تھا پھر بھی روائتی طور پر اس میں بہت سی رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں پھر کلکٹر آفس میں بھائی جان کے کئی دوست تھے اس لئے مجھے فوراً ہی یہ کاغذ بھی مل گیا آخر میں مالی حالات کی سند داخل کرنی تھی۔ میرے واحد کفیل میرے بھائی تھے جو ستائیس سال کے تھے اور نا مساعد حالات کے تحت خود اپنی پڑھائی چھوڑ کر ریلوے میں گارڈ ہو گئے تھے۔ میرے پاس آج بھی یہ سارے کاغذات موجود ہیں۔ حکومت یقین دہانی چاہتی تھی کہ میں کالج میں مالی طور پر خود کفیل ہونگا اور میرا کنبہ پڑھائی کا بوجھ برداشت کر سکے گا۔ بھائی صاحب کی تنخواہ دو سو پچاس روپے ماہانہ تھی اور ہمارا کسی بنک میں کوئی اکاؤنٹ نہیں تھا۔ گھر کے افراد کی تعداد سات تھی مگر سلطان بھائی جان نے بالکل سچ اور سرکاری حلف نامہ داخل کیا کہ اس سے قطع نظر ہم کیا کھائینگے مگر انکی پہلی ترجیح میری تعلیم کے اخراجات ہونگے۔ ان تمام کاغذات کو اب، جبکہ اللہ تعالی نے مجھے اپنی رحمتوں سے نواز دیا ہے، میں دیکھتا ہوں تو میرے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

بہر حال یہ تمام ضروریات مکمل کرنے کے بعد ہم نے جام شورو میں کالج کے دفتر میں داخلے کی عرضی جمع کروادی اور اللہ سے لو لگا کر انتظار شروع کر دیا۔ مگر اس دفعہ معمول سے زیادہ وقت لگ رہا تھا۔ کوئی بتاتا بھی نہیں تھا کہ کیوں دیر لگ رہی ہے۔ پھر یہ ون یونٹ کا زمانہ تھا اور سندھ کے معاملات لاہور میں طے کئے جاتے تھے۔ ہر سال داخلے کی پالیسی بھی تبدیل ہو جاتی تھی۔ پورا طریقہ کار بہت پیچیدہ تھا کیونکہ مشرقی پاکستان سے بین الصوبجاتی پروگرام کے تحت اور بلوچستان سے جہاں کوئی میڈیکل کالج نہیں تھا لڑکے لیاقت میڈیکل کالج آتے تھے اسکے علاوہ وحدت مغربی پاکستان کی بھی کچھ نشستیں مخصوص تھیں۔ کھلی نشستوں پر داخلہ صرف ساٹھ لڑکوں کو ملنا تھا۔ مگر مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ پورے سندھ میں اوّل آنے کی وجہ سے میری نشست تو محفوظ ہے پھر بھی دل میں کچھ خدشے ابھر آتے تھے کہ میں ایک گمنام اور بے اختیار گھرانے کا فرد ہوں اور میں نے داخلے میں بدنظمی کی عجیب عجیب داستانیں سنی تھیں۔ جس سے میرا دل ڈر جاتا تھا۔ مگر یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ وہ سب غلط تھیں اور داخلے انتہائی ایمانداری اور صرف میرٹ کی بنیاد ہی پر ہوتے تھے۔ اسکی ایک مثال یہ ہے کہ جب اس وقت کے وزیر صحت سنجرانی کے بھائی کو غلط طور پر داخلہ دیا گیا تو ایک غریب اور حقدار لڑکے نے دعوہ دائر کیا جس کے نتیجے میں چھوٹے سنجرانی کا داخلہ منسوخ کر کے حقدار کو اس کا حق دیا گیا۔

اسی زمانے میں یہ اعلان ہوا کہ اس سال کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج اور لیاقت میڈیکل کالج کی نشستوں کو یکجا کر دیا جائیگا اور اب ایک نئی فہرست کھلی نشستوں کے لئے تیار کی جائیگی جس میں بلوچستان کے لڑکے بھی شامل ہونگے۔ اور اس اجتماعی داخلے کے لئے انٹرویو لیاقت میڈیکل کالج کے کیمپس پر لئے جائینگے جہاں لیاقت اور ڈاؤ کے پرنسپل صاحبان ایک ساتھ انٹر ویو لیں گے اس طرح کراچی کے امیدوار لڑکوں کو بھی جام شورو آ کر انٹرویو دینا ہوگا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا کیونکہ نہ اس سے پہلے یا اسکے بعد کبھی ایسا ہوا۔ یہ اتنا غیر معمولی واقعہ تھا کہ بہت سے لوگوں کی یاد سے یہ مٹ گیا ہے اور جب میں اس کا تذکرہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہوں تو وہ چونک کر کہتے ہیں ہاں یہ تو ہم بھول ہی گئے تھے کہ اس سال میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لئے اس طرح کی پالیسی اپنائی گئی تھی۔ اس نے میری پریشانی میں کچھ اضافہ کر دیا۔ ایک تو یہ کہ اس قسم کا طریقہ پہلی دفعہ ہو رہا تھا دوسرے مجھے معلوم نہیں تھا کہ کراچی، بلوچستان اور سندھ کی مشترکہ فہرستوں میں میں کہاں کھڑا ہوتا ہوں اور پھر یہ کہ اس قسم کے طریقہ کار میں بدنظمی کا امکان کہیں زیادہ تھا۔ مگر میں آج بھی اللہ تعالی کا شکر گذار ہوں کہ جب مشترکہ فہرست شائع ہوئی تو کراچی بلوچستان اور سندھ کے تمام لڑکوں میں میرا نمبر اوّل تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب اخبار ڈان کے اس شمارے کو میں نے محفوظ کرنے کی کوشش کی تو میری نئی نویلی بھابی نے (جن کی شادی چند ہفتوں پہلے ہوئی تھی اور وہ خود سندھ یونیورسٹی کی ایم اے کی طالبہ تھیں) مجھ سے کہا ''تم اس اخبار کو کیوں رکھ رہے ہو اب تو تمہارا داخلہ ہو ہی چکا ہے'' تو میں نے ان سے کہا کہ سالوں بعد اگر میرا بیٹا میڈیکل کالج کے داخلے میں ناکام ہوا تو میں اسے یہ اخبار دکھاؤں گا۔ اس پر وہ بہت ہنسیں کہ تم اتنا آگے کی سوچتے ہو!! (اب جبکہ میرا بیٹا ماشاءاللہ جوان ہے صورتحال یہ ہے کہ میرا بیٹا ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا وہ انسانی حقوق کے شعبے میں وکالت کرنا چاہتا ہے)۔

لیاقت میڈیکل کالج

بہر حال انٹرویو کا دن آ پہنچا۔ اس سے ایک دن پہلے ہم کالج کے کیمپس سے مانوس ہونے کے لئے لیاقت میڈیکل کالج گئے۔ لیاقت میڈیکل کالج کے بارے میں سنا تو بہت تھا اور درخواست وغیرہ کے سلسلے میں ایک آدھ بار مختصراً جانا بھی ہوا تھا مگر میں نے مکمل طور پر اس کے کیمپس کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا سندھ میں لیاقت میڈیکل کالج کا وہی مرتبہ اور عزت تھی جو انگلینڈ میں کیمبرج یا آکسفورڈ کی ہے۔ دراصل یہ کالج کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج سے بھی پہلے قائم ہوا تھا مگر پہلے اس میں LSMF کی ڈگری ملتی تھی۔ پھر ۱۹۵۲ میں اسے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم شہید ملّت لیاقت علی خان کے نام سے منسوب کر کے MBBS ڈگری کالج کا درجہ دیدیا گیا۔ شروع میں اسکی کلاسیں حیدر آباد کے سول ہسپتال میں ہوتی تھیں مگر ۱۹۵۷ میں اس کے نئے کیمپس کی تعمیر شہر سے تیرہ میل دور دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی جام شورو میں شروع ہوئی۔ ۱۹۶۱ میں کالج نئی عمارتوں میں منتقل ہوا۔ جب ہم داخل ہوئے تو اس وقت بھی کچھ عمارتوں کی تعمیر جاری تھی جب یہ تمام عمارتیں مکمل ہوئیں تو لیاقت کا کیمپس اپنی خوبصورتی، جدت، تکنیکی صلاحیتوں اور دوسری سہولتوں کے لحاظ سے نہ صرف

پاکستان بلکہ دنیا کے صف اوّل کے اداروں میں شامل کیا جاسکتا تھا۔اس کے علاوہ پاکستان کی حد تک اس کو اس بات کی وجہ سے بھی اولیت حاصل تھی کہ اس میں دانتوں کی ڈاکٹری کی فیکلٹی بھی تھی جو BDS کی ڈگری دیتی تھی اور جناح ہسپتال کے بعد یہ واحد میڈیکل کالج تھا جہاں جوہری توانائی یعنی نیوکلئر میڈیسن کا شعبہ بھی تھا۔اس موقعہ پر یہ لکھنا قارئین کی دلچسپی کا سبب ہوگا کہ جب میں ۱۹۷۰ میں امریکہ پہنچا اور ڈیٹرائٹ کے گریس ہسپتال میں اپنی ٹریننگ شروع کی تو مجھے ایک دھچکہ لگا کہ یہ ہسپتال اس قدر پرانا، اس قدر ٹوٹا پھوٹا اور تاریک تھا کہ میں بار بار سوچتا تھا کہ میں لیاقت میڈیکل کالج جیسے نگاہوں کو خیرہ کرنے والے ہسپتال سے کہاں آ گیا (اگر چہ اس ہسپتال میں تمام جدید سہولتیں اور مشینیں تھیں مگر یہ ہسپتال تقریبا ڈیڑھ سو سال پہلے بنا تھا اور وقت کے ہاتھوں اسکی عمارتیں شدید شکست و ریخت میں مبتلا تھیں۔دو ہی سال بعد اس کو مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا اور گریس ہسپتال ڈیٹرائٹ میڈیکل سنٹر کی نئی عمارت میں ضم کر دیا گیا)۔اسکے علاوہ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ پہلی دفعہ امریکہ آتے ہوئے جب میں پانچ دن کے لئے اپنے دوست چندر کے یہاں لندن میں ٹھہرا تو اسکا ہسپتال تو ڈیٹرائٹ کے ہسپتال سے بھی زیادہ قدیم اور بوسیدہ تھا۔ان وجوہات کی بنا پر لیاقت میڈیکل کالج کے طلبہ کو اپنے کالج پر ایک خاص فخر اور غرور تھا۔میں نے اپنی تعلیم کے پانچ سال لیاقت میڈیکل کالج کے نئے کیمپس میں گذارے۔شہر کے مرکزی ہسپتال میں جو قدرے پرانا تھا امراض زچہ و خواتین، ایمرجنسی جسے لال بتی کہا جاتا تھا اور بیرونی مریضوں (OPD) کے شعبے قائم تھے۔شہر کے کیمپس سے ہر گھنٹے پر بسیں چلتی تھیں تا کہ دونوں شاخوں کے درمیان رابطہ قائم رہے۔دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد ایک بل کھاتی سڑک ریلوے لائن کو پار کر کے کالج کی طرف جاتی تھی۔سب سے پہلے سیدھے ہاتھ کو ایک ''سرائے'' آتی تھی جس میں دور دراز سے آنے والے مریضوں کے رشتہ داروں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔اس کے بعد لڑکوں کے ہاسٹل شروع ہوتے تھے۔چار انتہائی وسیع و عریض ہاسٹل جو اسلامی تاریخ کے عظیم اطباء کے نام پر تھے علیحدہ علیحدہ بنے تھے۔پہلا۔ابن سینا ہال، دوسرا الراضی ہال، تیسرا النفیس ہال اور چوتھا الطبری ہال۔کل پاکستان میں یہ واحد کالج تھا جہاں ہر لڑکے کو اسکا اپنا کمرہ بلا شرکت غیرے الاٹ کیا گیا تھا اور ان کمروں کو بہترین فرنیچر سے سجایا گیا تھا۔زیادہ تر لڑکوں نے اپنے کمروں کو دیوار تا دیوار قالینوں یا اس زمانے کے فیشن کے مطابق دریوں سے آراستہ کیا ہوا تھا اور کھڑکیوں پر رنگین پردے تھے۔ہر ہاسٹل کا اپنا شاندار ڈائیننگ ہال اور بہت جدید کامن روم تھا۔درحقیقت جب دوسرے کالج کے لڑکے کبھی ہمارے کالج آتے تھے تو وہ حیران ہوتے تھے کیونکہ عام طور پر کالج ہاسٹلوں میں ایک کمرے میں چار لڑکوں کی رہائش ہوتی تھی۔وہ بھی اس درجے کی کہ بس چار پلنگ پڑے ہوتے تھے۔

اس کے بعد میڈیکل کالج ہاسپٹل تھا جس کی مین لابی چار منزلہ اونچی تھی اور اس لابی میں ایک جانب wrought iron سے مزین زینہ تھا اور درمیان میں لفٹ۔موزیک کا فرش آئینے کی طرح چمکتا تھا اور چہار طرف شیشے کی کھڑکیاں تھیں۔اس لابی سے ایک طویل راہدری نکلتی تھی جس کے دونوں جانب وقفے وقفے سے وارڈز بنے ہوئے تھے۔راہ داری ہسپتال کی پشت پر کھلتی تھی جس کے بعد ایک چھوٹی سڑک تھی جس پر نرسوں کا ہاسٹل ''فاطمہ ابوذر غفاری ہال'' اور اس کے پہلو میں لڑکیوں کا ہاسٹل ''زیب النساء ہال'' تھا۔مجھے نہیں معلوم کہ اب ان عمارتوں کا کیا حال ہے مگر اس وقت یہ عمارتیں آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں۔

میڈیکل کالج ہسپتال کی عمارت سے زاویہ قائمہ بناتی کالج کی عمارت تھی۔یہ انگریزی کے حرف "E" کی طرح تھی۔یہاں اناٹومی فزیالوجی فارمیسی اور تھیراپیوٹکس کے عظیم الشان آڈیٹوریمز تھے۔اناٹومی کا ڈسیکشن ہال جس میں انسانی جسم کا مطالع کرنے کے تجربات کئے جاتے تھے اس قدر وسیع و عریض تھا اور اسکی کئی منزلہ اونچی مخروطی کھڑکیاں اس قدر متاثر کن تھیں کہ ایک دفعہ جب لندن کے رائل کالج کا وفد معائنہ کرنے آیا تو انہوں نے اسکی تصویریں کھینچیں اور کہا کہ وہ نئے بننے والے کالجوں کو اس کی تصویریں دکھائیں گے اس کے علاوہ ہمارا بین الاقوامی معیار کا جمنیزیم جس میں اولمپکس سائز کا سوئمنگ پول تھا اپنی مثال آپ تھا۔اس میں ہفتے میں دو دن لڑکیوں کے لئے مخصوص تھے۔اس لئے لیاقت کے طلبہ کو اپنے کالج پر بڑا ناز اور فخر تھا جواب بھی ہے۔

تو میں، جو ایک نوعمر، کم حیثیت اور چند ہی روز پہلے انٹر سائنس کا امتحان پاس کر کے نکلا تھا ان عمارتوں اور اس کالج کی شان و شوکت اور عظمت و جبروت سے اس قدر متاثر ہوا کہ میرا دل بھر آیا اور ایک بار پھر میں اس شک و شبہ میں مبتلا ہو گیا کہ آیا میں اس قدر خوش قسمت ہونگا کہ اس کالج کا طالب علم بنوں۔کیونکہ بقول شخصے ''ہاتھ سے لبوں تک بڑا فاصلہ ہوتا ہے اور ابھی تو میں نے انٹرویو بھی نہیں دیا تھا۔انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں اور ہر قسم کے وہم میں مبتلا میں واپس ہوا۔گھر آ کر اللہ سے دعا مانگی کی کہ خداوندہ یہاں تک تو لے کر آیا ہے۔اب اس سے آگے بھی مجھے تیری ہی مدد درکار ہے۔

انٹرویو

دوسرے دن صبح نو بجے لیاقت میڈیکل کالج کے جام شورو کیمپس پر انٹرویو شروع ہونے تھے۔میرپور خاص حیدر آباد سے اکتالیس میل دور ہے۔اس وقت ان دونوں شہروں کے درمیان چھوٹی لائن کی ریل گاڑی جاتی تھی اور اس سفر میں ڈھائی گھنٹے لگتے تھے کیونکہ ایک تو گاڑی کی رفتار اٹھارہ یا بیس میل فی گھنٹہ تھی پھر یہ گاڑی ہر اسٹیشن پر رکتی تھی۔جام شورو حیدر آباد سے تیرہ میل مزید دور تھا۔میں نے اور رشید غوری نے صبح چار بجے کی گاڑی پکڑی۔ہم ساڑھے چھ بجے حیدر آباد اترے اور وہاں سے تانگہ لے کر ''مارکیٹ'' پہنچے جہاں سے جام شورو کے لئے بسیں جاتی تھیں۔ہم آٹھ بجے جام شورو کے کیمپس پہنچ گئے تھے۔یہاں ایک قیامت کا سماں تھا۔سندھ بلوچستان اور کراچی کے امیدوار لڑکے اور ان کے ساتھ ان کے والدین جمع تھے اور یہ جگہ تقریباً سب کے لئے نئی

تھی اس لئے عجب افراتفری کا عالم تھا۔اس کے علاوہ اس زمانے میں نئے لڑکوں سے بہت زیادہ چھیڑ چھاڑ جسے''فولنگ'' کہا جاتا تھا کا بہت رواج تھا اور کبھی کبھی یہ فولنگ تکلیف دہ حد تک غیر مہذب صورت اختیار کر لیتی تھی۔اس لئے ہر امید وار کے ساتھ اس کے والد یا بڑے بھائی تھے۔میں اور رشید اکیلے تھے مگر رشید کے شہر سانگھڑ کا ایک لڑکا یاسین کالج میں فائنل ائر میں تھا اور میر پور خاص کے میرے دو دوست لطیف چغتائی اور چندر نوتانی جو مجھ سے ایک سال آگے تھے اب کالج کے دوسرے سال میں تھے ہمارے محافظ بنے اور اس طرح ہم فی الحال اس تجربے سے بچ گئے پھر بھی چونکہ لیاقت اور ڈاؤ میڈیکل کالج میں ایک قسم کی مسابقت و مقابلے (rivalry) کی فضا تھی اس لئے کراچی کے کچھ لڑکوں کے ساتھ چند ناخوشگوار واقعات ہوئے اس لئے ماحول بڑی حد تک کشیدہ تھا۔

ہمیں اناٹومی کے شعبے میں بڑے آڈیٹوریم میں بٹھایا گیا۔انٹرویو بورڈ اسی شعبے کے ایک بڑے کمرے میں جو''بورڈ روم'' جیسا تھا میں ہو نا تھا۔سب سے پہلے لڑکیوں کا انٹرویو ہوا مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ لڑکیوں میں سب سے پہلے نسرین قاضی (جو بعد میں میرے ساتھ ہی گریجویٹ ہوئی اور پھر امریکہ میں اس نے پیتھالوجی میں سند حاصل کی) کو طلب کیا گیا تھا۔اس کے بعد لڑکوں کا نمبر آیا۔چونکہ میرا نمبر سب سے اوپر تھا اس لئے سب سے پہلے مجھے بلایا گیا۔اللہ تعالیٰ نے مجھے غضب کی خود اعتمادی عطا کی ہے جس کے مظاہرے میں اپنی کم عمری سے کرتا آیا تھا اس لئے میں بالکل بے خوف اور مکمل خود اعتمادی اور یقین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔اس وقت یہ سب کچھ تحریر کرتے ہوئے وہ لمحات میری نگاہوں میں جاگ اٹھے ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ میں انہی لمحوں میں جی رہا ہوں۔کمرہ بڑا اور بہت متاثر کن تھا۔ایک شفاف اور چمکدار بیضوی میز تھی جس کے چہار طرف کرنل نجیب جو لیاقت کے پرنسپل تھے اور ڈاکٹر شاہ جو ڈاؤ کے پرنسپل تھے، دونوں کالجوں کے شعبہ سرجری اور میڈیسن کے سربراہان کے ساتھ بیٹھے تھے۔اس کے علاوہ وزارت صحت کے جائنٹ سیکریٹری اور ایک دو اور افسران بھی تھے۔مجھ سے نام پوچھنے کے بعد دو چار معمولی اور عام سے سوالات کئے گئے جس میں یہ سوال بھی شامل تھا کہ میں ڈاکٹر کیوں بننا چاہتا ہوں۔کچھ سوال انٹر سائنس کے امتحان اور میرے مستقبل کے متعلق بھی تھے۔میں نے واضح کیا کہ میں سرجن نہیں بلکہ فزیشن بننا چاہتا ہوں اور پوسٹ گریجویٹ اور اس کے بعد کسی میڈیکل کالج میں طب کے شعبے میں کلینکل درس تدریس میرا خواب ہے۔اس پر لیاقت کے شعبہ سرجری کے صدر مرزا صاحب نے جو اپنے غیض و غضب کی وجہ سے مشہور تھے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا سرجری میں کیا برائی ہے۔میں نے نہایت دلیری سے جواب دیا''برائی تو کوئی نہیں مگر میری طبیعت ادھر مائل نہیں اور انسان کو وہی کام کرنا چاہئے جس کی طرف اس کا رجحان ہو''اس پر ڈاؤ کے پرنسپل، جو خود سرجن تھے مسکرائے۔مرزا صاحب پھر کچھ کہنے والے تھے کہ لیاقت کے شعبہ طب کے سربراہ پروفیسر صالح میمن صاحب میری مدد کو آئے۔یہ پروفیسر صالح صاحب سے میرا پہلا واسطہ تھا۔اس کے بعد تا حیات میرا ان سے قریبی تعلق رہا وہ میری ہمیشہ بے حد حوصلہ افزائی کرتے رہے اور میں ان کی آج بھی جب کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں، انتہائی عزت کرتا ہوں۔انہوں نے ہمیشہ مجھے بہت محبت، اور جب میں خود اس پیشہ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا بہت عزت سے نوازا۔ان سوالوں کے بعد ڈاؤ کے پرنسپل ڈاکٹر شاہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اس مشترکہ فہرست میں تمہارا نمبر اوّل ہے مگر تم نے داخلے کی ترجیح لیاقت میڈیکل کالج کو دی ہے۔میں تمہیں ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلے کی پیشکش کرتا ہوں۔میں نے کہا کہ آپ کا شکریہ مگر میں لیاقت ہی میں داخلہ چاہتا ہوں۔اس پر انہوں نے کہا''ایسا کیوں؟''میں ہمیشہ سے سادہ اور صاف گو رہا ہوں اس لئے میں نے صفائی سے کہا کہ میں کراچی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔کہنے لگے مگر تمہیں اسکالرشپ مل جائیگا۔اس پر میں نے ایک اور سچا جواب دیا کہ میری والدہ کہتی ہیں کراچی میں رہتے ہوئے تم اور لڑکوں کے ساتھ مل کر آوارہ ہو جاؤ گے۔اس پر لوگ مسکرائے۔شاہ صاحب کہنے لگے ایسا تو نہیں کیونکہ کراچی میں بھی بہت سے اچھے اور نیک کردار لڑکے ہوتے ہیں۔اس پر میں نے ایک اور حقیقت بیان کی کہ میں اپنے گھرانے سے بہت قریب ہوں اور ہر ہفتے میر پور خاص جانا چاہتا ہوں۔میں حیدرآباد سے میر پور خاص چھوٹی لائن کی گاڑی سے بلاٹکٹ سفر کر سکتا ہوں کراچی سے بڑی لائن پر یہ ممکن نہیں اور میرے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں۔اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا اور میری چھٹی کر دی گئی۔

انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا اور مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میڈیکل کالج میں میرا داخلہ یقینی ہے۔مگر ایک نئی زندگی اور تابناک مستقبل کے سُرور نے مجھے یہ موقعہ ہی نہیں دیا تھا کہ میں اس بات کو سوچوں کے آئندہ چند دنوں میں میری زندگی میں ایک ایسا پر آزمائش لمحہ آنے والا ہے کہ اگر مجھے ایک غیبی ہاتھ سہارا نہ دیتا تو شاید میری زندگی کی کہانی اس شعر کی تصویر ہو جاتی

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

''عشق مجھکو نہیں''

برطانیہ کی ادیبہ ہیلری مینٹل نے تھامس کروم ول کے تاریخی ناول ''وولف ہال'' کا''برنگ اپ دا باڈیز'' کے نام سے سیکوئیل لکھ کر پچاس ہزار پونڈ مالیت کا بکر پرائز دوسری بار جیت لیا ہے۔اس سے قبل یہ کارنامہ جنوبی افریقہ کے جے۔ایم۔کوئٹزی اور آسٹریلیا کے پیٹر کیری انجام دے چکے ہیں۔

○

''حیوانِ ناطق''

کفن کی جیب کہاں ہے؟

ستیہ پال آنند
(امریکہ)

یہ تین دن بہت بھاری ہیں مجھ پہ جانتا ہوں
مجھے یہ علم ہے، تم اپنے اختیارات کے تحت
مری حیات کا اعمال نامہ پرکھو گے
برائیوں کا، گناہوں کا جائزہ لو گے
تمہیں بتاؤں گا کہ اعمال میرے کیسے تھے
جو لین دین تھا، دھندہ تھا، کاروبار مرا
یہ اب میں کیسے کہوں، اس میں کچھ حرام نہ تھا!
(سبھی تو کرتے ہیں نقلی دواؤں کا دھندا!)
مگر یقین دلاتا ہوں اے فرشتو تمہیں
کہ میں نے چوری، زنا، ڈاکہ، غبن کوئی بھی جرم
نہیں کیا ہے جسے لائقِ تعزیر کہیں!

یہ تین دن بہت بھاری ہیں، پر ملک زادو
میں آدمی ہوں، ایک حیوانِ ناطق وادراک
کہ میں نے عمر گذاری ہے ایسی دنیا میں
جہاں پہ دولت واملاک کے مسائل کو
کسی کچہری میں دام ودرم سے حل کرنا
کچھ ایسی بھول بھلیّاں نہیں کہ ہو نہ سکے

یہ دنیا ہے تو الگ عالمِ فانی سے، مگر
کوئی تو ضابطہ ہوگا یہاں بھی مختص الامر
درم خریدہ عدل، خوں بہا کہ جس سے کسی
گناہ گار، خطار کار کی برّیت ہو
کروڑوں، اربوں کی دولت ہے ملکیت میری
اسے میں دینے کو تیار ہوں، فرشتو، کہو
مچلکہ ہو کہ ضمانت ہو، کوئی ہُنڈی ہو
مجھے بتاؤ، ادائی میں کس طرح سے کروں
خدارا جھوٹ نہ سمجھو کہ میری جیب میں ہے
یہ گوشوارہ مرے مال وزر کا، دیکھو تو!

کفن کی جیب کہاں ہے، کوئی بتائے مجھے!

○

روز وشب قیامت کے

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

کیا سناؤں، آہ اپنی داستان روز وشب
چیرتا رہتا ہے ظالم وقت کا آرا مجھے
اور پھر یہ مصلحت کہ چپ رہوں، زندہ رہوں
سچ تو یہ ہے میرے صبر وضبط نے مارا مجھے

نیند آئے، یا نہ آئے رات آتی ہے ضرور
اور مجھ کو روز آ کر قتل کر جاتی ہے رات
جیسے تیسے موت آتی ہے گھڑی بھر کے لیے
پھر سحر ہوتے ہی کھل جاتا ہے زخمِ کائنات

دھیرے دھیرے پھر شفق سے رِسنے لگتا ہے لہو
پھر اجالا پھیلتا ہے جیسے تازہ تازہ خوں
جا چکی ہوتی ہے ظالم رات اپنی جان سے
پھر خرد کے سائے میں پروان چڑھتا ہے جنوں

پھر لہو کی بوند جیسی صبح کی پہلی کرن
بند دروازے کی اک پتلی جھری سے آن کر
سونگھ کر لاشے کو میرے ڈھونڈتی ہے زندگی
چیخ اٹھتی ہے مجھے اس حال میں پہچان کر

چونک کر اٹھتا ہوں میں اور سوچتا ہوں اے خدا
رات کا مارا ہوا کس طرح زندہ ہوگیا
صبح کا ہنگامہ ہے یہ صور اسرافیل ہے؟
کیا قیامت آ گئی؟ کیا حشر برپا ہوگیا؟

○

نوبتِ انتخابات بجنے لگی

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

آمریت کے لاشے کو کاندھا دیئے
ایک مدت ہوئی
عہدِ جمہوریت
دوسرے مرحلے کی طرف رواں
چوبِ اہلِ سیاست تھرکنے لگی
ضرب پڑنے لگی
نوبتِ انتخابات بجنے لگی
شور ہونے لگا، دھوم مچنے لگی

سبز باغوں میں پھر سے بہار آ گئی
پھول کھلنے لگے، پات ہلنے لگے
جھوٹ کی ڈالیاں رقص کرنے لگیں
اور دھوکے کا سبزہ لہکنے لگا
خواب اگنے لگے
پھر سے چوروں میں گٹھ جوڑ ہونے لگی
منہ میں لالچ کا پانی اترنے لگا
رال بہنے لگی

بھوکے مزدور اور فاقے کرتے کساں
بوڑھے، بچے، جواں، مرد و زن، ناتواں
مفلسی کی پھٹی چادروں میں چُھپے
پھر نظر آ گئے
لیڈروں کے دل و ذہن پر چھا گئے
جھوٹے وعدوں کی چربی میں لتھڑے ہوئے
لفظ
اہلِ سیاست کی گفتار میں
آنے جانے لگے
نوبتِ انتخابات بجنے لگی
شور ہونے لگا، دھوم مچنے لگی

کرِسمس

جاوید زیدیؔ
(ہیوسٹن)

ہر برس دسمبر میں
سوچتا ہوں اکثر میں
بتیاں خریدوں گا
گھر کو جگمگاؤں گا
اور پڑوسیوں کے سنگ
کرسمس مناؤں گا
پھر غریب بچوں کو
تحفے دینے گھر گھر میں
مُسکراتا جاؤں گا
اُن کے غم بٹاؤں گا
اپنے بھول جاؤں گا

بس انہی خیالوں میں
عمر گزری جاتی ہے
وقت سمٹا جاتا ہے
میرے اپنے بچے بھی
یوں بزرگ لگنے لگے
بات چیت سے اُن کے
حوصلے ٹپکنے لگے
ولولے مچلنے لگے
اُن کی زندگی کے الگ
قافلے سے چلنے لگے
اور میں کہ رستوں پر
دُھول بن کے بیٹھ گیا
زیست کے سفر کی ایک
بھُول بن کے بیٹھ گیا!

ہر برس دسمبر میں
چھٹیاں بھی آتی ہیں
اور مجھ کو تنہا یوں
گھر میں چھوڑ جاتی ہیں
ساحلوں پہ ناؤ کوئی
اجنبی مسافر کو
جیسے چھوڑ جاتی ہے
لہر جیسے پانی کی
ریت چھوڑ جاتی ہے
خواب کے گھروندے کو
توڑ پھوڑ جاتی ہے!

ریت کے یہی ذرّے
ساحلِ خیال پہ کچھ
اس طرح چمکتے ہیں
جس طرح ''کرسمس'' پر
قمقمے بھی جلتے ہیں
آؤ دشتِ غربت میں
ہم بھی روشنی کر لیں
آؤ تھوڑی دیر سہی
ہم بھی زندگی کر لیں
اجنبی زمینوں کو
دوستی کی شبنم سے
مائلِ کرم کر لیں
اس جہانِ وحشت کو
مل کے سب اِرم کر لیں

سچا رنگ

عظمیٰ صدیقی
(لندن)

میرے چہرے کے نقوش
میرا بدن
میرے خدوخال
میرا رنگ
ہاں یہی کچھ تو دیکھا تھا
اُس نے مجھ میں
تمام ظاہری عناصر
علاماتِ بہارِ مختصر
جسم کو روح پر
دے دی تھی فضیلت اُس نے
چند لمحوں کا اسیر
نظر کا کیف وسرور
روح کی سچائی سے دور
تقدیس سے دور
وقت کے زاویوں میں
مہ وسال کے آئینوں میں
یہ سارے عکس معدوم ہوئے
یہ سارے پھیکے پھیکے رنگ
یہ سارے جھوٹے جھوٹے رنگ
فقط ایک ہی رنگ تھا سب سے سچا
سدا ایک ہی رنگ تھا سب سے پکا
میری روح کا سچا ستھرا رنگ
خوبصورت، صادق، لافانی

○

ساعت

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

زبانِ تصوف میں جو کچھ لکھا ہے
یہی کچھ لکھا ہے
ازل سے ابد تک فقط ایک ساعت
مجھے کیا خبر ہے کہ میں ہوں نہیں ہوں
اگر ہوں کہاں ہوں
کہاں سے چلا ہوں کہاں آ گیا ہوں
مجھے کس نے بھیجا
کہ ساعت برابر نہ ساعت سے بڑھ کر
ٹھہرنے کی مہلت مجھے کون دے گا
ٹھہرنا کہاں ہے
کہ صبحِ ازل سے اسی کارواں میں
جو شامل ہوا ہے
سفر شرط ٹھہری
سو لازم ہے مجھ پر کہ شامِ ابد تک
اسی کارواں میں
افق تا افق رہنمائی کی خاطر
نصابِ سفر کے اصول وضوابط کو
پیش نظر رکھ کے دیکھوں
زبانِ تصوف میں جو لکھا ہے
یہی کچھ لکھا ہے
ازل سے ابد تک فقط ایک ساعت
وہ ساعت ہے یا عالم کیف وکم ہے
مجھے کیا خبر ہے کہ میں ہوں نہیں ہوں

○

قطعات

صفوت علی صفوت

(یو۔ایس۔اے)

بیٹی کی رُخصتی پر

پھر آشیاں چمن میں بنانے کی دھوم ہے
اک دِل کو دوسرے سے ملانے کی دھوم ہے
سمدھن نے یوں کہا ہے کہ یہ رُخصتی نہیں
ثمرہ کی آج گھر مرے آنے کی دھوم ہے

یوحنّٰی کی انجیل (باب نمبر۱۰) پڑھنے پر

جو یہودی ہیں رسولوں کو خدا کہتے ہیں
جو نصریٰ ہیں وہ تینوں کو خدا کہتے ہیں
سُن کے صفوت نے نصیری سے کہا ہے لکھ دے
ہم محمدؐ کے غلاموں کو خدا کہتے ہیں

مریخ پر NASA کی۔ "Curiosity" Rover

کیوریاسٹی نامی طرز کا ہے اک دور
کام اسکے اعلیٰ ہیں فعل اس کے ہیں اوپر
ہم بھی ایک دن صفوت ہورہیں گے مریخی
راستہ یہی اپنا قافلے کا یہ رہبر

❍

ماہیے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

نقشہ یہ پرانا ہے
دیوار پہ نہ ٹانگو
یہ دور نیا سا ہے

مصلوب تمنا ہوں
شہر نگاراں میں
ہر سمت تماشا ہوں

کچھ بات نہ بنتی ہے
دل کی شہہ رگ بھی
ایک پھول سے کٹتی ہے

اس طرح نہ سمجھا کر
وقت کی میزاں پر
تہذیب کو تولا کر

پُر کیف نظاروں میں
مستی صبا ہے
شبنم کی نگاہوں میں

آشفتہ سری میری
شہر میں آئی ہے
صحرا میں پریشاں تھی

❍

ماہیے

قیصر نجفی (کراچی)

حمدیہ

باغی کہلاؤ گے
کس کس نعمت کو
رب کی جھٹلاؤ گے

احسان ہے مالک کا
جسم اور جاں کا مرے
قائم ہے ابھی رشتہ

مت مانگو دنیا سے
مانگو سدا لوگو
اس واحد یکتا سے

فن تیری عنایت ہے
ذکر ترا یارب
شعروں کی عبادت ہے

یہ عشق احد کا ہے
لمحوں کی ہے فرقت
اور وصل ابد کا ہے

○

نعتیہ

آنکھوں کی صدائیں سُنیں
روضۂ سرورؐ پر
بے حرف دعائیں سُنیں

وہ پارس ہوتے ہیں
پاؤں سے جو تیرے
پتھر مس ہوتے ہیں

اے چاند مدینے کے
داغ دکھا میرے
سرکارؐ کو سینے کے

ایسا نہ کوئی دیکھا
جس پہ دُرود و سلام
اللہ نے ہو بھیجا

آخر میں ہیں نبیوں کے
پر ہیں گواہ ان کی
خلقت کی گھڑیوں کے

○

ناگفتی کا عذاب

مظہر بخاری
(میاں چنوں)

چاروں جانب تاریکی ہے اور اِک گہری چپ
میں تنہا کمرے میں بیٹھا
اپنے آپ میں گم
کوئی نہیں ہے جس سے کھل کر
دل کی بات کہوں
تنہائی کہتی ہے مجھ سے
میں خاموش رہو

لمحۂ فکر۔۔؟؟؟

پھول، پتّے جھڑ چکے ہیں
تتلیاں خاموش ہیں
بالکونی پر پرندے نوحہ خواں ہیں
ہر طرف لاشیں ہی لاشیں
خطبہ زن ہے واعظِ کم فہم ممبر پر کھڑا
دے رہا ہے جنت الفردوس کی سب کو وعید

○

''قربتیں۔۔اور۔۔فاصلے''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

جو پاس ہو۔۔۔
تو بہت فاصلہ سا لگتا ہے۔۔۔
جو دُور ہو۔۔۔
تو بہت قربتیں سی لگتی ہیں۔۔۔
یہ دُور و قرُب کا عُقدہ کبھی کھُلے بھی تو۔۔۔
جو فاصلے ہیں۔۔۔
وہ قربت کو حسن دیتے ہیں۔۔۔
جو قربتیں ہیں۔۔۔
وہ دُوری کو معنی دیتی ہیں۔۔۔
یہ قرب و فاصلہ باہم دِگر ہے اُلجھا ہوا۔۔۔
ہے کون جانے کہ۔۔۔
ہر قرب دُوریوں سے سجا۔۔۔
اور۔۔۔
فاصلوں میں کہیں قربتیں بھی ہوتی ہیں۔۔۔!

○

خواہش

زاہدہ عابد حنا
(لاہور)

اُسے بارش کی خواہش تھی
جنوں بھیگی رُتوں کا تھا
محبت چاندنی سے تھی
لگاؤ جگنوؤں سے بھی۔۔۔
مگر تکمیلِ خواہش میں
خود اپنے دل کی وحشت میں
نہ یہ بھی جان پائی وہ
کہ جب بارش کا موسم ہو
تو پھر جگنو نہیں ملتے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
بہت بھیگی ہوئی رُت ہو
تو اکثر چاندنی بھی رُوٹھ جاتی ہے
عجب ارمان تھا اس کا
کہ دل نادان تھا اس کا
وہ بھیگی رُت میں جگنو اور ستارے ڈھونڈتی رہتی
اُسے یہ بھی خبر کب تھی؟
کہ جب طوفانی بارش ہو
تو جگنو کھو بھی جاتے ہیں۔۔۔!
اُسے سمجھاؤں، تو کیسے؟؟
مقدّر سو بھی جاتے ہیں۔۔۔!!

❍

وشال کھلّر (لدھیانہ، بھارت)

اقبالؔ کی نذر

حل کروں گا
مسئلے سب
سوچتا ہوں

جانتا ہوں
یہ نہیں ممکن
نہیں بالکل نہیں

ہاں، یہ ممکن ہے
خود کو سستہ بیچ ڈالوں

لوگ کہتے ہیں
انا
میری خودی کو
اے مرے اقبالؔ
میرے پیر و مرشد

نیا سال

نیا سال آیا
پہیلی نئی ساتھ لایا
ہمیشہ
گئے سال کی ہی طرح
حل کروں
یا نئی کوئی ترکیب ڈھونڈوں۔۔۔

۔۔۔دسمبر
کرے گا بیاں
یہ گرہ
کچھ کھلی کہ نہیں
جب مرادھیان ہوگا
نئی اک پہیلی کی جانب!

ہمارا گشتی ادب

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

(کراچی)

دانشوروں کو شکایت ہے کہ ہمارا ادب جمود کا شکار ہے۔انھیں چاہئیے کہ بسوں،ٹرکوں،ٹیکسیوں اور رکشوں کے پیچھے پینٹ کیے ہوئے نظم ونثر کے اُن شاہکاروں پر بھی نظر ڈال لیا کریں جو دن رات حرکت میں رہتے ہیں۔یہ عوامی ادب ہے اور چونکہ عوام اپنی خالی جیبوں اور خالی پیٹوں کے باوجود ''طاقت کا سرچشمہ'' ہوتے ہیں لہٰذا اُن کا ادب زبان وبیان،تفکّر وتخیّل ،اسلوب وقواعد کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔یہ ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے فرسودہ نظریات سے بھی ماورا ہے۔اس کا مرکزی خیال ہے۔۔۔ادب برائے عبرت!

ایک دوست نے بتایا کہ ایک روز وہ ٹیکسی کے انتظار میں اپنے گھر کے باہر کھڑے تھے۔انھوں نے ایک ٹیکسی رکوائی۔اُس وقت وہ بہت جلدی میں تھے لیکن جب ٹیکسی اُن کے آگے آ کر رکی تو وہ اس میں نہیں بیٹھے۔اُس کے پیچھے لکھا ہوا تھا ''کیا آپ نے اللہ سے ملاقات کی تیاری کر لی ہے؟'' بعض گاڑیوں کے پیغام بڑے معنی خیز ہوتے ہیں۔1960ء کے عشرے میں ہم اسکوٹر چلاتے تھے۔ہمیں ایک روز ٹرک نے سائڈ سے ہلکی سی ٹکّر ماری۔ہم نے سڑک پر گرتے ہی آگے نکل جانے والے ٹرک پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔لکھا تھا ''اچھا دوست پھر ملیں گے۔'' یعنی آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ صرف تمہارے کپڑے خراب ہوئے اور معمولی خراشیں آئیں،بقیہ ''مرمّت'' اگلی ملاقات پر!

پاکستان میں چلنے والی گاڑیوں کا ایک پسندیدہ جملہ ہے: ''پپّو یار تنگ نہ کر۔'' یہ پپّو کون ہے،اس کا حسب نسب کیا ہے اور یہ اپنے دوستوں کو کیوں تنگ کرتا ہے،کوئی نہیں جانتا۔ایک ڈرائیور کی زبانی معلوم ہوا کہ پپّو ہر وہ ڈرائیور ہے جو آگے جانے والی کسی گاڑی کو اوورٹیک کرنے کی خاطر مسلسل ہارن بجاتا ہے۔ظاہر ہے اسے راستہ تو نہیں ملتا لیکن ایک بے ضرر سا پیغام ضرور مل جاتا ہے۔یہ پیغام اتنا مقبول ہوا کہ اس پر ''جنون گروپ'' نے ایک جوشیلا گانا بنالیا جو خوب چل رہا ہے۔

بعض ڈائیور جو مذہبی رجحان رکھتے ہیں اپنی گاڑیوں پر تبلیغی جملے پینٹ کراتے ہیں مثلاً ''نماز پڑھو۔موت کو مت بھولو۔سب یہیں رہ جائے گا'' وغیرہ۔بعض گاڑیاں اخلاقی درس دیتی ہوئی گزرتی ہیں جیسے ''محنت کر،حسد نہ کر۔سڑیا نہ کر چندا۔دعا کر''۔دیکھیے ہمارا گشتی ادب کتنی مثبت سوچ کی عکاسی کر رہا ہے۔

جو گاڑیاں،خصوصاً ٹینکر،کراچی سے پشاور کے درمیان چلتے ہیں ان کی پشت پر صدر ایوب کی فوجی یونیفارم میں تصویر پینٹ کی ہوئی ہوتی ہے اور نیچے لکھا ہوتا ہے: ''تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد۔'' یہ الفاظ پورے پاکستان کے جذبات کی ترجمانی تو شاید نہ کرتے ہوں لیکن ماضی کی معرکہ آرا فلم ''آن'' کے ایک گیت کے ان بولوں میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک باب پوشیدہ ہے۔1958ء سے 1968ء تک کا عشرہ جسے اُس وقت کے حکمرانوں نے ''عشرۂ اصلاحات وترقی'' قرار دیا تھا جب اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا تو برسرِ اقتدار صدر پاکستان،مسلح افواج کے سپریم کمانڈر،برّی فوج کے کمانڈر انچیف،پاکستان مسلم لیگ(کنونشن)کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی مقبولیت اس حد تک گر چکی تھی کہ پورے ملک کے در و دیوار ''ایوب ... ہائے ہائے'' (خالی جگہ میں ایک بھونکنے والی مخلوق کا نام لکھ لیجیے) کے نعروں سے گونج رہے تھے۔اب کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جیسا بھی تھا،وہ دور آج کے دور سے بدرجہا بہتر تھا۔

بہت سے ٹرکوں پر لکھا ہوتا ہے ''نصیب اپنا اپنا۔'' رکشوں پر اس کا پشتو ترجمہ ''نصیب اخپل اخپل'' آنے لگا ہے۔بعض گاڑی والے دوسری گاڑی والوں کو ٹریفک کے قواعد سکھاتے پھرتے ہیں مثلاً ''ہارن دے کر پاس کریں'' یا ''گاڑی سے فاصلہ رکھیں'' جبکہ بعض دوسروں کو کھلّم کھُلاّ چیلنج دیتے ہیں ''ہمت ہے تو پاس کر۔'' ہمارا مشورہ ہے کہ ایسا ''وحشیانہ'' چیلنج کبھی قبول نہ کریں۔رکشوں کی پسندیدہ عبارت ہے ''ماں کی دعا،جنت کی ہوا۔'' بھائی آپ ''ماواں ٹھنڈیاں چھاواں'' سے زیادہ دعائیں کیوں نہیں لیتے؟ کیا خدمت میں کچھ کسر رہ گئی جو آپ رکشہ پر رکے ہوئے ہیں؟ ویسے ایک رکشہ اس سلسلے میں پُر امید نظر آیا۔اس کے پیچھے لکھا تھا ''میں بڑا ہو کر ٹرک بنوں گا۔''

یہ تو ہوا نثری ادب۔اب شاعری کے چند نمونے دیکھیے۔چونکہ یہ گھومتی پھرتی اور ہلتی جلتی رہتی ہے اس لیے اکثر اپنا توازن کھو بیٹھتی ہے جو ایک فطری امر ہے۔ایک رکشہ کے پیچھے یہ ''شعر'' نظر آیا۔

اِدھر تو دیکھ لے ظالم تمنا ہم بھی رکھتے ہیں
اگر تو فورڈ رکھتا ہے تو رکشہ ہم بھی رکھتے ہیں

بہت سی گاڑیاں اپنے چلانے والوں کے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہیں۔

ڈرائیور کی زندگی بھی کیا کھیل ہے
اگر موت سے بچ جائے تو سینٹرل جیل ہے

کبھی کبھار کوئی کام کا شعر بھی مل جاتا ہے۔حیدر آباد جانے والی ایک بس کے اندر لکھا ہوا یہ شعر ہمیں بہت پسند آیا۔

خدا جانے دمِ آخر مریضِ غم پہ کیا گزری
شکن بستر کی کہتی ہے کہ دم مشکل سے نکلا تھا

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے محبوب کے حضور اپنی بے بضاعتی اس طرح ظاہر کی۔

ستارے توڑ کر لاتا تری خاطر مگر جاناں
وہاں تک ہے سفر مشکل مری گاڑی نہیں جاتی

باقی صفحہ ۸۶ پر ملاحظہ فرمائیں

ایک صدی کا قصہ
یش چوپڑہ

دیپک کنول (ممبئی' بھارت)

یش چوپڑہ کو بالی وڈ'' رومانس کا بادشاہ'' کے نام سے جانتی ہے۔یش چوپڑہ جس کا پورانام یش راج چوپڑہ تھا،مشہور فلمساز اور ہدایت کا بلدیو راج چوپڑہ کا چھوٹا بھائی تھا۔یش راج 27 ستمبر 1932 کو لاہور میں پیدا ہوا تھا۔اُنکے والد ولائتی راج چوپڑہ ایک سرکاری ملازم تھے اور وہ برٹش دور حکومت میں ہندوستان کے پبلک ورکس ڈیپارٹ مینٹ میں بطور اکاؤنٹنٹ کام کرتے تھے۔اُنکے آٹھ بچے تھے۔یش چوپڑہ ان آٹھ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔اُسکا بڑا بھائی اُس سے تیس سال بڑا تھا۔دوسرے نمبر پر بی۔آر۔چوپڑہ تھا جو کہ پیشے سے ایک فلمی صحافی تھا۔یش چوپڑہ کی پرورش لاہور کے مکان میں بی۔آر۔ چوپڑہ کی زیر نگرانی ہوئی۔سن 1945 میں وہ مزید پڑھائی کے لئے لاہور سے جالندھر چلا گیا۔بعد میں وہ جالندھر سے لدھیانہ منتقل ہوگیا۔

ملک کا بٹوارہ ہونے کے بعد اُنکی پوری فیملی کو لاہور چھوڑ کر دلی آنا پڑا۔یش چوپڑہ کی خواہش تھی کہ وہ انجینئر بن جائے۔گھر والے اُسے انجینئرنگ کا کورس کرنے کے لئے انگلینڈ بھیجنا چاہتے تھے۔اُدھر اُنکے بڑے بھائی بی۔آر۔ چوپڑہ نے بمبئی کی فلمی نگری میں اپنے قدم جما لئے تھے۔اپنے بھائی کی کامیابی کو دیکھ کر یش چوپڑہ کو بھی فلمی دنیا کی چمک دمک اپنی اور کھینچنے لگی۔اُسنے انجینئرنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور دلی چھوڑ کر اپنے بڑے بھائی بی۔آر۔چوپڑہ کے پاس بمبئی پہونچ گیا ۔چوپڑہ صاحب چاہتے تھے کہ اُنکا چھوٹا بھائی اونچی تعلیم حاصل کرے پر یش کا من تو پڑھائی سے ہٹ کر فلموں کی طرف راغب ہو گیا تھا۔ایک دن چوپڑہ صاحب نے یش کو اکیلے میں لے جا کر پوچھا کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے تو اُسنے برجستہ کہہ دیا کہ وہ بھی اُن کی طرح فلم ڈائرکٹر بننا چاہتا ہے اور اُن کے ساتھ رہ کر فلم ہدایت کاری کی باریکیاں سیکھنا چاہتا ہے۔ چوپڑہ صاحب نے کچھ دیر سوچا اور پھر بڑے پیار سے یش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میرے ساتھ رہ کر تم کچھ بھی نہیں سیکھ پاؤگے کیونکہ تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔اگر تم واقعی ہدایت کاری سیکھنے میں سنجیدہ ہو تو میری صلاح مانو۔تم کسی نامی ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ بن جاو۔تم چاہو تو میں اپنے کسی دوست سے بات کرلوں گا۔کہو تو میں راجکپور، محبوب خان یا بمل رائے کے ساتھ بات کر کے تمہیں ان میں سے کسی کے ساتھ بھی کام کرنے کا چانس دلا سکتا ہوں کیونکہ یہ سبھی میرے دوست ہیں۔وہ میری بات کو ٹالیں گے نہیں۔یہ سب منجھے ہوئے ڈائرکٹر ہیں۔تمہیں اُن سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔''

یش چوپڑہ اپنے بھائی کو چھوڑ کر کہیں اور جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ بچپن سے لے کے اُنھیں کی دیکھ ریکھ میں پلا تھا۔وہ تو صرف اپنے بھائی صاحب کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔چوپڑہ صاحب بھی یش کو اپنے بچے کی طرح چاہتے تھے۔جب یش کسی اور کے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی نہ ہوا تو بی۔آر۔چوپڑہ نے اُسے چند دنوں کے لئے اپنے زمانے کے مشہور کامیڈین آئی۔ایس۔جوہر کے ساتھ معاون کے طور پر کام کرنے کے لئے منا لیا۔آئی۔ایس۔جوہر چوپڑہ فیملی کے بہت قریب تھا۔یش چوپڑہ انہیں قریب سے جانتا تھا اسلئے وہ بھی آئی۔ایس۔جوہر کے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی ہوگیا۔وہ اُن دنوں ایس مکھر جی کی فلم'' ناستک'' کی ہدایت کاری میں مصروف تھے۔یش چوپڑہ ایک ہلپر کی حثیت سے کام کرنے لگا۔ایک رات ایس مکھر جی صاحب سیٹ پر آگئے اور اُنھوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے جوہر سے کہا کہ اُس نے فلم کی تکمیل میں کافی وقت لگایا ہے۔اُسے آج رات اس فلم کو مکمل کرنا ہوگا۔جوہر صاحب اپنی بذلہ سنجی کے لئے کافی مشہور تھے۔اُنہوں نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا۔''حضور آپ کیوں چنتا کرتے ہیں۔ہم آج ہی فلم کا دی اینڈ کر دیتے ہیں۔یش اُنکی باتیں پیچھے کھڑے ہو کر سن رہا تھا۔وہ یہ باتیں سن کر کافی اُداس اور فکر مند ہوا۔جونہی پیک اپ ہوا تو وہ اسٹوڈیو سے نکل کر سیدھے من موہن کرشن کے گھر پر چلا گیا۔منموہن کرشن اپنے زمانے کے مشہور ایکٹر تھے اور بی۔آر۔ چوپڑہ کے دست راست تھے۔یش چوپڑہ نے من موہن کرشن کو اپنی فکر و تشویش سے آگاہ کیا اور اُسے اس بات کے لئے منا لیا کہ وہ بی۔آر۔چوپڑہ کو سمجھا کر اُنہیں اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی کرلیں۔

اگلے روز منموہن کرشن چوپڑہ صاحب سے ملا اور اُنھیں یش کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ کرلیا۔وہ فلموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔فلمی تیکنیک کے بارے میں اُسکی معلومات صفر تھیں۔اُسے apprents کے طور پر رکھا گیا۔اُسکا کام اداکاروں کو سیٹ پر بلانا یا پروڈکشن کا کوئی چھوٹا موٹا کام کرنا ہوتا تھا۔اسی طرح کام کرتے کرتے وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔1951 میں بی۔آر۔چوپڑہ کی بحثیت ہدایت کار پہلی فلم''افسانہ''تھی جو بیحد کامیاب رہی تھی۔اس فلم سے بی۔آر۔ چوپڑہ نے اپنی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔پھر 1955 میں اُنکی ایک اور فلم آئی جس کا نام''ایک ہی راستہ'' تھا۔یہ فلم اگرچہ باکس آفس پر اتنی کامیاب نہ رہی مگر بی۔آر۔چوپڑہ کے کام کی ہر ایک نے تعریف کی۔سن 1955 میں ہی بی۔آر۔ چوپڑہ کی فلم کمپنی بی۔آر۔فلمز نے جنم لیا۔پہلی فلم جو بی۔آر۔چوپڑہ نے بنانے کا فیصلہ کیا وہ فلم نیا دور'' تھی۔

یش چوپڑہ بی آر۔چوپڑہ کی صحبت میں رہ کر فلم سازی کی باریکیوں سے بہت حد تک واقف ہوگیا تھا۔یش چوپڑہ نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ معاون کے طور پر ایک فلم کی تھی جس کا نام''ایک ہی راستہ تھا''۔چونکہ وہ بی۔آر۔چوپڑہ کا لاڈلا بھائی تھا اسلئے چوپڑہ صاحب یش کو ایک پل کے لئے بھی اپنی

نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے تھے۔فلم ''نیا دور'' نے لیش چوپڑہ کو ہندی فلموں کے عظیم اداکار دلیپ کمار کے بیحد قریب کردیا۔دونوں پنجابی نژاد۔سیٹ پر دونوں پنجابی میں ہی گفتگو کرتے تھے۔علاوہ ازیں دونوں انڈے کھانے کے بڑے شوقین تھے۔انڈوں کولیکر اُنکے بیچ مقابلہ آرائی شروع ہوتی تھی۔اُنکی یہ دوستی آخری لمحے تک برقرار رہی۔اس بیچ فلم ''نیا دور'' سن 1957 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم نے ملک بھر میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے تھے۔اس فلم نے بی۔آر۔چوپڑہ کوشہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچادیا۔

وہ اس فلم کی کامیابی سے اسقدر سرشار تھے کہ اُنہوں نے اپنی اگلی فلم خود ڈائرکٹ نہ کرکے اپنے کسی اسسٹنٹ سے ڈائرکٹ کرانے کا فیصلہ کیا۔اخلاقاً اس فلم کوڈائرکٹ کرنے کا چانس اُنکے چیف اسسٹنٹ کوملنا چاہے تھامگر وہ بھائی کی محبت میں ایسے گرفتار تھے کہ اُنہوں نے اس فلم کوڈائرکٹ کرنے کے لئے دو دو ڈائرکٹروں کا انتخاب کیا۔ایک اُنکا چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا اور دوسرا لیش چوپڑہ۔لیش چوپڑہ اُنکے ساتھ معاون ہدایت کار کے طور پر تین فلمیں کر چکا تھا۔''ایک ہی راستہ'' ''سادھنا'' اور ''نیا دور'' وہ کسی اور کے ساتھ اپنی پہلی فلم ڈائرکٹ کرنا نہیں چاہتا تھا مگر بھائی سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑرہی تھی۔بہر حال وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ چلو فلم تو ملی ڈائرکٹ کرنے کے لئے۔اسی بیچ قسمت نے لیش کے ساتھ یاوری کی۔اُسے ایک باہر کی فلم ڈائرکٹ کرنے کی آفر ملی۔وہ اپنے بھائی کے پاس گیا اور اُس سے کہا کہ اُسے ایک فلم ڈائرکٹ کرنے کی آفر ملی ہے اسلئے وہ گھر کی فلم نہیں کرپائیں گے۔بی۔آر۔چوپڑہ لیش کوکسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ بی۔آر۔فلمز کے لئے ایک جزولانفیک کی طرح تھے اس لئے چوپڑہ صاحب نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور لیش کو اکیلے ہی فلم ڈائرکٹ کرنے کوکہا۔لیش کے من کی مراد پوری ہوگئی اور وہ پوری شدومد کے ساتھ فلم بنانے میں جٹ گیا۔اس فلم کا نام ''دھول کا پھول'' تھا۔اس فلم میں پہلے راجکمار کوسائن کیا گیا۔راجکمار کولیش کی قابلیت پر بھروسہ نہ تھا۔لیش نے ایک دن راجکمار کوکسی سے یہی باتیں کرتے سنا۔اس سے پہلے کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑجائیں وہ فوراً اپنے بھائی کے پاس شکایت لے کر گیا۔بی۔آر۔چوپڑہ نے اُسی وقت راجکمار کواس فلم سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کردار کے لئے راجندر کمار کوسائن کیا گیا۔

فلم زبردست ہٹ رہی۔اس فلم کا یہ گانا ''تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا۔انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا'' آج بھی بھائی چارے اور یکجہتی کا پیغام دیتا ہے۔شاید بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ لیش چوپڑہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح اُردو ادب کا بڑا دلدادہ تھا۔دونوں بھائی ساحر کے دیوانے تھے۔اُنکی ہر فلم میں ساحر ہی گیت لکھا کرتے تھے۔اس فلم کی کامیابی کے بعد لیش چوپڑہ نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔1961 میں اُسنے بی۔آر۔فلمز کے بینر تلے ایک اور فلم بنائی جس کا نام ''دھرم پتر'' تھا۔لیش چوپڑہ بٹوارے کے درد کوجھیل چکا تھا اسلئے وہ اس موضوع پر ایک سنجیدہ فلم بنانا چاہتا تھا۔اس فلم کے مرکزی کردار میں ششی کپور، مالاسنہا اور اشوک کمار تھے۔افسوس کہ فلم چل نہ پائی۔

سن 1965 میں بی۔آر۔فلمز کے بینر تلے ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''وقت'' تھا۔یہ پہلی ملٹی اسٹار فلم تھی جس میں اُس دور کے ٹاپ ایکٹر کام کررہے تھے۔چوپڑہ صاحب اس فلم کے لئے کپور برادران کو لینا چاہتے تھے۔راجکپور، شمی کپور اور ششی کپور۔ایک دن کی بات ہے کہ چوپڑہ صاحب بمل رائے کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کہیں جارہے تھے۔وہ راستے میں ''وقت'' کی کہانی اُنہیں سنانے لگے۔ساتھ ہی اُنہوں نے بمل رائے سے کاسٹنگ کے بارے میں اُنکی رائے جاننا چاہی۔بمل رائے ایک جید فلمساز تھے۔اُسنے چوپڑہ صاحب سے کہا کہ سب کچھ کرنا، ان تینوں کو اپنی فلم میں مت لینا۔تین بھائی جب بچھڑ جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں۔یہ تین بھائی تو اندھیرے میں بھی پہچانے جائیں گے۔چوپڑہ صاحب کوبمل رائے کی بات میں کافی دم نظر آیا۔اُنہوں نے کپور بھائیوں کی جگہ راجکمار، سنیل دت اور ششی کپور کولے لیا۔ساتھ میں بلراج ساہنی۔سادھنا اور شرمیلا ٹیگور کو بھی اس فلم کے لئے سائن کیا گیا۔یہ فلم سب سے مہنگی فلم تھی جو لیش چوپڑہ کی ہدایت میں بن رہی تھی۔یہ فلم جب ریلیز ہوئی تو اس نے کامیابی کے سبھی ریکارڈ توڑ دئے۔اس فلم کا یہ ڈائیلاگ ''چنی سیٹھ، جوخود شیشے کے محل میں رہتے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے'' ہر زبان پر تھا۔اس فلم نے لیش چوپڑہ کوشہرت کی بلندیوں تک پہونچادیا۔

''وقت'' کے بعد لیش چوپڑہ ایک اور فلم ''آدمی اور انسان'' بنانے میں مصروف ہوگیا۔یہ فلم سائرہ بانو کی بیماری کے سبب تاخیر کا شکار ہوگئی۔لیش چوپڑہ بیکار بیٹھا تھا۔ایک دن چوپڑہ صاحب نے لیش سے کہا کہ جب تک سائرہ بانو لنڈن سے صحت یاب ہوکے نہیں لوٹتی تب تک تم ایک چھوٹی بجٹ کی فلم کیوں نہیں بناتے۔

لیش چوپڑہ نے گھر والوں کے ساتھ مل کر ایک گجراتی ناٹک دیکھا تھا جو اُنہیں بیحد پسند آیا تھا۔اُنہوں نے چوپڑہ صاحب سے اس ناٹک کے بارے میں زکر کیا۔چوپڑہ صاحب نے لیش کو ہری بتی دکھائی۔لیش نے راجیش کھنہ اور نندہ کو لے کر یہ فلم شروع کی۔فلم کا نام ''اتفاق'' تھا۔یہ ایسی واحد فلم تھی جسکا کوئی انٹرول نہیں تھا۔یہ فلم 1969 میں ریلیز ہوئی۔فلم ٹھیک ٹھاک رہی۔اسی سال فلم ''آدمی اور انسان'' بھی ریلیز ہوئی جو بیحد کامیاب رہی۔

سن 1970 میں لیش چوپڑہ نے پامیلا سنگھ نامی ایک لڑکی سے شادی کی۔شادی کرکے جب وہ بمبئی لوٹا تو کچھ دنوں کے بعد اُسے لگا کہ گھر کے حالات پہلے جیسے نہ رہے۔لیش چوپڑہ کے نزدیکی زرائع کا کہنا ہے کہ بیگم بی۔آر۔چوپڑہ لیش کی اس شادی سے خوش نہ تھی۔اُسے پامیلا ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔وہ اُس سے کچھی کچھی سی رہنے لگی۔لیش کے تیئں بھی اُسکے برتاو میں ڈرامائی تبدیلی آنے لگی۔چوپڑہ صاحب ان ساری باتوں سے بے خبر تھے۔رات کو جب سب لوگ ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھتے تھے تو لیش کو نہ پاکر بی۔آر۔چوپڑہ نوکروں سے لیش کو بلانے کے لئے کہتے تو اُنکی بیگم بیچ میں ہی اُنہیں ٹوک دیتی تھی۔لیش

چوپڑہ اپنی اور اپنی بیگم کے تیئں اپنی بھابی کی یہ بے رخی دیکھ کر من مسوس کر رہ جاتا تھا۔وہ اپنے بڑے بھائی سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا مگر حالات اُسے ایسا دل شکن فیصلہ لینے پر مجبور کر رہے تھے۔ اُسنے اپنے منجھلے بھائی دھرم چوپڑہ کو بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ اپنے بڑے بھائی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔دھرم چوپڑہ پیشے سے کیمرہ مین تھا اور بی۔آر۔فلمز کے ساتھ وہ آخری دم تک رہا۔اُسنے سوچا کہ یہ تو ڈوب ہی رہا ہے ساتھ میں مجھ کو بھی لے ڈوبے گا اسلئے اُسنے بڑے بھائی سے الگ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔

لیش چوپڑہ کچھ مہینے بے نیل و مرام بھٹکتا رہا۔تبھی اُسکی مایوس زندگی میں ایک اُمید کی کرن جاگی۔ایک دن وہ بمبئی کے ایک ریستوراں میں انتہائی مایوسی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ اُسی وقت وہاں پر اُس زمانے کا مشہور سرمایہ کار گلشن رائے بھی آن پہونچا۔رسمی علیک سلیک کے بعد اُس نے لیش سے پوچھا کہ وہ آجکل کیا کر رہا ہے تو اُسنے جواب دیا کہ وہ اپنی فلم شروع کرنا چاہتا ہے مگر سرمایہ کہیں سے فراہم نہیں ہو رہا ہے تو گلشن رائے نے جواب میں کہا کہ وہ اُسکی فلم میں سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ وہ اُسکی ایک فلم ڈائرکٹ کرے۔اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔لیش کو ایک نہیں دو دو خوشیاں ایک ساتھ ملیں۔اُسنے گلشن رائے کی پیشکش قبول کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کی۔لیش راج فلمز کی داغ بیل پڑ گئی۔پہلی فلم جو اس بینر تلے بنی وہ تھی فلم ''داغ'' جسمیں راجیش کھنہ، راکھی اور شرمیلا ٹیگور مرکزی کردار میں تھے وہ فلم میں کوئی کمی کسر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ بی۔آر۔فلمز کو چھوڑ کر پہلی بار اپنے بینر پر فلم بنا رہے تھے۔وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے دم پر فلمیں بنا سکتے ہیں۔اُسنے اپنی فلم کے ساتھ ساتھ گلشن رائے کی فلم ''جوشیلا'' بھی شروع کی۔دونوں فلمیں سال 1973 میں ایک ساتھ ریلیز ہوئیں۔گلشن رائے کی فلم ''جوشیلا'' اتنی کامیاب نہ رہی جتنی لیش راج کے بینر تلے بنی فلم ''داغ'' رہی۔یاد رہے کہ فلم ''داغ'' گلشن نندہ کے ناول چاندنی پر مبنی تھی۔اس فلم نے کامیابی کی بلندیوں کو چھوا۔لیش راج فلمز کا ڈنکا چاروں اور بجنے لگا۔اس فلم کے بعد اُسنے پلٹ کے نہیں دیکھا۔

گلشن رائے نے سلیم جاوید سے ایک کہانی خرید لی جس کا نام ''دیوار'' تھا۔اس فلم کے لئے جب ڈائرکٹر کا انتخاب ہوا تو قرعہ فال لیش چوپڑہ کے حق میں ہی گرا۔نہ صرف سلیم جاوید بلکہ امیتابھ بچن کی بھی پہلی پسند لیش چوپڑہ ہی تھا۔لیش چوپڑہ نے فلم ''دیوار'' کی ہدایت دینا مان لیا۔ جب یہ فلم 1975 میں ریلیز ہوئی تو اس فلم نے باکس آفس پر نئے ریکارڈ قائم کئے ایسا ریکارڈ توڑ بزنس کیا کہ فلمی پنڈت بھی دیکھ کے دنگ رہ گئے ''دیوار'' نے امیتابھ بچن کو کامیابی کی معراج پر لا کر کھڑا کر دیا۔

لیش چوپڑہ نے اس کے بعد باہر کی کوئی فلم ڈائرکٹ نہ کی۔وہ جو بھی فلمیں بناتا گیا وہ صرف لیش راج بینر کے تلے اُسنے بنائی۔''دیوار'' کی ریلیز کے ایک سال بعد اُاسنے ''کبھی کبھی'' نام کی فلم پیش کی جو کہ ساحر کی شاعری سے آراستہ ایک خوبصورت رومانٹک فلم تھی۔یہ فلم 1976 میں ریلیز ہوئی اور اس فلم میں فلمی شائقین کو ایک نیا ہی امیتابھ دیکھنے کو ملا۔ایک باغی امیتابھ کی جگہ ایک مایوس عاشق امیتابھ۔لوگوں نے اُسے اس رول میں خوب پسند کیا اور لیش چوپڑہ اس فلم کے بعد رومانس کا بادشاہ کہلائے جانے لگا۔سن 1977 میں اُسنے رشی کپور، نیتو سنگھ اور ششی کپور کو لے کر ایک فلم پیش کی جس کا نام ''دوسرا آدمی'' تھا۔یہ فلم بھی رومانس اور مزاح سے بھرپور تھی۔ یہ فلم بھی بیحد کامیاب رہی۔اس فلم کے بعد لیش چوپڑہ نے سلیم جاوید کی کہانی پر ایک اور فلم بنائی۔یہ ملٹی اسٹارر فلم تھی۔ اس میں امیتابھ بچن کے علاوہ سنجیو کمار، ششی کپور، وحیدہ رحمان، ہیما مالنی، راکھی، سچن اور پونم ڈھلوں کام کر رہے تھے۔اس فلم کا نام ''ترشول'' تھا۔یہ فلم بھی باکس آفس پر زبردست ہٹ رہی۔

سن 1979 میں اُنکے بینر تلے بنی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ایک تھی سلیم جاوید کی لکھی فلم ''کالا پتھر'' اور دوسری تھی من موہن کرشن کی ہدایت میں بننے والی فلم ''نوری''۔''کالا پتھر'' میں امیتابھ بچن کے علاوہ شترو گھن سنہا، ششی کپور، راکھی گلزار، پروین بوبی اور نیتو سنگھ کام کر رہے تھے جب کہ ''نوری'' ایک چھوٹے بجٹ کی فلم تھی جسمیں فاروق شیخ ہیرو کے رول میں تھا اور پونم ڈھلوں ہیروئن کے رول میں۔بھرت کپور ویلن کے کردار میں تھا۔ یہ فلم ''مدھومتی'' کی کاپی تھی۔مزے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی ڈسٹری بیوٹر اس نان سٹار کاسٹ فلم کو ہاتھ نہیں لگا رہا تھا، لیش چوپڑہ نے یہ شرط رکھی کہ ' کالا پتھر'' اُسے ملے گی جو ''نوری' بھی خریدے گا۔جب دونوں فلمیں ریلیز ہوئیں تو ''کالا پتھر'' سے کہیں زیادہ کمائی اس چھوٹی سی فلم نے کی۔اس فلم کا سنگیت اتنا مقبول ہوا کہ لوگ گانے سننے کے لئے بار بار تھیٹر میں چلے جاتے تھے۔یہ فلم کشمیر کے ایک چھوٹے سے قصبے بھدرواہ کے پس منظر میں فلمائی گئی تھی۔اس وادی کی خوبصورتی نے فلم میں چار چاند لگائے تھے۔

لیش چوپڑہ امیتابھ بچن کا دیوانہ تھا۔وہ بار بار اُس کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔اُسکے پاس ایک تکونی پریم کہانی تھی جو وہ امیتابھ بچن کو لے کر بنانا چاہتا تھا۔ہیروئن کے لئے اُسنے سمیتا پاٹل اور پروین بوبی کو سائن کر کے رکھا تھا۔امیتابھ بچن کشمیر میں فلم ''کالیا'' کی شوٹنگ کر رہا تھا۔اتفاق سے لیش چوپڑہ بھی اُسوقت کشمیر میں موجود تھا، رات کو دونوں ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد امیتابھ بچن نے لیش چوپڑہ سے فلم ''سلسلہ'' کے بارے میں پوچھا تو لیش چوپڑہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔امیتابھ نے چونک کر پوچھا کہ کیا بات ہے تو لیش نے کہا کہ وہ اپنی فیمیل سٹار کاسٹ سے مطمئن نہیں ہے۔امیتابھ بچن نے پوچھا اگر وہ سمیتا پاٹل اور پروین بوبی سے مطمئن نہیں ہے تو وہ پھر اُن کی جگہ کسے لینا چاہتا ہے تو لیش چوپڑہ نے برملا کہا کہ وہ جیا بچن اور ریکھا کو اس فلم میں دیکھنا چاہتا ہے۔امیتابھ بچن نے ایک طویل خاموشی اختیار کی اور پھر طویل وقفے کے بعد بولا۔''چلو کچھ سوچ لیتے ہیں''

اگلے روز وہ دونوں بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔دونوں ایک ہی فلائٹ میں ساتھ ساتھ بیٹھ کر سفر کر رہے تھے مگر راستے میں اُنہوں نے اس موضوع پر کوئی

بات نہ کی۔ یش چوپڑہ اس بات سے پریشان تھا کہ اگر جیا اور ریکھا نے اس فلم میں کام کرنا مان لیا تو وہ سمیتا اور پروین سے کیا کہیں گے کیونکہ اُن کے ڈریس تک بن چکے تھے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ دونوں بمبئی پہونچے۔ اتفاق دیکھئے کہ جس پروین بوبی سے وہ بچنا چاہتے تھے وہی اُسے ائیر پورٹ پر مل گئی۔ وہ اُس کی نظروں سے بچ نہیں پایا۔ پروین بوبی نے ''سلسلہ'' کے بارے میں پوچھا تو یش چوپڑہ کو آخر کہنا ہی پڑا کہ اُنہوں نے کاسٹنگ میں ردو بدل کی ہے۔ پروین بوبی نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ بس اتنا کہا کہ کوئی بات نہیں۔ اس فلم میں نہ سہی اگلی فلم میں وہ ایک ساتھ کام کریں گے۔ اب سمیتا پاٹل کی باری تھی۔ یش چوپڑہ نے یہ کام ششی کپور کو سونپ دیا کہ وہ جا کر سمیتا تک یہ بات پہونچا دے۔ ششی نے پہلے مانا نہیں مگر یش کے مجبور کرنے پر وہ بات کرنے کے لئے تیار ہوا۔ ادھر امیتابھ بچن نے جیا بہادری سے بات کی اور اُسے بڑی مشکل سے یہ فلم کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یش چوپڑہ نے ریکھا سے بات کر کے اُسے راضی کر لیا اور اسطرح یش چوپڑہ نے اپنے من پسند ستاروں کے ساتھ ''سلسلہ'' کی شوٹنگ شروع کی۔ یہ فلم 1981 میں ریلیز ہوئی۔ فلم زیادہ نہ چلی مگر اس کی موسیقی نے ہر ایک کا دل موہ لیا۔ چونکہ ساحر کا انتقال ہوا تھا اور یش چوپڑہ کو ایک ایسے شاعر کی ضرورت تھی جو ساحر کی کمی کو پورا کر سکے۔ یش چوپڑہ کی جوہر شناس نظروں نے وہ نگینہ کھوج ہی لیا۔ اُسنے جاوید اختر کو اس فلم کے گانے لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ جاوید اختر پہلے تیار ہی نہ ہوا مگر جب یش چوپڑہ نے اُسے قائل کر دیا تو اُسنے سارے گانے لکھ ڈالے۔ اس فلم کے گانے لوگوں نے بیحد پسند کئے۔

یش چوپڑہ بہت دنوں سے ایک ایسے سبجیکٹ کی تلاش میں تھا جس میں وہ اپنے دیرینہ دوست دلیپ کمار کو کاسٹ کر سکے۔ آخر اُسے ایک سبجیکٹ مل ہی گیا جس کا نام ''مشعل'' تھا۔ اس فلم میں ایک نئے ایکٹر انیل کپور کو دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ فلم دلیپ کمار کی بے لوث اداکاری اور یش چوپڑہ کی لاجواب ڈائرکشن سے آراستہ تھی۔ فلم اُتنی نہیں چلی جتنی یش چوپڑہ کو اُمید تھی مگر اس میں دلیپ کمار کی جذباتی اداکاری نے دیکھنے والوں کا من موہ لیا۔ یہ فلم 1984 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے بعد یش چوپڑہ نے کئی فلمیں بنائیں۔ 1985 میں فلم ''فاصلے'' بنائی جسمیں اُسنے گلوکار مہندر کپور کے بیٹے روہن کپور کو ہیرو کے طور پر لیا اور ہیروئن کے رول میں حیدرآباد کی ایک شوخ اور چنچل حسینہ فرح کو پیش کیا گیا۔ یہ فلم نہیں چلی۔ سن 1988 میں اُنکی فلم ''وجے'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں ستاروں کی بھرمار تھی۔ راجیش کھنہ، انیل کپور، ہیما مالنی اور رشی کپور مگر اتنے سارے ستاروں کے باوجود فلم باکس آفس پر ٹھنڈی رہی۔ سینما شائقین کو ان دونوں فلموں میں اُس یش چوپڑہ کی چھاپ نظر نہ آئی جو اپنی رومانٹک فلموں کے لئے جانا جاتا تھا۔ اصل میں یہ وہ دور تھا جب مار دھاڑ والی فلمیں چلتی تھیں۔ یش چوپڑہ نے بھی اس موضوع پر ہاتھ آزمانے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ فارمولہ اُنکو راس نہ آیا۔ ناظرین نے اُنکی ایکشن فلموں کو نظرانداز کر دیا۔

آخر 1989 میں یش چوپڑہ نے اپنی کامیابی کا منتر پھر سے پا لیا۔ سری دیوی، رشی کپور اور ونود کھنہ کو لے کر اُسنے فلم ''چاندنی'' بنا کر پیش کی جس نے باکس آفس پر دھوم مچائی۔ اس فلم نے یش چوپڑہ کو ایک بار پھر کامیابی کی چوٹی پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اس فلم کے صرف دو سال بعد یعنی 1991 میں اُسنے فلم ''لمحے'' ریلیز کی جس میں اُسکے پسندیدہ اداکار سری دیوی، انیل کپور اور وحیدہ رحمان نے کام کیا تھا۔ اس فلم کو اورسیز میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مگر ہندوستان میں یہ فلم چل نہ پائی۔ اس کی ناکامی کی وجہ اس کی کہانی تھی۔ ایک آدمی کسی عورت سے پیار کرتا ہے جو اُسکی ہو نہیں پاتی ہے۔ بعد میں وہ ایک بیٹی کو جنم دیکر مر جاتی ہے۔ یہ لڑکی جوان ہو کر اسی شخص سے پیار کرتی ہے جو اُسکی ماں سے پیار کرتا تھا۔ ہندوستانی ناظرین نے اس طرح کے رشتے کو انسانی اصولوں اور سماجی قدروں کے خلاف قرار دیا۔ یہ فلم یش چوپڑہ نے دل سے بنائی تھی مگر وہ فلمی شایقین کے نظریے کو تبدیل نہ کر سکے۔

اس طرح کے حساس موضوع پر فلم بنا کر یش چوپڑہ نے جس طرح کا زیاں اُٹھایا تھا اُسکی بھرپائی کے لئے اُسنے ایک اور فلم بنائی جس کا نام ''پرم پرا'' تھا۔ فلم میں عامر خان، سنیل دت، ونود کھنہ اور سیف علی خان کے ہوتے ہوئے بھی یہ فلم بھی ٹائیں ٹائیں فش ثابت ہوئی۔ اسکے بعد اُسنے سنی دیول، جوہی چاولہ اور ایک گم نام ایکٹر شاہ رخ خان کو لے کر ایک سسپنس تھرلر بنائی جس کا نام ''ڈر'' تھا۔ یہ فلم 1993 میں ریلیز ہوئی۔ اسی سال اُنکی ایک اور فلم ''آئینہ'' بھی ریلیز ہوئی جو ایک صاف ستھری جذباتی فلم تھی جسمیں جوہی چاولہ اور جیکی شراف نے کام کیا تھا۔ وہ فلم تو نہیں چلی مگر فلم ''ڈر'' نے کامیابی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس فلم کے ساتھ ایک اسٹار کا طلوع ہوا۔ وہ تھا شاہ رخ خان۔ شاہ رخ خان حالانکہ اس فلم میں ایک منفی کردار میں تھا مگر یش چوپڑہ وہ پارس تھا جو پتھر کو سونا بنا دیتا تھا۔ شاہ رخ خان یش چوپڑہ کا ہاتھ لگتے ہی سونا بن گیا۔ اس فلم کے بعد شاہ رخ خان اور یش راج فلمز ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم بن گئے۔ یش چوپڑہ نے جتنی بھی فلمیں بنائیں اُن سب میں شاہ رخ خان مرکزی کردار میں تھا۔ ''دل تو پاگل ہے'' میں وہ مادھوری دکھشت، کرشما کپور اور اکھشے کمار کے ساتھ تھا ''ویر زارا'' میں وہ پریٹی زنٹا اور رانی مکھرجی کے ساتھ تھا۔ یہ فلمیں بالترتیب 1997 اور 2004 میں ریلیز ہوئیں اور بیحد کامیاب رہئیں۔ اسی بیچ اُنکے بڑے صاحبزادے آدیتہ چوپڑہ نے یش راج فلمز کی کمان سنبھالی اور اُسنے اپنی پہلی فلم میں وہ کرشمہ کر دکھایا جو بہت ہی کم لوگ کر پاتے ہیں۔ اُسنے اپنی پہلی فلم ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کو 1995 میں ریلیز کیا۔ اس فلم نے دنیا بھر میں ایسی دھوم مچائی کہ فلمی پنڈت انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ یاد رہے کہ یہ فلم سترہ سال گزرنے کے باوجود آج بھی سینما ہالوں میں دکھائی جا رہی ہے۔ یش چوپڑہ نے فلم ''ویر زارا'' کے بعد ہدایت کاری سے وقتی طور پر سنیاس لے لیا۔ آخر بیٹے کے اصرار پر اُسنے اپنی آخری فلم ''جب تک ہے جان'' کی ہدایت دینے کا فیصلہ کیا۔ شوٹنگ پوری کرنے کے بعد جب وہ بمبئی لوٹا تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ یش چوپڑہ کی زندگی کی آخری فلم ہوگی۔ 21 اکتوبر 2012 کو اُسنے اسی سال کی عمر میں اس دنیا کو الوداع کہا اور اپنے پیچھے چھوڑ گئے دو بیٹے آدیتہ چوپڑہ، اُدھے چوپڑہ اور بیوہ پامیلا چوپڑہ اور ساتھ میں ایک انمول

باقی صفحہ آخیر پر ملاحظہ فرمائیں

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

مکرمی گلزار صاحب، تسلیمات۔

برقی ڈاک سے آپ کا اکتوبر ۲۰۱۲ کا شمارہ مِل گیا۔ بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے کام کو اس قابل سمجھا کہ اپنے نہایت معتبر رسالے کی ایک اشاعت میرے نام کر دی ہے۔ آپ کے اس عمل سے میری بہت ہمت افزائی ہوئی ہے، مزید کام کرنے کا حوصلہ ہوا ہے، اور ثابت ہوا ہے کہ اس بد عنوانی کے دور میں بھی کام کے کھرے پارکھ موجود ہیں۔ جس وقت آپ نے برقی ڈاک کے ذریعے، مجھ سے اس ارادے کا اظہار کیا تھا، اس وقت تک، اور نہ اس کے بعد، میری آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ شاید ایک یا دو بار ہمارا صرف ٹیلی فون پر رابطہ ہوا تھا، یاد نہیں کس لیے، اور وہ بھی دو یا چار منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ یقیناً، آپ میرے کام سے واقف تھے۔ مگر آپ نے میری توقع سے بڑھ کر میرے کام کی پذیرائی کی ہے، اور ثابت کر دیا ہے کہ آپ واقعی ادب اور فن کے قدر دان ہیں۔ آپ اسم با مسمیٰ ہیں! نام بھی گلزار اور کام بھی گلزار! آپ کو واقعی سجانے کا ہُنر آتا ہے۔ مکالمے کے لیے ترتیب دیے گئے سوالات بتاتے ہیں کہ آپ گہرے مطالعے کے بعد ہی مکالمہ کرتے ہیں اور اپنے مخاطب کے کام کے نازک ترین پہلوؤں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ میرے کسی جواب سے آپ کو تشنگی یا شکایت نہیں ہوئی ہوگی۔ میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اور یہ بھی کہ اپنے آئندہ کا کام سے آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔ خدا آپ کو خوش رکھے!

باقر نقوی (لندن)

ہمیشہ رہنے والے گلشن، گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہار سو کے سے ہیرے کی چوٹ سے گرد و پیش حرف حرف خواب ناک ہے۔ باقر نقوی صاحب کے رشحات، ارشادات اور خیالات سے معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ وہ اتنے دور بیٹھ کر بھی پیارے پاکستان کے اندر رہتے ہیں۔ ان کی ہر تحریر زندہ پائندہ ہے۔ وہ مانگے ہوئے پروں پر مور نہیں بنے وہ از خود بنے ہیں اور سامنے والوں کو قائم و دائم بنا رہے ہیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات تحقیقی کرید کو مہمیز کرتی ہیں۔ کتابیں کھول کر دیکھنے کا چسکا پیدا ہوتا ہے۔ دیپک کنول صاحب نے اس بار گورودت کی فنی عظمتوں کی بات کی ہے۔ میں نے گورودت کی فلم ''آر پار'' دیکھی تھی کبھی آر کبھی پار لاگا تیرِ نظر۔ فلم پیاسا سے متعلق بہت کچھ سنا۔ آپ نے دلیپ کمار کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال لکھا تھا اس میں فلم ''شعلے'' کے تخلیق کار نے ''شعلے'' کی خصوص میں اور فلموں کا ذکر کیا تھا ان میں پیاسا بھی شامل تھی۔ گورودت نے اس فلم میں دلیپ کمار کو لینا چاہا تھا دلیپ کمار نے مصروفیت کی وجہ سے انکار کر دیا تھا یہ انکار گورودت کے لیے اچھا رہا۔ دلیپ کمار کے مشورے سے گورودت نے پیاسا کا اہم رول خود ادا کیا اور دھوم مچا دی۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

محترم بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسوٗ'' کا تازہ شمارہ موصول ہو چکا ہے جس کے لئے شکر گزار ہوں۔ اس شمارے میں آپ نے جس منفرد، نامور ادیب، شاعر اور مصنف کو ''قرطاسِ اعزاز'' نذر کیا ہے اس کے اعترافِ کمال سے قبل میں آپ کی متجسس اور متلاشی نظر کی داد دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے ان کا تفصیلی تعارف ''چہارسوٗ'' کے قاریوں تک پہنچا دیا۔ واقعی اسے کہتے ہیں حق بہ حق دار رسید! اتنی مختلف الجہات شخصیت کے لیے شاید آپ کے جریدے کے اڑتالیس صفحات بھی کم پڑ گئے۔ بہرحال ایک شاعر ہو کر انہوں نے انسانی ذہن کی صلاحیتوں پر معرکہ آرا کتابیں لکھیں اور ایسی لکھیں کہ اردو میں اس کی مثال نہیں ملتی! میں تو متحیر رہ گیا اُن کے بارے میں جان کر اور ''ذہانت کیا ہے'' وخلیہ جیسے مضامین پڑھ کر پھر بھی محترم شمس الرحمان فاروقی صاحب کا اُن کی کتاب پر مقالہ ''جسم کی تہہ میں چھپے رنگ'' میری پیاس ایک حد تک بجھا گیا۔ بہرحال اس خصوصی نمبر پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

دیپک کنول نے گورودت کے بارے میں ایسے انکشافات کئے ہیں جن سے مجھ جیسے فلم کے رسیا (ماضی کے) بھی لاعلم تھے میں تو انہیں بنگالی سمجھتا رہا تھا مگر وہ تو جنوبی ستارہ نکلے! ڈاکٹر رینو بہل کا افسانہ پڑھ کر میں بہت آزردہ ہوگیا کیونکہ ابھی چھ ماہ پیشتر مجھ پر بھی ایسا ہی اندوہ ناک حادثہ گزر چکا ہے جب میرے نوجوان داماد مرحوم پرویز احمد تین دن عباسی شہید ہسپتال میں رہنے کے بعد ڈاکٹروں کی لاپرواہی کا شکار ہوگئے۔ ابھی تک میں اور میرے بچے اُس حادثے کو اپنے ذہنوں سے محو نہ کر پائے ہیں چہ جائیکہ میری جوان بیٹی کی بیوگی!

غالب عرفان (کراچی)

میرے گلزار، ادب کی بہار، سدا خوش رہو۔

چہار سو کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس بار باقر نقوی آپ کی زد میں آ گئے اور میرے دل میں اُتر گئے۔ کیا خوب آدمی ہیں۔ شاعر، ادیب، سائنسداں، مترجم اور ماہر اقتصادیات واہ، واہ لطف آ گیا، کیا کہنے:

ترا نور میری نگاہ ہے، ترا علم میرا شعور ہے
میں گناہ گار کبھی ہوا تو مری انا کا قصور ہے

جس قدر عمدہ شعر باقر نقوی کہتے ہیں اُسی قدر لا جواب اُن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ عقیل رضوی صاحب، جمیل الدین عالی صاحب اور عاشور کاظمی صاحب نے باقر صاحب کے اشعار کی گہرائی میں اُتر کر اُن کا تجزیہ کیا ہے۔ اور جناب ہمارے فاروقی صاحب (شمس الرحمٰن فاروقی) نے ''مصنوعی ذہانت'' کا اس عمدگی سے محاکمہ کیا ہے کہ حقیقی ذہانت منہ دیکھتی رہ گئی۔ پیرزادہ قاسم اور سحر انصاری صاحبان نے بھی باقر صاحب کی سائنسی جہات پر پُر از معلومات گفتگو کی ہے۔ اس بار باقر صاحب کی شاعری نے پرچہ میں شامل باقی شاعری سے اُس طرح انصاف کرنے نہیں دیا جس طرح اُس کا حق بنتا ہے۔ البتہ افسانوی باب میں آپ کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوئی۔ افسانے اس بار بھی عمدہ ہیں۔ خاص کر سید سعید نقوی، رومانہ رومی، آنند لہر، شاہین خان اور رینو بہل نے کمال افسانے تحریر کیے ہیں۔ رینو بہل جس رفتار اور معیار سے اردو ادب کی خدمت سرانجام دے رہی ہیں اُسے دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایک نہ ایک دن اُن کے لیے آپ کو ''قرطاسِ اعزاز'' کی محفل آراستہ کرنا ہوگی۔ ہر شمارے کی طرح اس شمارے میں بھی جناب دیپک کنول اور ڈاکٹر فیروز عالم اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔ دونوں سدا بہار قلم کاروں کو میری جانب سے ڈھیروں مبارک باد۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

جب جب ''چہارسُو'' موصول ہوا ارادہ کیا اس میں شامل تحریروں، شاعری، آرائش و زیبائش اور پیش کش کے انداز پر آپ کو مبارک باد پیش کروں، جب تک ارادے کو عملی جامہ پہناؤں وقت اس تیزی سے گذر جاتا کہ اگلا شمارہ ہاتھ میں ہوتا۔ تازہ بہ تازہ مضامین اور خوبصورت غزلوں نظموں سے مرصع اس بار یعنی ماہ نومبر دسمبر ۲۰۱۲ء کا چہارسو جیسے ہی ملا کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی کہ منیر نیازی کے بقول:

''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں''

والا معاملہ پھر نہ ہو، کیونکہ اس بار صرف پسندیدگی نہیں شکر یہ بے حد شکر یہ بھی ادا کرنا ہے ''کہی ان کہی'' کے ٹائٹل کو آپ نے چہارسو میں نہ صرف جگہ دی بلکہ اس کے ساتھ جو نوٹ تحریر کیا وہ میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی ''عام آدمی کی داستانِ حیات'' بہت خوب ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے چند برس پیشتر لاس اینجلس میں ملاقات ہوئی تھی نفیس انسان ہیں۔ زیرِ سالانہ کے سلسلے میں ''دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' بہت عمدہ ہے۔ گلزار صاحب آپ اور آپ کے تمام معاونین صد لائق تحسین ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ایسے ہی فعال رکھے (آمین) قمر علی عباسی اور میری طرف سے بہت سی دعائیں۔

نیلوفر عباسی (نیویارک)

محترم و مکرم، تسلیمات۔

موجودہ شمارے میں سب سے اوّل ''قرطاسِ اعزاز'' کا مطالعہ کیا۔ ''براہِ راست'' نے باقر نقوی کے خیالات و حالات سے آگاہ کیا۔ پھر باقی مقالات کا مطالعہ کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، جمیل الدین عالی، اور سید عاشور کاظمی نے باقر نقوی کے شعری ذخیرہ کو خوب کھنگالا جو کسر رہ گئی تھی وہ پروفیسر سحر انصاری نے پوری کر دی۔ باقر نقوی کی تحریریں ذہانت کیا ہے؟ خلیہ اور سنہرا بال پڑھنے سے وافر معلومات ملتی ہیں اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

افسانے سب ہی پڑھ ڈالے۔ رومانہ رومی نے جس انداز میں ''کوّے، بہت ہیں'' عنوان رکھ کر ملک کی پس ماندگی، تباہی اور بربادی کا بیان کیا ہے وہ الفاظ سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس ملک کو فوجی جرنیلوں اور نالائق سیاستدانوں نے تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ شاید یہ ملک اسی لئے زندہ ہے کہ جناب محمد علی جناح یعنی قائداعظم نے اسے اللہ اور رسولؐ کے نام پر اسلام کی سربلندی کے لیے حاصل کیا تھا۔ ''وصل کی شب'' کے عنوان سے نند کشور وکرم نے خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری کا انتخاب بڑی محنت اور لگن سے کیا ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش کے مختصر حالاتِ زندگی بھی قارئین کے لیے پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی نے اختر شیرانی کی نظموں کا تجزیہ دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے کئی اشعار اور بند بھی لاجواب ہیں۔ حوالہ دے کر تاثر ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ غرض کوزے میں دریا بند ہے جس میں بار بار ڈوب کر اُبھرنے کو جی چاہتا ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

محترم انل ٹھکر جی کے توسط سے ایک ہفتے میں چہارسو کے دو شمارے موصول ہوئے۔ پہلا شمارہ غلام مرتضیٰ راہی کے فکر و فن پر گوشے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں پہلے صفحے پر آپ نے میری نظم دی ہے یہ دیکھ کر واقعی خوشی ہوئی۔ دوسرا شمارہ باقر نقوی کے نام ہے۔ جینے کے لیے تازہ ہوا مانگنے والے شاعر باقر نقوی سے چہارسو کے ذریعہ مفصل ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ شاعر کی یہ خواہش خدا پوری کرے

جیب سے چاند تو مٹھی سے ستارہ نکلے

باقر نقوی کی غزل روایت کی بنیادوں پر استادہ ہوتے ہوئے بھی نئے فکر و احساسات کے نقش و نگار لیے ہوئے ہے۔

منحصر آپ کی ہمت پہ ہے سب کچھ باقرؔ
سنگ کیا چیز ہے پانی سے شرارہ نکلے

مضامین میں جمیل الدین عالی نے باقر نقوی کی غزل پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے ایک جملہ ''پرانی لفظیات مضبوط ہاتھوں میں آ کر توانا ہو جاتی ہے'' باقر نقوی کی غزلوں میں یہ توانائی جگہ جگہ موجود ہے اور قارئین کے ذہن کو بھی توانائی فراہم کرتی ہے۔ آپ سوال نامہ مرتب کرتے ہیں تو فنکار کا لہو نچوڑ لیتے ہیں۔ اس سے پہلے گلزار سے آپ کا انٹرویو پڑھ چکا ہوں۔ غالباً انشاء کلکتہ میں

گوپی چند نارنگ سے آپ کا انٹرویو بھی میں نے پڑھا ہے۔ آپ کے سوالات تخلیقیت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ''رس رابطے'' میں دوجگہ میری نظم کا حوالہ ہے۔ میں نجیب عمر (کراچی) اور یوگیندر بہل تشنہ (دہلی) کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں لیکن دونوں جگہ میرے نام کے ساتھ کمپوزنگ کی مہربانی سے زیادتی ہوئی ہے۔ ایک جگہ مجھے نیاز فتح پوری تو دوسری جگہ نظیر فتح پوری لکھا گیا ہے۔ میرا نام اس املا کے ساتھ رائج ہے۔ ''نذیر فتح پوری''۔

ڈاکٹر فیروز عالم ''ہوا کے دوش پر'' اپنے قارئین کو اپنی گزری ہوئی حیات کے چمن کی سیر کرانے میں بہت کامیاب ہیں۔ یہ چودھویں قسط ہے ابھی اس کائنات کا سلسلہ دراز ہے۔ فنکار کے بعد بھی اس کی زندگی کی تخلیق کے ذریعہ سفر کرتی رہتی ہے۔ خوبصورت کہانیوں کے خالق فیروز عالم کی اس حقیقت کشا تحریر کے لیے مبارکباد۔ دونوں کو، آپ کو بھی اور ان کو بھی۔ آپ جن پر گوشہ لگاتے ہیں ان کے پتے اور فون نمبر کے ساتھ ای میل بھی بتادیا کریں تاکہ فنکار کو براہِ راست بھی مبارکباد پہنچائی جاسکے۔

نذیر فتح پوری (پونے، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

رسالہ برابر موصول ہو رہا ہے، بیحد نوازش! کیا اچھے اچھے شمارے نکالے ہیں آپ نے۔۔اور قرطاس اعزاز کے گوشے۔۔۔سبحان اللہ! اس بار باقر نقوی کے حوالے سے بھی آپ نے عمدہ تحریریں شامل اشاعت کی ہیں۔ باقر نقوی کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے کہ ان پر ضخیم نمبر شائع کیے جاسکتے ہیں آپ نے سچ مچ ہی دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اور ان کی غزلوں، سائنسی تراجم اور کہانی کی اشاعت کے ذریعے ان کی دلکش شخصیت کو دیکھنے کے خوبصورت دریچے قارئین کو فراہم کر دئے ہیں۔ ان کے بارے میں سب مضامین بھی اچھے لگے۔ ناصر بغدادی، رینو بہل اور سعید نقوی کے افسانے پسند آئے۔ فرخندہ شمیم کے افسانے ''دانش ورہ'' کا موضوع دلچسپ ہے۔ فہرست میں یہ افسانہ فرخندہ کے بجائے عذرا اصغر کے نام سے شامل ہے۔ دیپک کنول کا گورودت کے بارے میں مضمون اثر انگیز اور معلوماتی تھا۔

نجم الحسن رضوی (کراچی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، آپ کے لیے بے حساب سلامتیاں۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی آپ نے باقر نقوی کی شکل میں ایک علمی، ادبی اور شعری نابغہ خوب تلاشا ہے۔ مبارکباد قبول کیجیے۔ چہارسو میں اس بار ممبئی سے مراق مرزا کا کلام اور مکتوب دیکھ کر بڑی شرمندگی بھی محسوس ہوئی اور یہ بھی خیال آیا کہ تخلیق اور چہارسو میں جب بھی اُس کا نامۂ گرامی نظر سے گزرا ہے اُن کی طرف سے میرے کلام کی تحسین کا کلمہ بھی پڑھنے کو ملا ہے اور جی میں اُس وقت لابیوں کے اس دور میں اُسے بہت سراہنے اور بہت یاد کرنے کا جذبہ بھی اٹھا ہے لیکن پھر بہت بیماریوں اور ٹوٹے پھوٹے رہنے کے سبب جس کا آپ کو علم ہے جیسے اس پر کبھی قادر نہیں رہا یعنی بات کو بھول بھلا ہی گیا۔ اس لیے آج کہتا ہوں کہ یہ شخص میرے لیے اتنی بڑی قیمت کا ہے مجھ سے زیادہ مشتاق فن و علم ہونے کے باعث کہ ہم میں شاید کوئی عشقیہ رشتہ از قسم تصوف ہی کا گویا ہے۔ مراق مرزا زندہ باد۔

رب نواز مائل (کوئٹہ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

سب سے پہلے تو ''چہارسوٗ'' کے شمارے پابندی سے ماہ بہ ماہ ارسال کرنے کا بیحد شکریہ۔ گزشتہ دنوں کچھ نجی مصروفیات کے سبب آپ سے رابطہ نہیں رہا لیکن ''چہارسوٗ'' زیرِ مطالعہ ضرور رہا۔ یوں تو آپ کا ہر شمارہ باکمال ہوتا ہے لیکن نومبر کا شمارہ جو باقر نقوی کی خدمات سے متعلق تھا، بہت لاجواب تھا۔ سرِ ورق پہ ان کی تصویر دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ شمارہ کس قدر وقعت کا حامل ہے۔ علم و فن کی دنیا میں اُن کا نام بہت روشن ہے۔ باقر نقوی صاحب کے انٹرویو سے ان کی زندگی کے وہ گوشے سامنے آئے جو ہماری نظروں سے آج تک اوجھل تھے، حقیقتاً ان کی شخصیت دل موہ لینے والی ہے۔ مضامین میں سحر انصاری صاحب کا ''ایک ہاتھ میں بُت ایک میں خدا''، جمیل الدین عالی صاحب کا ''انا کا پندار''، عاشور کاظمی کا ''شجر کے نشان'' الہٰ آباد (بھارت) سے شمس الرحمٰن فاروقی کا ''جسم کی تہہ میں چھپے رنگ'' اور باقر نقوی کے ''زینتِ صحرا'' نے بے حد متاثر کیا ہے۔ دیگر تحریریں بھی بہترین تھیں۔ اتنے اچھے شمارے کی اشاعت پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ دُعا ہے کہ ''چہارسوٗ'' کا ہر شمارہ بہترین ہو۔

ندیم ہاشمی (کراچی)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

گزشتہ دنوں سال رواں کا آخری شمارہ جناب باقر نقوی سے منسوب موصول ہوا۔ بہت شکریہ۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات ہمیشہ سے صاحب قرطاسِ اعزاز کی زندگی کے معمولات، تخلیقات، مصروفیات و مشاغل پہ محیط، ہمہ جہتی ہوا کرتے ہیں۔ جوابات بھی بہت قرینے و سلجھے سبھاؤ سے پڑھنے کو ملے۔ بلاشبہ باقر نقوی صاحب تضادات سے معمور عظیم شخصیت ہیں، عمدہ شاعری سے مصوری و خطاطی تک۔ ای۔ ایف۔ یو سے انسلاک کا اختصاصی اعزاز متنوع سائنسی موضوعات سے شغف، برقیات سے لے کے اے۔ آئی تک کے کمالات۔ ان سے متعلق معاصرین و قلمکاروں کی جملہ نگارشات ذہنی کشادگی اور لُطف آگہی سے ہمکناری نہیں سرشار بھی کرتی ہیں۔ جس جانفشانی و جانکاہی سے کتب کی ترتیب و تدوین کے مشکل مراحل عزم و حوصلے سے طے ہوئے اُس کے لئے جناب باقر نقوی لائق صد تحسین و مبارکباد اور ادارۂ چہارسو نے جس کمال ہنر سے کمیاب و نایاب، غیر معمولی و منفرد موادِ مطالعہ اپنے قارئین تک پہنچایا ہے اس کے لیے بھی بے حد ممنونیت!

''کوّے بہت ہیں'' علامتی کہانی میں حالاتِ حاضرہ کی پیشکش حقیقی تناظر میں ہوئی ہے اسے پڑھتے ہوئے ایک بہت اچھی ادب شناس کی جانب سے کامرہ آنے کا دعوت نامہ بھی یاد آتا رہا۔ مسیحاؤں کے حضور حقیقت پہ مبنی بہت تاثر انگیز تحریر محسوس ہوئی۔''ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا'' کے مصداق نجمہ شیخ کے تذکرے نے ڈاکٹر فیروز عالم داستانِ حیات کو گل رنگ و دلپذیر سا بنا دیا ہے۔''وصل کی شب'' آتش کا تفصیلی کلام کے ساتھ بھرپور شعری جائزہ ہے اس سے یاد آیا کہ ''تجدیدِ نو'' کے لیے پیا مبر نہ میسر ہوا۔لکھ کے ہمیں بھی پذیرائی ملی تھی جو بعد ازاں کوئٹہ کے کسی معروف روزنامے میں بھی شائع ہوا تھا۔''گوتم کی سحر نگاری'' کا لغوی و معنوی محاسن کے ساتھ تجزیہ بہت خوب ہے۔ بیگم وپال جی سے مکالمہ نے بھی متاثر کیا۔ گورودت اُن کے دوست، کامیاب فلمیں اور وحیدہ رحمٰن سب کے بارے پڑھنا اچھا لگا۔ باقر نقوی صاحب کے ایک خوبصورت شعر و نئے سال کی مبارکباد کے ساتھ اجازت۔

گل برسنے لگے، دامن میں دعا سے پہلے
مہرباں ہوگا بھلا کون خدا سے پہلے

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم جناب گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون!

''چہارسوٗ'' کے دو شمارے (ستمبر، اکتوبر) اور (نومبر، دسمبر) موصول ہوئے۔ان کے شکریے کیلئے الفاظ کہاں سے مستعار لوں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ اتنا سرمایہ دار ''چہارسوٗ'' کہ ادب کے ہر چہارسو کی خبر مہیا کر دے۔ کیا پاکستان، کیا ہندوستان، مایہ ناز ہستیوں کو کھوج کر، موتیوں کی طرح لڑی میں پرو کر پیش کرے کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے۔لیکن یہ سارا کریڈٹ تو غوّاص کو ہی جائے گا!

زاہدہ عابد حنا (لاہور)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیمات۔

حسبِ روایت ''قرطاسِ اعزاز'' نے اس بار بھی فکر و دانش کے کئی در وا کیے۔ باقر نقوی کا نام سنا ہوا تھا لیکن چہارسو کی وساطت سے انہیں بہتر طور پر جاننے کا موقع ملا۔ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کے قادرالکلام شعراء میں سے ایک ہیں۔''براہِ راست'' میں آپ کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا ''شاعری تذکرۂ احوال ہو تو شاعری نہیں رہ جاتی''۔ ایسا لگا جیسے ہمارے دل کی آواز ہو۔ادب کے علاوہ سائنس، کمپیوٹر اور ترجمے سے ان کی دلچسپی دیکھ کر ان کی متنوع زندگی کی فعالیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ کائنات کے راز سب سے پہلے شاعروں پر کھلتے ہیں لیکن اس سے استفادہ لوگ حسبِ استطاعت ہی کر پاتے ہیں۔جمیل الدین عالی نے جب خود کو ''پرانا چاول'' کہا تو میری نظروں میں ادبی محفلوں میں ان کی شرکت کا منظر گھوم گیا جہاں خرابیٔ صحت کی بنا پر سہاروں کے ساتھ تشریف لاتے لیکن لباس اور گفتگو کی نفاست ابھی تک برقرار ہے۔سید عاشور کاظمی نے کیا خوب صورت خراجِ عقیدت پیش کیا۔ باقر جیسے فنکار شہرت یا گمنامی کے دائروں سے باہر رہ کر تخلیق کرتے ہیں اور ان کی رومانوی شاعری کے تیور اس شعر سے دکھائے۔

چاند کے بعد وہ چہرہ نظر آیا جیسے
ایک ہی رات میں مہتاب دوبارہ نکلے

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے باقر صاحب کی ہمہ جہت زندگی کا عمدہ خلاصہ پیش کیا۔ڈاکٹر پیرزادہ قاسم خود سائنس کے استاد ہیں۔ باقر صاحب کی تصنیف ''خلیے کی دنیا'' کے متعلق لکھتے ہیں ''قومی اور ملّی تعمیرِ نو کے لیے تو ہمیں اپنا رشتہ ہر صورت علم، حکمت، تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہی جوڑنا پڑے گا''۔''سنہرا بال'' بے شک اکیسویں صدی کا افسانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ ناصر بغدادی کا افسانہ ''گڑیا'' نازک احساسات کا خوبصورت بیان لیکن ایک نادار بچی کس طرح ایک مہنگا تحفہ مصنف کو دینے کے قابل ہوتی ہے۔ڈاکٹر رینو بہل نے ''مسیحاؤں کے حضور'' میں اپنے اوپر گزرنے والے غم انگیز اور دکھ بھرے احوال کو جس رقت سے پیش کیا وہ اس تحریر کا حسن ہے۔سید سعید نقوی نے ''سخت جانی ہائے تنہائی'' میں اپنی فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ایک ہی کہانی میں دو دھارے۔ رومانہ رومی ''کوّے بہت ہیں'' میں افسانہ نگار سے زیادہ ناصح نظر آتی ہیں۔جس سے افسانہ بوجھل ہوا ہے۔ پروفیسر خیال آفاقی کا یہ شعر بہت خوب ہے۔

اب اس سے اپنا حال بھی ہوتا نہیں بیاں
آیا تھا مجھ سے پوچھنے جو میری خیریت

جناب تشنہ بریلوی کا یہ رومانوی شعر غضب ڈھا گیا

خود پہ عاشق ہوئی جاتی ہے ذرا دیکھو تو
تیرے عارض کی جھلک لے کے سحر تھوڑی سی

فرخندہ شمیم کا افسانہ ''دانش ورہ'' عورت کی نفسیات پر ایک خوبصورت تحریر ہے۔ مہتاب عالم پرویز کا افسانہ ''بیک ڈور'' یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب فرنٹ ڈور استعمال کرنے کی جرأت باقی نہیں رہتی۔ شاہین خان کے ''آبگینہ'' کا یہ جملہ ''عورت کے معنی تو چھپانے کی چیز ہے، بھلا اسے عریاں کیوں کیا جائے'' افسانے کا ماحصل ہے۔ غالب عرفان نے منٹو کو خراجِ عقیدت معریٰ نظم کی صورت میں پیش کیا۔ آج اردو ادب کو ایک اور منٹو کی سخت ضرورت ہے جو معاشرے کی بدصورتی دکھانے کی جرأت رکھتا ہو۔

نجیب عمر (کراچی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

اس بار بھی باقر نقوی کے قرطاسِ اعزاز نے مزہ دیا۔ باقر نقوی، ناصر بغدادی، رینو بہل، سعید نقوی، رومانہ رومی، آنند لہر، فرخندہ شمیم اور دوسروں کے افسانے اچھے لگے۔ آصف ثاقب، نصرت زیدی، خالد حمید، شباب للت،

سرور انبالوی، غالب عرفان، یوگیندر بہل تشنہ، حمیدہ معین، تشنہ بریلوی، پنہاں، رب نواز مائل، عرش صہبائی، فرزانہ جاناں، نوید سروش، مراق مرزا، شہاب صفدر، عارف شفیق کی غزلیں اچھی لگیں۔ دیپک کنول نے گورودت کی یادیں تازہ کی ہیں۔ نند کشور وکرم نے ''وصل کی شب'' فیروز عالم کی سرگزشت خوب ہے۔ تمام مواد پڑھنے کے قابل ہے اور یہ آپ کا ''براہِ راست'' نہ جانے ایسے سوالات آپ کہاں سے ڈھونڈ لاتے ہیں۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

جنابِ جاوید، آداب۔

باقر نقوی سے منسوب ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ''خوب است یا اخی'' چہارسو کے صفحات پر جینوئن لوگوں کو دیکھ کر حیرت ناک مسرت ہوتی ہے۔ عاشور بھائی کا مضمون تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے۔ کئی خوشگوار یادیں ولایت کی اُن کے دم سے وابستہ ہیں۔ عاشور کاظمی کا اردو ادب پر بڑا کرم ہے مرثیہ کے علاوہ بھی۔ بہر حال یہ الگ کہانی ہے کسی اور وقت سہی۔ یونیورسٹی آف لندن کی عالمی کانفرنس میں ہمارے ایک جملے نے عاشور بھائی سے قریب کر دیا تھا۔ میں نے اپنے مقالے سے پہلے جملہ معترضہ ''یہ کیسی اردو کانفرنس ہے جو لندن میں منعقد ہو رہی ہے مگر عاشور اور ساقی نہیں؟'' یورپ کے اردو حلقوں میں یہ جملہ چل نکلا۔ انڈو پاک کے اہلِ قلم کے عمدہ ملاپ نے بھی رنگ جمایا۔ اُس وقت عاشور بھائی، ڈاکٹر وحید قریشی اور افتخار نسیم افتی حیات تھے۔ کیا بات تھی:

یادوں کا انبار لگا ہے جیسے کوئی پاس کھڑا ہے

اس مکتوب کے توسط سے باقر نقوی اور عالی جی کو تسلیمات کیونکہ عالی جی کے مضمون کی کاٹ گہری ہے اور مرزا غالب کی یاد دلاتی ہے۔

جاوید زیدی (امریکہ)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب و نیاز۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ۔ آپ کی محبت و مرحمت کے طفیل رسالہ ملتا رہتا ہے اور اس کی ہمہ دستی اکثر اس حقیقت کا احساس دلاتی ہے کہ محبت کا نہ کوئی علاقہ ہوتا ہے نہ وہ کسی سرحد کی فصیلیں قبول کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا آفاقی جذبہ ہے جو کہ نہ صرف انسان کو انسان سے جوڑتا ہے بلکہ صوفی عقیدہ و نظریہ کے مطابق زمین کو آسمان سے ملا دیتا ہے۔ آپ بھی محبتوں کے سفیر و امین ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کے جذبۂ محبت کو عام کرے۔ آمین۔

زیرِ نظر شمارہ میں ''قرطاسِ اعزاز'' کے تحت جناب باقر نقوی سے بڑی پرکیف ملاقات رہی۔ ان کی شاعری و شخصیت پر لکھے گئے سبھی مضامین لائق قدر ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے مقالہ میں سائنسی گفتگو معلوماتی ہے۔ ''براہِ راست'' کے ذریعے صاحب گوشہ سے آپ کا مکالمہ بھی ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہے۔

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

بقیہ: ایک صدی کا قصہ

اثاثہ جسمیں یش راج اسٹوڈیو بھی شامل ہے جو آج کے دور کا سب سے ماڈرن اسٹوڈیو ہے جہاں ایک ہی چھت کے نیچے ساری ٹیکنیکی سہولیات میسر ہیں۔ یہ اُنکے فرزند آدیتہ کی شب و روز کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

یش چوپڑہ کی یش راج فلمز کی کمان اُنکے بیٹے آدیتہ چوپڑہ نے سنبھالی ہے۔ اُسنے یش راج فلمز کو چار چاند لگا دئے۔ اب تک یش راج فلمز کے بینر تلے بے شمار فلمیں بن کر ریلیز ہوئیں جن میں سے زیادہ تر کامیاب رہیں۔ ان کی فہرست یوں ہے۔

- ☆ محبتیں — 2000
- ☆ مجھ سے دوستی کروگے۔ میرے یار کی شادی ہے اور ساتھیا — 2002
- ☆ ہم تم اور دھوم — 2004
- ☆ سلام میم صاحب۔ بنٹی اور ببلی۔ نیل اور نکی — 2005
- ☆ فنا۔ دھوم ٹو اور کابل ایکسپریس — 2006
- ☆ تارا رم پم۔ جھوم برابر جھوم۔ چک دے انڈیا۔ لاگا چنری میں داغ۔ آجا نچ لے۔ — 2007
- ☆ مشن، تھوڑا پیار تھوڑا میجک، بچنا اے حسینو، روڈ سائڈ رومیو، رب نے بنا دی جوڑی۔ — 2008
- ☆ دل بولے ہڑپا۔ راکٹ سنگھ — 2009
- ☆ پیار ایم پاسیبل۔ بینڈ باجہ برات۔ — 2010
- ☆ مجھ سے فرینڈشپ کروگے۔ میرے برادر کی دلہن۔ لیڈی ورسز ووکی بہل۔ — 2011
- ☆ عشق زادہ۔ ایک تھا ٹائیگر۔ اور جب تک ہے جان — 2012

یش چوپڑہ نے کئی نئے ہدایت کاروں اور اداکاروں کو اپنی فلموں میں کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ انوشکا شرما، رنبیر سنگھ، ارجن کپور اور کتنے ہی اداکار اُنکی ہی پیداوار ہیں جو ایک ہی فلم سے اسٹار بن گئے۔ ہدایت کاروں میں شاد علی۔ کنال کوہلی، کبیر خان، شمیت امین، جگل ہنس راج، سدھارتھ آنند، سنجے گڈھوی جیسے کتنے نوجواں ڈائرکٹروں کو یش راج فلمز نے بریک دیا۔ یش چوپڑہ کو بے شمار سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔ اُنہیں 1990 میں فلم ''چاندنی'' کے لئے، 1994 میں فلم ''ڈر'' کے لئے، 1998 میں ''دل تو پاگل ہے'' اور 2005 میں فلم ''ویرزارا'' کے لئے قومی اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ گیارہ فلم فیئر ایوارڈ جیت چکے ہیں۔ یش چوپڑہ وہ پہلے فلمساز ہیں جسنے سوئیزرلینڈ کی حسین وادیوں کو پردہ سیمیں پر اُتار کر اس لوکیشن کو جاوداں کر دیا۔

...... حج عبادتوں کا سردار ......

اگر میں یہ کہوں کہ یہ کتاب ''حج ،عبادتوں کا سردار'' حج کی ان عام کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ہر سال حج بیت اللہ کے عازم کو مختلف دینی اور فلاحی اداروں کی جانب سے اعزازی طور پر تقسیم کی جاتی رہی ہیں تو یہ شاید مناسب نہ ہوگا یہ کتاب جو اسّی صفحات پر مشتمل اور چھ ابواب میں منقسم ہے دراصل نجیب عمر کی برسوں کی تحقیق و عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔کتاب کے چھ حصے ان عنوانات کے تحت فرداً فرداً تفصیل مہیا کرتے ہیں۔ابراہیم علیہ السلام اور حج کی ابتدا، مرکز حج اور حج کی تاریخ، حج کی اہمیت اور انفرادی فائدے، حج کے اجتماعی فائدے اور حج کا اصل مقصد، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حج اور خطبہ حجۃ الوداع، حج کس لیے؟ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ اس کتاب کو اگر ایک تحقیقی مقالے کا ذیلی عنوان بھی دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ......غالب عرفان

اسّی صفحات کی یہ بابرکت کتاب ایک صدروپے کے عوض الحمد پبلی کیشنز، کراچی سے دستیاب ہے۔

...... محمد ایوب واقف ......

سہ ماہی انتساب کا مطالعہ کرنے والے معزز قارئین کو یاد ہوگا کہ چند سال پہلے ہم نے اپنے رسالے کا ایوب واقف نمبر شائع کرنے کا فخر حاصل کیا تھا۔ہم نے محمد ایوب واقف صاحب سے التماس کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو اس کے کچھ مضامین اور مقالات اور کچھ دوسری تحریریں جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تا کہ ہمارے جن قارئین تک انتساب کا نمبر نہیں پہنچ سکا ہے، ان کی خدمت میں یہ کتاب ارسال کر دی جائے۔ہماری اس درخواست پر جناب محمد ایوب واقف صاحب نے حسبِ سابق سرد مہری دکھائی۔ہم نے جب اس کی شدید ضرورت پر زور دیا تو کسی طرح وہ راضی ہو گئے چنانچہ ان کی رضامندی کے بعد یہ مجموعہ مضامین بعنوان ''محمد ایوب واقف۔شخصیت اور ادبی خدمات'' آپ کی خدمت میں پیش ہے۔محمد ایوب واقف علم و ادب کی دنیا کے ایک قد آور ادیب ہیں۔ان کے مضامین اور کتب اپنے وقت بلند قامت اہل قلم سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

...... سیفی سرونجی

تین سو سے زائد صفحات کی مجلد باتصویر کتاب مبلغ تین سو روپے کے عوض انتساب پبلی کیشنز سرونج پر دستیاب ہے۔

...... جھومتے لفظ ......

پروفیسر میجر غلام نبی اعوان صاحب علم، صاحب قلم اور صاحب کمال ہوتے ہوئے خاص طرح کا حجاب و انکسار اپنے اور قاری کے درمیان رکھنے کے مکلّف نظر آتے ہیں۔اردو ادب کی مختلف اصناف میں سات کتب کا اضافہ کرنے کے باوجود وہ خود کو اہل قلم کے بجائے اُن کا حاشیہ بردار کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔اب کی بار اعوان صاحب نے آٹھویں کتاب بہ عنوان ''جھومتے لفظ'' انشائی ادب میں تحریر فرمائی ہے۔اس کتاب میں ذاتی حوالوں کے ساتھ ادب کی کئی نامور شخصیات کی نسبت بہت ہی دلچسپ تحاریر شامل اشاعت ہیں۔آج کے اعصاب شکن ماحول میں اعوان صاحب کی زیر نظر کتاب ایک طرح سے تازہ ہوا کے جھونکے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں تازگی بھی ہے، جدت بھی اور خود کو پڑھوانے بلکہ منوانے کی طاقت بھی۔ ...... فارسی شا

دو سو صفحات کی مجلد و مفید یہ کتاب چار صد روپے کے عوض مقبول اکیڈمی لاہور سے طلب کی جا سکتی ہے۔
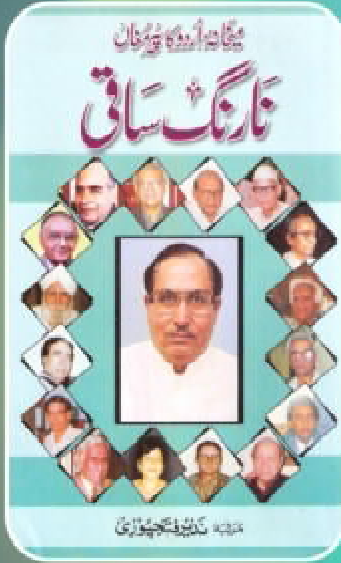
نارنگ ساقی کاروباری آدمی ہیں۔ایسا آدمی ان اشغال سے اجتناب کرتا ہے جس سے کاروباری ساخت خراب ہونے کا اندیشہ ہو لیکن موصوف اپنے ادبی ذوق کے ہاتھوں مجبور ہونے کی وجہ سے اندیشہ ہائے دوردراز سے خاصے بے نیاز ہیں۔یہی وجہ ہے کہ شاعروں کی بہت بڑی تعداد بالخصوص کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی صحبت نے ایسا رنگ دکھایا کہ آج ساقی صاحب کا شمار اور شناخت نامور ادیب کے طور پر ہوتی ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ وہ ایک اچھے اور بڑے ادب کے پارکھ اور شاعر بھی بن چکے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

محقق خواجہ۔۔۔

صابر جعفری نے انگریزی کی چند اچھی اور سنسنی خیز کہانیوں کے ترجمے کو اردو میں پیش کر کے اُن قارئین کا جی خوش کیا ہے جو براہِ راست ان کہانیوں کو انگریزی میں نہیں پڑھ سکتے۔صابر بدر جعفری صاحب کی منتخب کردہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور ان کی زبان رواں اور بامحاورہ ہے۔ان کہانیوں میں جرم کا سراغ کبھی کسی جانور کے ذریعے ملتا ہے اور کبھی کوئی خوشبو قاتل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اس خوبصورت کاوش پر جعفری صاحب کو جس قدر بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔

زاہدہ حنا۔۔۔
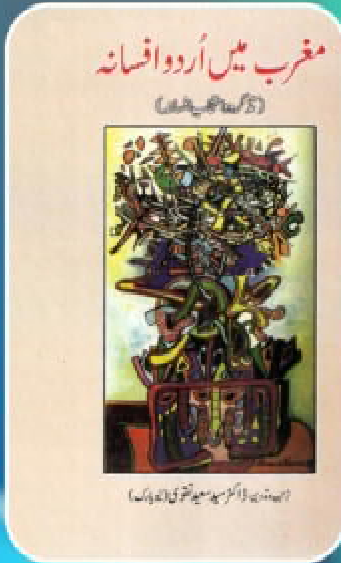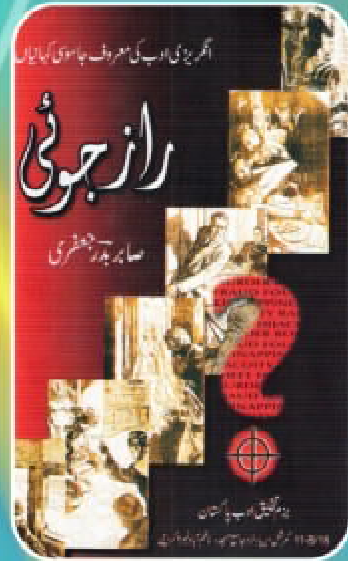
''افسانوں کی اس انتھولوجی کے دل کش گل دستے میں مختلف خوشبوؤں اور رنگوں کے پھول سجانے کا سہرا ڈاکٹر سید سعید نقوی کے سر ہے جنھوں نے اپنے دوستانہ تعلقات، عمدہ اخلاق اور شیریں زبان کے سبب پچاس افسانہ نگاروں سے اُن کا تعارف اور افسانے حاصل کیے اور کتابی صورت میں آنے تک اس کام کو اپنے زیرِ نگرانی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مجھے اُن کی ادب دوستی اور فروغِ اردو ادب کے کاموں پر فخر ہے۔اسی لیے میں نے اُن سے مستقبل میں بہت زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

ڈاکٹر اختر ہاشمی۔۔۔